



چونکا رہے عالمی کہانیاں

ماہنامہ

ڈیجیٹل

کراچی

ڈی

جون 2012

الماء راعت کی نئی نثر

سنہری تابوت

PDFBOOKSFREE.PK

عمران قریشی
اذیت پسند

ہم وہاں پر سکھائی کرتی اور رکوں
میں جو کچھ کرتی خوفناک ڈراؤنی کہانی

عامر ملک
قتل موذی

دل دہلا دھل کر جوں کو تانک جیب و
غریب دھت ناک ہوتے تانکیز شاخشاہ

زوہیب حسن
ناگن کا انتقام

انتقام کا ایک خوفناک اور لڑنے پھر دھت
پڑنے والوں کو ہرمت میں ڈال دے گا

اے وحید
رولوکا

وہ واقعی ہمارے لوگوں کا مالک تھا اس کی
جادوں کی خبر سنا میں آپ کو کہہ کر دیں گی

ذیشان اقبال عطی
دولہا دلہن

مشق بہت حد تک ظلم کی لازمل کہانی
مرنے کے بعد بھی دونوں کا ساتھ نہ چھوڑے

ایس امتیاز احمد
بزدل روح

ایک چھوٹی لڑکی جیب و غریب اور تانکیز
میں واقعی ظلم اور بھڑکے کہانی

قاسم رضا
فالج زدہ

قدرت کے ہاتھ کو تو نہیں کوئی مٹا سکتا
کے لئے اپنی اویس کی لڑکی بھڑک کہانی

ساجدہ راجا
جادوئی گڑیا

خونک بگڑی تانکیز دلہن کا دلہن
دھت دھت دھت سے لبریز حقیقت

ایم اے راحت
سنہری تابوت

شاہکار کہانیوں کے حلقوں کو کھلے
انجیس میں واقعی جیت بھڑکے تانکیز کہانی

سجاد حسین نوری
ناگ نقش

بادشاہ حلقوں کے دھت سے انکاری لوگوں
کے لئے حقیقت پہلی ایک جیب شاخشاہ

محمد عثمان علی
خوف

دھت دھت سے لبریز خوفی واقعہ ہے
دیکھ کر کھٹکتے ہیں ہر دل کے لئے

ایس حبیب خان
پیاسی دوستی

خوف دہراں کے کھارے میں لپی ہوئی ایک
ظرفی جیت بھڑکے تانکیز لبریز کہانی

ذوالقرنین خان
موت کا سفر

بہت حد تک کھٹکتے ہیں ہر دل کے لئے
ایک لبریز واقعہ کہانی

ناصر محمود فرہاد
شکاری

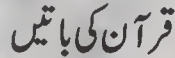
ہر اچھی برائی قسمت میں نہیں گھس سکتی
بلکہ اس کا ذمہ دار انسان خود ہوتا ہے

ڈاکٹر اختر ہاشمی
شمیر کا

ایک کہانیوں کے حلقوں کو کھلے دل پر
کرتے ہیں ایک لبریز جیت بھڑکے تانکیز

ایم الیاس
رقص موت

تھنڈا..... سرسبز دل دھت کو ہوت
کرتی..... ڈراؤنی اور تانکیز کہانی



☆ وہی تو ہے جو تم کو بھگل اور دیر یامیں چلے بھرنے اور سیر کرنے کی توفیق دیتا ہے یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں سوار ہوتے ہو اور کشتیاں پاکیزہ ہوں ان کے نرم مزہ میگوئوں سے سواروں کو لے کر چلے گئیں ہیں اور وہ ان سے خوش ہوتے ہیں تو ان کہاں زمانے کی ہوا چل رہی ہے اور کہاں ہر طرف سے ان پر جوش مار رہی ہے کوئی آنے لگتی ہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ اب تو لہروں میں کھمبے تھے۔ تو اس وقت خالص اللہ ہی کی عبادت کر کے اس سے دعا آجیتے کہتے ہیں کہ اللہ اگر تو ہم کو اس سے نجات بخینے تو ہم تیرے بہت ہی شکر گزار ہوں۔ (سورۃ یونس 10 آیت 22)

☆ اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ ہواؤں کو بھجنا ہے کہ خوشخبری دیتی ہیں تاکہ تم کو اپنی رحمت کے حوالے بکھلائے اور تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں چلیں اور تاکہ تم اس کے فضل سے روزی طلب کرو جب نہیں کہ تم شکر کرو۔
(سورۃ روم 30 آیت 46)

☆ اور اللہ ہی تو ہے جو ہوا نکس چلاتا ہے اور وہ بادل کو ابھارتی ہیں۔ پھر ہم اس کو ایک بے جان شہر کی طرف چلاتے ہیں پھر اس سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیتے ہیں۔ اسی طرح مردوں کو بھی اٹھاتا ہوا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شائع ہوگی۔ امید ہے آپ آئندہ ماہ بھی اپنا خلوص نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع دیں گی۔

☆☆ افشاں صاحبہ: ڈراما نگارستان میں موسٹ ویلکم، آپ کی تجویز پذیر فرم ہے، آئندہ صرف قلم کہانیاں ہی سلسلے دار شائع ہوں گی۔

رضیہ عارف راہی ہے، کسی کا ورڈ! اجست اپنا خوب صورت اعزاز لئے ہاتھوں میں آیا تو سب سے پہلے قرآن کی باتوں

☆☆ رضیہ صاحبہ: کاش کہ ہم سارے انسان اپنے اختتام کے بارے میں سوچ لیں اور ساتھ یہ بھی کہ جس طرح بھاگ دوڑ کر کے

ایس امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم، امید ہے کہ حراج کرائی بخیر ہوگا۔ ماہ مئی 2012ء کا "ڈورڈا بجٹ" کا خوبصورت

انا ظفر اقبال جٹاوالہ سے، السلام علیکم! امید ہے ڈرڈر انجسٹ کا پورا ایشاف اور تمام دوست قارئین خوش باش اور خیریت

Dar Digest **12** June 2012

☆☆ ظفر صاحب: آپ کا خط پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی، آپ نے ساری باتیں بہت اچھی لکھی ہیں۔ امید ہے دل پر لکھے والی ایسی

ماضی کی نہیں دے گا۔ چہ معقول ہے۔ میرے والد صاحب کی محنت کچھ ناساز تھی۔ جس کی وجہ سے انہیں ساہیوال اور ملتان لے جانا

☆☆ **میر صاحب:** ہماری اور تاریخین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے والد کی صحت اور آپ کے تمام اہل خانہ پر اپنا مکمل و کرم رکھے۔

لئے شہر جانے کا اتفاق ہوا وہاں ایک اسٹال پر ایسے محبوب پرچے ڈرڈا انجسٹ ماہ مئی 2012ء سے ملاقات ہو گئی جسے دیکھ کے میرا دل

☆☆☆ السلام صاحب: ہر ماہ آپ کا غلام بجز اعلیٰ پڑھ کر خوشی کے ساتھ ساتھ دلی سکون بھی ملتا ہے۔ غزل شامل اشاعت ہے۔ آئندہ

بشیر احمد پرواز جٹوالہ سے، السلام۔ ہم امید کرتا ہوں ڈرڈا جٹ کا پورا ایشاف اور تمام یارے قارئین سب پر میری بہت

Dar Digest **13** June 2012 Courtesy w

”دولوگا“ نے اپنے سات سال مکمل کئے جس کی ادھیڑاں خوش ہوئی۔ اس کے بعد بھی کار اور دیگر کھانوں کا مطالعہ کیا۔ جو سب کی سب اپنا مثال آپ تھے۔ قرآن میں سب نے اچھا لکھا تھا۔ ”شعب شرازی“، ”شیانین“ اور ”طلحہ یوانہ“ کے شعر پسند آئے۔ نثریات میں رافضی عثمان کی، اس کی امتیاز احمد جبراجت اور دیگر صحافتی اداروں کے مدیران کی مثال آپ تھا۔ اب اس کا دعا کے ساتھ اجازت پا چکوں گا کہ لکھنؤ کی ڈوڈا بجٹ کو کئی دہائیوں کی جاتی رہا۔ آج کے دن وہ بھی شریعہ کا موقع ضرور دیں گے۔ آپ کی تمام باتیں اچھی ہیں۔

فیض احمد فیضی، بہاول پور سے، السلام علیکم، اس دفعہ 129 برس روزِ اوار کو 2012ء کا ڈرامہ رایت سے خریدے اور کاغذ ماہ بہ ماہ ضرورت ہوتا ہوا رہے۔ قرآن پاک کی باتیں ایمان افروز سلسلے ہے۔ اسی ہوتا ایمان تازہ ہوتا ہے۔ غلطی میں ادارہ کی طرف سے بھلو کی اس نازی بنی۔ بہت اچھا اور غلطی کی غفلت میں بیچ کرب کے تجربے ہوئے۔ اچھا لکھا دعائیں میں میرا بھی باکری قاصد روح میں کلمہ سوا کی حکم روح اپنی جانی کا انتقام لیتے پھر جی رہی تھی۔ جس کی آکھیں نکال لی تھیں۔ کہانی ”سختی شری“، جانتا کا قبیلہ، پہلے پڑے دلا ہے ہوتے ہوئے دولوگا کی قسطیں 84 میں داخل ہوئی۔ اس کہانی میں ریشل سے ملاقات ہوئی۔ انوکھا انجام کے بعد خوشی بت پڑی تو اس میں بھی ریشل سے ملاقات ہوئی۔ 1942ء کے لکھنؤ کی یہ کہانی پر اس دور کی حکومت رات سے مندر کی صفائی کا فیصلہ کیا۔ راجن پرکاش ایک ہماری بھرم بھری سمجھت چڑھا۔ راز کے بعد چند روز کی آفری قسط پڑی۔ آخری نجات کے لئے اس وقت اس امتیاز احمد صاحب خٹوار لائے تھے۔ جو طویل کہانی ہے (مگر یہی سے (ماخوذ) میرا کی تیری قسط پر تجس، سی۔ اسی مختصر کہانوں کا مطالعہ جاری ہے۔ لکھنے والے کے لئے خدا حافظ۔

☆ نثر صاحب خٹوار لکھنؤ کی تعریف کے لئے شریعہ ہے۔ امید ہے آئندہ بھی صحیح کھرہ کے موقع دیں گے۔
عمر فاروق، لود پور ضلع سے، السلام علیکم، ڈوڈا بجٹ کا اردو اکا شمار 129 برس کا شمار ہوگا صرف کہ ماہ مارچ کے بعد 23 تاریخ کو لکھنا، بے حد خوشی ہوئی، اپنی لکھنا وہی لکھنا جواب قاضی کے لئے سب سے پہلے قرآن کی باتیں، پڑھ کر ایمان تازہ کیا۔ یہ طویل کی آکھیں میں اپنا خانہ پاک پر بہت مسرت ہوئی۔ کہانوں میں قاصد روح، انوکھا انجام، راز، شری، جی، راجن، درو، راج، کست اور خوشی بہت پسند آئیں، قسط اور کہانیاں بھی بہت اچھی جاری ہیں، دولوگا کا جواب تھیں۔ تمام رازنیز بہت اچھے اور لکھنے کے ساتھ کہانیاں لکھتے ہیں ان شاء اللہ کہ وہ قسط کو دم کو دم کرتی دے۔ جو عثمان لکھ، اس کی سبب خان، اس امتیاز احمد، ایمان اب اس اور اسے جو میرے پسندیدہ رازنیز ہیں۔ اپنی جاتی بہت اچھا تھی۔ ان شاء اللہ میں اس کی کئی قسطیں دے۔ جو قرض کی سبب اس کا چلے گا۔ شہر وحشت اور چندرا دیوی کا انتقام بہت اچھا ہوا۔ اب ان کی کہانی اصل کا انتظار کر رہے ہیں۔ پہلے قسط میں جسے نقلیں ہوئیں ان کے لئے معذرت خواہ ہوں، بہر حال آپ نے شائع کر دیا یہی حیات بہت کم تھیں۔ ڈوڈا بجٹ ایک معیاری رسالہ ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ کے تمام نصاب، رازنیز حضرت اور تاج راجن کو خوش رکھے۔ آئیں اب اجازت پا چوں گا۔ خدا حافظ۔

☆ نثر صاحب: آپ کا خط پڑھ کر خوشی ہوئی، کہانوں اور رازنیز کی تعریف کے لئے دعویٰ چھینیں، امید ہے آئندہ بھی ڈوڈا بجٹ کو خدا کا دعا ہوگی۔

قدیسو رانا اور لڈیوٹی، سٹی کا ڈوڈا بجٹ دیکر خوش ہوئی، خبر کے طالب ہوں، غزلوں کی اشاعت پر شریعہ قبول فرمائیں، امید ہے قانون کی سلسلہ جاری رہے گا۔ دو فرمیں ارسال ہیں۔ آگلی اشاعت میں جگہ کے رستور فرمائیں۔ میری دعا ہے کہ ڈوڈا بجٹ ادنیٰ دینی رات چوتنی پڑے۔

☆ نثر صاحب: غزلوں کی اشاعت اور قانون کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔ اگر آپ کا تعاون ڈوڈا بجٹ کے ساتھ ہو۔
غلام فیضی، نوہری، کلہاں ناس سے، پہلے قسط ماہ سے تمام نیاں جو میری طرف سے سلام، میں اس رسالے کو لکھنے عمر سے پڑھ رہا ہوں۔ اب اس کی سبب لکھنے کی اجازت کر رہا ہوں۔ 2012ء کا پکا مارچ ماہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ امید ہے کہ سارا

ڈوڈا بجٹ بڑا اچھا ہوگا۔ میں ایک کہانی ”مکین چور کہانوں“ بھیج رہا ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ لطیفے اشعار اور نثر بھیج رہا ہوں، امید ہے کراچی کے کھرہ کے موقع دیں گے۔ آئندہ ہمارے ملک کے لئے خدا حافظ۔
 ☆ آپ غلام نبی صاحب: ڈوڈا بجٹ میں خوش آمد ہے، کبھی بھی چور کہانوں پر بھیجیں، اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ آئندہ دعا کی

☆ آپ کے لواؤں نامہ کا انتظار ہے گا۔
عامر ملت، لاہور میں رہتا ہوں، آپ کا خط پڑھا کہ آپ سب سے نئے ہیں۔ کئی کا شاعر اور دوسرے شاعر نامہ ارسال کیا۔ کہانوں میں خٹوار جانا دہری۔ اس امتیاز احمد کو بہار کیا، اس کے علاوہ خونی ڈاکٹر، کست، خبر کی کار اور انوکھا انجام خوب ہیں۔ تمام رقم کاروں کو مبارکباد۔ اس ماہ پر بہت دیر بعد ملا۔ خبر ت تو سنی ت؟ اس بار کی ترجمہ کہانی ”شیرانی“ ارسال کر رہا ہوں اللہ کرے۔ آپ کو پسند آجائے گا۔ کارن کارن اور رافضی کلام۔

☆ عامر صاحب: خصوصاً نامہ دیکھنا ارسال کرنے کا شریعہ ہے آپ کی کہانی اس شمارے میں شامل اشاعت ہے اور امید ہے شریعہ کا موقع آئندہ بھی دے رہیں گے۔
حسوف الدین، جیلانی، ٹڈا دیار سے، السلام علیکم، امید ہے ادارہ کے سارے لوگ خبر تے ہیں۔ ہوں گے کی کاڈی ڈوڈا بجٹ پڑھ کر خوش ہوئی قرآن کی باتوں سے لے کر خٹوار تک پر ہمارا صاحب ”معمول درست ہے۔ اللہ ہمارے ملک پر رحم کرے کہیں فضائی حادثے، کہیں دھماکے اور سب سے بڑھ کر مہنگائی کا کوئی شہر نہ بن جائے۔ شائدنگ اور انتقام مان بوج کی غزل پڑھ کر آکھوں۔ دے آئندہ ہوں گے۔ دعا ہے کہ ڈوڈا بجٹ تازہ رہتی کرے۔

☆ شرف الدین صاحب: خط لکھنے اور مل ڈوڈا بجٹ کی تعریف کے لئے شریعہ ہے آپ ہیضہ ایک حوالہ کے مالک ہیں غزل پڑھ کر بہت حائر ہوئے۔ ہمارا دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنا صلہ دکر رہے۔

☆ پروفیسر ڈاکٹر واجد کینوی، کراچی سے، ماہ مارچ ڈوڈا بجٹ کا شمارہ 2012ء کو پھر عین کے دست مبارک میں بڑھواؤں۔ آپ کی کہانی اور چلائی گرم ہوا میں سکون قلب کی حرکت میں نمایاں کردار کا کردی ہیں۔ سرد اور غصے سے برقی مشروبات ملنے کی نعت ہیں۔ اور جوں تک ہم اور معصم شاعر اسے بھی آج پچھائی کا ہو۔ بھا جاتی ہے اڑی تک پینے۔ ایک طویل ہے سے دیکھنے میں شریعت کر رہا ہوں۔ امید ہے جلد یا بدیر میری ایک دیکھنے پہلے ارسال کر دے کہ آپ کی حقوت نظر نگاہ سے گوش گزار نہ والی ہوگی۔

☆ نثر صاحب: آپ کی کہانی کسی کے اچھے اطلاق اور طویل اور دل میں خرم کو کھانے سے حلق ہے، یہ کہانی نہیں، ڈر کے موضوع پر کہانی ارسال کر رہا ہوں، اگر آپ اپنا سوال لکھ کر ارسال کریں تو اور بھی۔

☆ دھون کپور، راولپنڈی سے، میں خبر تے ہیں۔ امید کرتا ہوں کہ اللہ تعریف سے ہوگا۔ دھون کپور ہے کہ سب سے پہلے آپ کا شریعہ ہے کہ میری کہانی خونی شائع کی ہے آپ کا ہے کہ میری خبریں شائع کرے میری حوصل افزائی کرتے رہے ہیں۔ اس امر کا بھی خصوصی پر توجہ کریں۔ آپ کی خدمت میں اپنی ایک نثر اور میرا بھی اپنی بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ شائع کریں گے۔ نیز کہانی کا عنوان میں نے تجرید کہا ہے۔ آپ سے ایک بھتر بھتر کسی تو اس کا عنوان تبدیل کر دیں۔ نیز جہاں آپ کی کہانی میں ملے گا چلا جائے اس کی نوک ٹیک کر لیجئے گا۔ آپ کے پاس میری ایک اور کہانی ”مہرارت“ ہے۔ میرا ہے کہ اسے دیکھ لیتے ہیں۔

☆ رضوان صاحب: آپ کی کہانی ماضی کے پڑھنے ہوئی ہے اس شمارے میں شامل اشاعت ہوئی، اگلے شمارے میں ضرور شامل اشاعت ہوگی۔

☆☆

نوٹ: تمام رازنیز حضرات سے اتنا ہے کہ اپنی کہانی پر مکمل ایڈس میں اور Cell, No ضرور لکھا کریں، دھیان سے تیکہ اور ازادی کا پی پیج یا پھر براہِ راست میں آسانی ہو تو امید ہے کہ رازنیز حضرات عملی قدم اٹھا کر شریعہ کا موقع ضرور دیں گے۔

اذیت پسند

عمران قریشی - کوئٹہ

شیرنی کی غضبناک دھاڑیں جاری تھیں کہ اچانک درخت سے نوجوان نیچے گرا تو بپھری ہوئی شیرنی نے جھپٹ کر نوجوان کو دبوچ لیا اور ہلک جھپکتے ہی نوجوان کا نورخرو ادھیڑ کر رکھ دیا کہ اچانک.....

بہم و جاں پرستہ طاری کرتی اور رگوں میں بھونچند کرتی خوفناک ڈراؤنی کہانی

اس سسنی خیز اور ہیبت ناک کہانی کا آغاز ایک ہفتہ جتر آنے والے خط کے بعد ہوا۔ خط کے الفاظ کم و بیش پانچ سطروں پر مشتمل تھے اور لکھنے والے کا نام کرل سانی تھا۔ فوجی ملازمت کے دنوں میں ہم دونوں کا چولہا داس کا ساتھ رہ چکا تھا۔ وہ ایک اذیت پسند اور خوفناک شخصیت کا حامل انسان تھا۔ اپنے ہاتھوں کو خط بنا کر ہم کی سڑا میں دینے میں خوش محسوس کرتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد پڑتا ہے۔ ایک دفعہ اس نے ماتحت کی غفلت پر اسے پھت پر موجود کم میں تین دن بھوکا پیاسا بند کر رکھا۔ یہ کم سردیوں میں پھولوں کے گلوں کو محفوظ رکھنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ سن دم کی چاروں دیواریں شیشے سے بنی ہوئی تھیں۔ علاوہ ازیں پھت بھی شیشے کی موٹی تہہ سے مزین تھی۔ گرمیوں میں دھوپ مکمل طور پر کم میں داخل ہوتی تھی اور کم میں رہنے والے ہوتے ہوئے تندہ کا منظر پیش کرنے لگتا تھا۔ کرل سانی نے اپنے ماتحت کو تین دن تک کمرے میں قید کر رکھا۔ رات کو اسے مختصر کھانا اور پانی کا ایک گلاس دیا جاتا۔ جو تمام دن کی بھوک اور پیاس کے لحاظ سے ناکافی ہوتا تھا۔ چوتھے دن جب کرل سانی کے ماتحت کو کم میں سے باہر نکالا گیا۔ جب

وہ بیٹھی بیٹھی باتیں کرتا تھا۔ اور چلنے پھرنے سے تقریباً معذور ہو چکا تھا۔ ایک ہفتے کے علاج کے بعد اس کی حالت قدرے بہتر ہوئی۔

بہر حال فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد میں نے پولیس کے محکمے میں ملازمت کر لی۔ لیکن کرل سانی اپنی اذیت پسند فطرت کی بدولت شکاری بن گیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ہماری دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی۔ لیکن اخبارات میں اکثر اوقات اس کے شکاری کا رتا سے پڑنے کو ملے رہتے تھے۔ اب اس کا خط میرے ہاتھوں میں موجود تھا۔ اور پھر مختصر مٹی کرل ہے لی!

طویل عرصہ گزر جانے کے بعد خط کے ذریعے تم سے سلام ہو رہا ہوں۔ معاملہ کچھ ایسا ہے۔ میں اپنی زندگی کے آخری ایام آخری قسط کے جنگل میں بنی وسیع و عریض رہائش گاہ میں گزار رہا ہوں۔ مرنے سے پہلے چند امدد ہتاک اعشانات کرتا جا رہا ہوں تاکہ میرا دل بکا ہو جائے۔ تم سے بہتر اور کوئی شخص نگاہوں میں موجود نہیں۔ اس لئے تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ جتنی جلدی ممکن ہو سکے۔ میری رہائش گاہ کا رخ کرو۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ ہاتھ کا کاڈر ایڈریس مندرجہ ذیل ہے۔

نیچے افریقہ کے کسی گنام گاؤں کے قریب واقع جنگلات کا ایک ریس خیر تھا۔ اس مختصر خیر کے بعد لڑنے و خیر و اقامت کے متعلق سوچے ہوئے مجھ پر آج بھی کچھ طاری ہو جاتی ہے۔ بہر حال میں نے جب خط چٹف ٹیرل کے سامنے رکھا۔ تب اس نے مجھے فوراً گنام گاؤں کی جانب روانگی کا حکم صادر کر دیا۔ وہاں موجود ایکسچرن جون ہمارا نمائندہ خاص تھا۔ میں نے اس سے رابطہ قائم کیا اور دوسرے دن جب میں چٹف کو افریقہ کے گاؤں... گاؤں گاؤں کا رخ کیا۔ راستے کی چیتہ گئیں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں جب گاؤں پہنچا۔ تب رات کا اندھیرا مسلط ہو چکا تھا۔ وہ رات میں نے ایکسچرن جون کے ہمراہ قہانے میں گزار دی۔ اور صبح سویرے کٹرل سائی کے پاس گاؤں کا رخ کیا۔ جنگل کے درمیان گھری اس کی ہاش گاہ پر طاق سے مکمل تھی۔ وہاں چلنے کے علاوہ پانی اور گیس کا بھرپور انتظام موجود تھا۔ حتیٰ کہ کٹرل سائی کے کمرے میں ایئر کنڈیشن بھی لگا ہوا تھا۔ وہ کمرے کے درمیان لگے دست و درمیان بیٹھ کر دراز تھا۔ اس کے ماتحت بیٹھ کے چاروں کلوں کے قریب کمرے حکم کے منتظر تھے کٹرل سائی کی حالت سازش اور وہ دائمی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اسے معصے کے کٹھن کی پیاری لاقی تھی۔ وہ کچھ بھی ہم کمرے کے قافلہ میں رہا تھا۔ سو کہہ بڑوں کا ڈھانچا بن چکا تھا۔ ڈاکٹر پھاری کی اسج کو دیکھنے کے بعد اسے لاعلاج قرار دے چکے تھے۔ مجھے اور ایکسچرن جون کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ بیڑ پر ہنسنے لگا۔

بھٹل مسکراتے ہوئے بولا۔ ”مجھے یقین تھا کہ تم ضرور ڈاکے۔ اپنی زندگی کی غلطیوں کا انزال کرنے کے لئے میں تمام جرموں کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ حالانکہ میرے خیال میں اس کا کچھ بھی فائدہ نہیں ہونے والا۔ لیکن دل کا بوجھ لپکا کرنا بھی بہت ضروری ہے۔“ وہ چاک خاموش ہو گیا۔ بات چیت کے دوران اس کے منہ سے بڑا کراہیسا گھٹا تھا۔ جسے

قبول کرنا مشکل ہوتا تھا۔ معصہ بآہستگی گھٹا سڑتا جا رہا تھا۔ کٹرل نے سامنے کمرے سے دو کمروں میں سے ایک کو اشارہ کیا اور وہ مشروبات کا انتظام کرنے کے لئے باہر کی جانب چلا گیا۔ میں اور ایکسچرن جون خاموشی کے ساتھ بیٹھ کر ساتھ موجود کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ”چھین پیار دیکھ کر مجھے انفسوس محسوس ہوا ہے تم ایسے بھی کبھی نہیں تھے۔“ میری آنکھیں انفسوس اور تاسف کا پیش خیمہ دکھائی دیتی تھیں۔ ”لیکن مجھے انفسوس نہیں ہے۔“ کٹرل مرد لہجے میں بولا۔ ”میں نے جو کچھ بویا تھا۔ وہی کچھ پایا۔ اپنی تمام زندگی لوگوں کو لذت دینے میں گزار دی۔ اب زندگی کے آخری چند لمحوں کی لذت نامہوں کو بیان کر کے سکون حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم دونوں سننے کے لئے تیار ہو تو کرسیوں کو کچھ کچھ لو اور اپنی آواز میں بات چیت کرنا میرے لئے مشکل ثابت ہوئے۔“

میں نے اور ایکسچرن جون نے کرسیاں اٹکے کھکھکائیں۔ اور کٹرل سائی کی جانب استہانہ دیکھا۔ اس سے دیکھتے ہوئے خاموش ہو گئے۔ تو کمر مشروبات کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے مشروبات کا جگ اور گلاس ہمارے سامنے میز پر رکھ دیے اور خاموشی کے ساتھ ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ میں نے جب تک میں شرب گلاس میں اثر پایا اور ایک گلاس ایکسچرن جون کو گھٹانے سے بعد دوسرا اپنے سامنے بیڑ پر رکھ لیا کٹرل سائی نے طویل سانس لی ہوئے اپنے دست و شاک و اقامت کا آواز کیا۔

”تم جانتے ہی ہو کہ میں بچپن سے لذت ناگ فطرت کا حامل رہا ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اسکول کے دور میں ایک دفعہ میرے کسی بات پر مجھے مارا پیٹا تھا۔ تب میں نے اس کی آنکھوں پر موجو جیک کا نشانہ لے کر مٹا مارا تھا۔ ٹیک ٹوٹ کی اور شش کی چپیاں اس کی آنکھوں میں جا گئیں۔ تب میرے دل میں ایسا دفعہ خیال آیا کہ اگر انسان کی آنکھوں کو انھیں کے ذریعے باہر نکال دیا جائے۔ تب وہ کیسا لگے

گا۔ اور کبے ترے گا۔ میرے دل میں موجود اس خواہش نے شدت اختیار کرنا شروع کر دی۔ میں انسانوں کے وجود کو فنا ہوتے دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔ میں نے پتھل چپورا رک۔ کی ذی زہر کا بندوبست کیا۔ ان میں ایسی ہی ذی زہر موجود تھیں۔ جن میں انسانوں اور جانوروں کو فنا ہوتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ لیکن میں کچھ ہی دنوں میں ان ہی ذی زہر سے آگیا تھا۔ مجھے حقیقت میں سب کچھ دیکھنا تھا۔ جب ایک اچھوتے منصوبے کا تانا بانا میرے پردے پر نمودار ہوا۔ ہمارے گھر کے قریب جنگلات کا لاتناہی سلسلہ موجود تھا۔ جہاں انسانوں کی مختصر آبادی کے علاوہ جنگلی حیات کی بھی بہت تھی۔ ان دنوں والد صاحب نے مجھے شائستہ خیر خرید کر دی تھی۔ میں شائستہ من کے ذریعے نئے نئے پردوں اور جانوروں کا شکار بخوبی کر لیتا تھا۔ اسکول سے پہنچی کے بعد میرا واحد مشغلہ بھی تھا۔ ہاتھوں میں شائستہ من تھا۔ میں جنگلوں میں آوارہ پھرتا رہتا تھا۔ لیکن ہی آوارہ کر دی کے دوران ایک دفعہ میں شیرنی کی شکار کا پتہ چکا۔

شیرنی نے دو بچے دیئے ہوئے تھے۔ بچے ملی کے بچوں سے کچھ بڑے تھے۔ وہ دونوں اپنی ماں کے ہمراہ کھجار کے بار پیٹھس رویوں کی دھوپ سے محفوظ ہو رہے تھے۔ تقریباً ذی زہر معصہ ذیوں دھوپ میں بیٹھے رہے۔ میں ان تینوں کی نگاہوں سے پوشیدہ درختوں کے جھنڈ کے درمیان کھڑا انھیں بنور دیکھا۔ ہم دونوں نے انھیں اغوا کرنے کا پروگرام مرتب کیا اور شائستہ من کے علاوہ والد صاحب کا کمرہ ہمارا لے کر شام کے قریب کھجار تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہماری قسمت اچھی کی۔

شیرنی کھجار میں موجود تھی تھی۔ وہ ہمارے کھجار تک پہنچے سے کچھ دیر پہلے کھجار سے نکل کر باہر چلی گئی تھی۔ ہم نے اسے کھینے جنگلات کی جانب جاتے ہوئے بخوبی دیکھا۔ کھجار کے پاس پہنچ کر میں نے لڑکے کو باہر کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ اور خود کھجار

کے اندر گھس گیا۔ کھجار کا دہانہ باہر سے مختصر ہونے کے علاوہ اندر سے بہت کشادہ تھا۔ دونوں نے جنگل گھاس پر لیئے خواب خرگوش کے حوسے لوٹ رہے تھے۔ میں نے جب انھیں اٹھانے کی کوشش کی۔ تب انھوں نے بری طرح چٹخا چٹا شروع کر دیا۔ میری کمر پر اسکول کا بیک موجود تھا۔ میں نے بیک کو پیچھا تار اور پر کھول کر پہلے ایک بچے کو بیک کے اندر کشید اور دوسرے کو کھسپونے کے بعد بک کھسپونے کے ساتھ بند کر دیا۔ پھر کھجار سے باہر نکل آیا۔ کلا میرا اٹھ رہا تھا۔ وہ بیک کو کھول کر بچوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے طے شدہ منصوبے کے مطابق اچانک ہی جنگلات کی جانب دیکھتے ہوئے چلنا شروع کر دیا۔ ”شیرنی آ رہی ہے سامنے درختوں کے جھنڈ کی جانب چلو۔ دوسرے چھاؤڑ رکھ دیے گی۔“ لڑکا بدحواس ہو گیا۔ اور جنگل کی جانب دیکھے بغیر درختوں کے جھنڈ کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کی بدحواسی کو دیکھتے ہوئے میرے کلوں پر بے اختیار مسکراہٹ چھٹی چلی گئی۔ جسے میں نے کمال ہوشیارانہ کے ساتھ کھایا۔

جھنڈ کے قریب پہنچ کر میں نے اسے درخت پر چڑھنے میں مدد دی۔ وہ کمال ہوشیارانہ کے ساتھ چھپتی کے ساتھ درخت پر چڑھتا چلا گیا۔ درخت نہایت گہنا اور بلند قامت تھا اس پر چڑھنا مشکل ثابت نہیں ہوا۔ شیرنی کے بچے میری کمر پر موجود اسکول بیک کے اندر چھپنے چلے گئے میں مصروف تھے۔ ہم نے درخت کے ایک کونے کے ساس پھنی ہوئی کی اور چھپے پر ڈولے کے اثرات نمایاں تھے۔ اس کی شکل کو دیکھ کر کچھ بے دربارہ مہی کا نظریہ مسلط ہونے لگا۔ پھر میں تہہ مار کر ہنس پڑا۔ اس نے میری جانب تہمت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ پھر حالات کو جانچنے کے بعد فیصلے لہجے میں گایا۔ ادا رہے ہوئے بولا۔

”تو یہ سب جھوٹ تھا۔ مجھے تم سے بھی توقع تھی۔ لیکن تاہم خائن کرنے کا بھلا کیا فائدہ؟ ہم دونوں

ابھی تک گاؤں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہوتے۔“
 میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”گاؤں
 واپس جانا میرے منصوبے میں شامل نہیں ہے۔“ وہ
 جرات بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھنے لگا۔
 ”میں نے مختصر تقریر کے لئے شیری کے بچوں کو
 انوا کیا ہے۔“ پھر میں نے اس کا جواب سے بغیر جیب
 میں سے رسوں کے دو گڑے باہر نکالے۔ اور کبیر موجود
 تھیلے کی کھول کر شیری کے محصور بچوں کو نکال دیا۔
 جرات بھری نگاہوں سے میرے اچھے اکرے دیکھ رہا تھا۔
 میں نے ایک بچے سے تمنا دی اور دوسرے بچے کی گردن
 کے گرد سری باندھنے لگا۔ شیری نے بچے سے تھلا وجہ
 کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے دیکھ باندھ دی۔
 پھر دوسرے سرے کو درخت کے دو شاخ کے ساتھ باندھ
 کر کے کو درخت کی چوڑی شاخ پر بٹھا دیا۔ لڑکے نے
 سوا لیٹھ میں بچے پر چھاپا۔ ”یہ تم کیا کر رہے ہو؟“
 میں نے برسر ارجحہ میں جواب دیا۔ ”بس تم
 خاموشی کے ساتھ دیکھتے جاؤ۔ میرا تمام منصوبہ برسر
 ”لڑکا خاموش ہو گیا۔ جب میں نے دوسرا بچہ اس
 کے ہاتھوں سے پھینکا اور اسے بھی دیکھ کے ساتھ
 باندھنے لگا۔ ایک سرا گھٹا میں اور دوسرا سر اور درخت کے
 ساتھ۔ لیکن میں نے اسے درخت کے دو شاخ پر
 نہیں رکھا۔
 ہاتھوں میں قہارے مسکراتے ہوئے لڑکے کی
 جانب دیکھتے ہوئے بولا۔
 ”خدا اذیت ناک منظر کی طلب ہے۔ سسکا
 اور بڑبا چھاپا اچھے لگتا ہے۔ چاہے وہ جانور ہوں یا پھر
 انسان۔“ میں نے بات اچھوری چھوڑ دی۔ اور
 درخت کی موٹی شاخ پر اچھلتے کودتے دووں بچوں کو
 درخت سے نیچے دھکیل دیا۔ لڑکے کے منہ سے بے
 اختیار جھجک لگی۔ دیکھ کر بندے ہوئے دووں بچے
 شاخ کے ساتھ لٹک گئے۔ ان کے گلوں میں موجود سری
 نے پھندے کی صورت اختیار کر لی۔ دووں درد کی
 شدت سے تر پنے لگے۔ ان کے منہ سے بے اختیار درد

بھری چیخیں نکلتی تھیں۔ لڑکے نے اپنی دووں آنکھوں پر
 بے اختیار ہاتھ رکھ لئے۔ میں نے زوردار تہیہ کیا۔
 پھر لڑکے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔
 ”ڈر پوک انسان۔۔۔۔۔ دیکھو کتنا قریب منظر
 ہے۔“ لڑکے نے آنکھوں پر ہاتھوں کی گرفت اور بھی
 مضبوط کر لی۔ میں نے ہٹکنے کے ساتھ اس کے ہاتھوں کو
 سے بعد مضبوط کیا۔ پھر جنگل کا ماحول شیری کے دھانے
 کی آواز سے گونج اٹھا۔ وہ تھیلے کی آواز سن کر شیری
 حسی اور بچوں کے پیچھے چلانے کی آواز سن کر اس جانب
 چلی آئی تھی۔ اس دن میں نے پہلی دفعہ شیری کے غصے و
 غضب کا دلہلا دینے والا منظر دیکھا۔
 شیری نے منہ سے دھانے ہوئے درخت پر
 چڑھنے کی کوشش شروع کی۔ لیکن درخت کا تان کا پی اوپر
 تک نہ تھا۔ اس لئے وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ
 ہوئی۔ وہ سنے پر کافی اوپر تک چڑھنے کے بعد بے
 اختیار زمین پر گر پڑا۔ پھر دوبارہ دھانے ہوئی اوپر
 چڑھنے کی کوشش کر لی۔ اس کے غصے و غضب کو دیکھتے
 ہوئے مجھے اپنے جسم کے روتھنے گڑے ہوئے غصوں
 ہونے لگے۔ قریب کی شاخ پر بیٹھ ہوئے لڑکے کا
 پیٹاب خفا ہو گیا اور اس کا تم خواں رسیدہ بچے کی
 مانند خمر خراش کرنے لگا۔ شیری نے بچوں کے ہاتھ پر
 ان دووں پر بھج کی کینت طاری تھی۔ باقی تمام قریباً
 بے سادہ ہو گئے تھے۔ شیری درخت پر چڑھنے میں
 ناکام ہونے کے بعد اب زمین کو بچوں کے ذریعے
 اوپر لے میں صرف دیکھنے کی اس کی دھما سے تمام جنگل
 مل رہا تھا۔ ایسے مواقع کے دوران بچانے کیسے میری
 اذیت پر فطرت جاگ اٹھی۔ یہ سب میرے منصوبے
 کے برخلاف تھا۔ میرا ارادہ تو صرف شیری کے بچوں کو
 چھانسی کر تصویریں پینٹنے کا تھا۔ لیکن تصویریں نہ پینٹنے
 کی بنا پر منصوبہ تبدیل کرنا پڑا۔ میں نے ساتھ دانی شاخ
 پر بیٹھ ہوئے لڑکے کی جانب سرسری نگاہوں سے
 دیکھا۔ وہ بے جاہر دھماں ہو کر بے سادہ ہو چکا۔ میں

نے اپنے جسم کو مضبوطی کے ساتھ درخت کی شاخ پر
 اڑ جھٹ کیا۔ پھر شاخوں پر سے باہر نکلی۔ اپنے دووں
 ہاتھوں کو اٹھالیا۔ اس کے بعد لڑکے کو درخت سے نیچے
 دھکا دینا مشکل ثابت نہیں ہوا۔
 لڑکا چٹخا چلا تا ہوا درخت سے نیچے شیری کے
 بالکل سامنے جا کر اس کے بعد جو کہ وہاں میں تانے
 سے قاصر ہوں۔ صرف اتنا بتا دیتا ہوں۔ غصے میں
 میری ہوئی شیری نے منٹوں میں لڑکے کے سر و دھانک
 جسم کو پھینک دیا۔ پھر درخت کے نیچے کھڑے
 کھانا شروع کر دیا۔ میری جگہ کوئی اور شخص وہاں ہوتا تو
 شاید دھشت کی بدولت درخت پر بیٹھ بیٹھے اس کی جان
 نکل گئی ہو لیکن مجھے تو ایسے ہی مناظر کی طلب تھی۔
 اس لئے میں عمل انہماک کے ساتھ شیری کو چرہ بچاز
 کرتے ہوئے دیکھا۔ اس دوران میں نے مختصر
 زاویوں سے تصاویر بھی کھینچیں۔ جو اس وقت بھی میری
 تصاویر کی گلیری میں موجود ہیں۔
 جہاں قریب آ کر دے کھینچنے کے دوران شیری
 نے لڑکے کا تمام کوشش پر پ کر لیا۔ اب وہاں صرف
 بچی بچا بیٹوں یا کپڑوں کے مختصر دھانے کے علاوہ اور کچھ
 موجود نہیں تھا۔
 شیری نے منہ اٹھا کر اپنے بچوں کی لاشوں کی
 جانب دیکھا۔ پھر میری جانب دیکھ کر غرائی تھی لیکن
 اس دفعہ اس نے درخت پر چڑھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ
 درخت کے نیچے سنے کے پاس بیٹھ گئی۔ قہیادہ میرے
 نیچے اتارنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اب پریشان ہونے کی
 باری میری تھی۔ اس کے درخت کے نیچے بیٹھنے کی
 بدولت میں درخت سے نیچے نہیں اتر سکتا تھا۔ اور
 درخت پر یوں بیٹھ رہتا آسان نہیں تھا۔ لیکن مرنے کا
 کرنا کے مصداق چپ کر کے بیٹھا رہا۔
 رات ہوئی۔ لیکن شیری نے درخت کے
 نیچے سے ہٹنے کا نام نہیں لیا۔ وہ رات بھی درخت کے نیچے
 بیٹھی اور درخت کی شاخوں سے لٹکے ہوئے اپنے بچوں
 کے سر و دھانک دیکھتی جاتی تھی۔ میرا جھم جھمنا نہیں

سن کر تو کھرجا میرا وہ دے والی تھیں۔
 اچانک جنگل میں شور مچا دیا۔ کچھ لوگ
 درختوں کی جانب آتے دکھائی دیے۔ ان کے ہاتھوں
 میں روشن شمشلے موجود تھیں۔ نورن کر شیری اپنی جگہ
 سے کھڑی ہوئی۔ پھر تیر کی مانند اپنے کھجاری کی جانب
 بھاگ گئی۔ میں نے طویل سانس لی۔ پھر شیری کے سر و
 بچوں کی دیکھ کر کھلے لگا۔ لوگ ابھی کھجور سے۔ میں
 کے بندری کی پھرتی کے ساتھ درخت سے نیچے اتارنے
 کے بعد شیری کے بچوں کو درخت سے کچھ دور موجود
 کھائی میں بیٹھ دیا۔ پھر چہرے پر خوف اور گھبراہٹ
 کے تاثرات لئے لوگوں کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔
 ہجوم اب قریب آ چکا تھا۔ سب سے آگے
 والد صاحب ہاتھوں میں راتقل قہارے چہرے پر
 پریشان لئے چلے آ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے
 چہرے پر اطمینان کے تاثرات ابھرے۔ اور انہوں
 نے بے اختیار دیکھنے لگے۔ میں نے کمال
 حواسی کا جھوٹ دیتے ہوئے دھانے میں مار مار کر رونا
 شروع کر دیا۔ تمام گاؤں والے جرات بھری نگاہوں
 سے میری جانب دیکھنے لگے۔ میں نے روتے ہوئے
 انہیں حالات سے آگاہ کیا۔ لیکن شیری کے بچوں کو
 انوا کرنے اور پھر انہیں مارنے والے تمام حالات
 گول کر دیئے۔ گاؤں والوں کے چہرے پر خوف
 طاری ہونے لگا۔ اور انہوں نے واپس گاؤں کی
 جانب جانے کے لئے اصرار شروع کر دیا۔ والد
 صاحب نے انکار کیا۔ پھر گاؤں والے میرے ہمراہ
 اس درخت کی جانب چل دیے۔ جس کے نیچے لڑکے
 کی لاش کے ہاتھ بایات پڑے تھے۔ ہم نے ہاتھ بایات
 اکٹھے کئے۔ اس کے بعد والد صاحب نے کھجور کا بھی
 معائنہ کیا۔ جس میں شیری کی راتقل تھی۔ وہاں سانا
 طاری تھا۔ رات کے اس پہر کھجور کے اندر جانا مراسر
 حواقت ہو سکتی تھی۔ اس لئے والد صاحب گاؤں
 والوں کے ہمراہ واپس گاؤں کی جانب چل دیئے۔
 کرمل سانی سانس لینے کے لئے رکا۔ واقعات

کرنے کے بعد بیک کو درخت کی جڑ کے پاس رکھ دیا تھا۔ لیکن راتفل وہ تو لڑکے اور لڑکی کے ساتھ لڑنے کے دوران شاید لڑکی کو زمین سے اٹھاتے ہوئے میں نے زمین پر رکھ دی تھی۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا۔ لڑکی ریٹ ہاؤس میں قفل کرنے کے بعد جب میں نے دوبارہ چٹل کیا تھا۔ تب وہاں راتفل موجود نہیں تھی۔ ورنہ لاشعوری طور پر ضرور اٹھالیتا۔ اگر کچھ گاؤں والوں نے جانے واردات کا رخ کر لیا؟ تب حالات میرے متافی بھی جاسکتے تھے۔ میں نے فوراً لباس تبدیل کیا۔ اور ریٹ ہاؤس کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

خوف کے احساس نے میرے جسم کے رد کئے کڑے کر دیئے۔ میں اس وقت بالکل خالی تھا تھا۔ اور مجھ میں آدم خور شیر نافرمان موجود تھا۔ بلکہ مجھے اس کی ہائش گاہ کے قریب ہی تھا۔ راتفل کے راتفل کے علاوہ میرے پاس اور کسی بھی کتا تھا یا سوجو نہیں تھا۔ بہر حال سوچتے سمجھتے کدو قوت بھی نہیں تھا۔ اس لئے میں نے نیزندوں کے ساتھ سڑکا آغا کر دیا۔ میری توقع کے خلاف کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ اور میں اس جگہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ جہاں میری یادداشت کے مطابق بیک اور راتفل کو جودھو ناچا ہے تھا۔ بیک درخت کی جڑ کے پاس موجود تھا۔ لیکن راتفل غائب تھی۔ میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے۔ میں نے بیک کا تعین کر نہیں کیا تھا۔ لیکن صبح کی ٹھیک روشنی میں وہاں قدموں کے واضح نشان بخوبی دکھائی دیتے تھے۔ ان میں سے کچھ نشانات میرے تھے۔ اور کچھ تو عمر لڑکے اور لڑکی کے تھے۔ میں نے درخت کی ایک شاخ اتاری۔ اور ان نشانات کو جھدھم کرنے لگا۔ میری کوشش بالآخر یہ ہوئی کہ وہاں کوئی بھی نشان باقی نہ رہے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے فوراً ریٹ ہاؤس کا رخ کیا۔ لیکن کی روشنی تیزی کے ساتھ جھلکتی جلی جاسی تھی۔ اور گاؤں والے کسی بھی وقت جانے واردات کا رخ کر سکتے تھے۔ ریٹ ہاؤس میں پہنچ کر میں نے

میرے لئے مشکل نہیں ہے۔“

لڑکا چلائے ہوئے بولا۔ ”تم مجھے دھمکی دے رہے ہو۔ لیکن میں تمہاری دھمکیوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے۔ لڑکی ریٹ ہاؤس کے اندر موجود ہے۔ تم مجھے حاشی کی اجازت دے دو۔ ورنہ ہم زبردستی حاشی میں گئے۔“

”مجھے حاشی دینے سے انکار نہیں ہے۔ تم لوگ بخوشی حاشی لے سکتے ہو۔ لیکن انفس کی بات یہ ہے کہ میں تمہارے لئے راتوں کو جانچتا رہا ہوں۔ اور تم لوگ مجھ پر حملہ کر رہے ہو۔ یہ عمل صحیح جہاں سے چلا جاؤں گا۔ یہ میرے لئے بہت زلت کا مقام ہے۔“

جنگ میں چہ میگوئی کا آغاز ہو گیا۔ سب جگہ میری پانک کے مطابق ہورہا تھا۔ بہر حال گاؤں والوں کے متعلق فیصلے کے بعد ریٹ ہاؤس کی حاشی کا آغاز ہوا۔ سینکڑوں کا کایا کے بعد جانے پڑ گیا۔ کیا وہاں پر بھی قدوس کے نشانات نہیں گائے تھے۔ جب لڑکے پر لعن طعن کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے بعد مجھ سے معافاں مانگی گئیں اور میرے گاؤں کو چھوڑنے کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ میں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور راتفل تھا۔ ریٹ ہاؤس میں وہاں چلا آیا۔

دو پہر کا کھانا کھانے کے بعد میں نے پہاڑوں میں موجود کارخانہ کیا۔ میں اپنے بہرہ گاہ کی اور میلہ و بیج تیار کر کے لایا تھا۔ تاکہ لڑکی کی پیٹ پوچا جاسکے۔ غار کے وہاں سے آگے سے چھڑانے کے بعد جب میں نے اپنے قدم رکھا۔ تب لڑکی کو زمینوں سے اٹھ کر ہونے نہایت غیر فطری انداز میں بڑے ہوئے پایا۔ پہلی نگاہ میں..... میں جان گیا کہ وہ مرچا ہے۔ یہ میرے ارادے کے خلاف تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے زمینوں سے اڑا دیا۔ اس کی ناک کھینچی سے خون بہہ کر غار کی پتھری زمین کو رخسار کر رہا تھا۔ بیٹا اس کی موت کبھی پرکھنے والے کھونے کی بدولت واضح ہوئی تھی۔

ایک نیکو اپنے پیچھے قدموں کی آہستہ نشانی دی۔ میں نے پھر مرنے کے ساتھ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ لیکن نشانی

کے وہاں سے کچھ اجرت بھری لگا ہوں سے لڑکی کی لاش کی جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے آہستہ کھینچی گاڑے سے راتفل اتاری اور لڑکے کے سینے کا نشانہ لے کر قاتل کر دیا۔ وہ کینڈا کی ٹانہ پانی جگہ سے اچھلا غار کے وہاں سے باہر جا کر گولی گولی اس کے سینے پر لگی تھی۔

میں نے طویل سانس لیے تو راتفل کو زمین پر رکھا۔ اور آگے بڑھ کر لڑکے کی لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ گولی سینے پر لگی تھی۔ وہاں مختصر سوراخ موجود تھا۔ لیکن سر کی جانب کافی سے زیادہ گھاؤ موجود تھا۔ میں نے گھبراہٹ سے سوچے رہے کے بعد لڑکی کی لاش کو غار کے اندر منتقل کیا۔ پھر وہاں کو پتھروں کے ساتھ بند کرنے کے بعد ریٹ ہاؤس میں چلا آیا۔

آج رات کو میں نے راتفل کا گھر سے ساتھ لٹائی۔ اور ایک دفعہ گھر کا رخ کیا۔ میں نے یکے بعد دیگرے دو ڈھول ادا نہیں کئے۔ ریٹ ہاؤس میں قفل کیا۔ لڑکی کی لاش محل تھی۔ لیکن لڑکے کی لاش کے گھر سے لگاؤ میں سے حوا تر خون بہتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے کمرے میں موجود فرسٹ ایڈ کس کو اٹھا لیا اور لڑکے کی لاش کا آپریشن شروع کر دیا۔ نہایت مہارت کے ساتھ میں نے زخموں کو دھوا پھر تگے لگا دیئے۔ میرے پاس لاش کو محفوظ کرنے والا سالہ موجود تھا۔ جو مجھے افریقہ کے سانی قبیلے سے دستیاب تھا۔ میں نے لاشوں پر سالہ لگایا اور انہیں کڑیوں کے قہلوں میں لپیٹ کر لڑکی کے کمرے میں قفل کر دیا۔ پھر دروازے کو کھانا لگانے کے بعد میں نے غسل کیا۔ پھر کھانا بنانے کے بعد آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر اپنے منصوبے کو اگلے پیچیدہ پہلوؤں پر نظر ثانی کرنے لگا۔“

گھٹن سائی نے طویل سانس لیے ہوئے ہم دونوں کی جانب دیکھا۔ ہماری آنکھوں میں دھمکی کی لہر دوڑنے لگی تھی۔ اس نے سائیل ٹھیل پر موجود گولی کی شیشی اٹھائی اور پانی کے ساتھ گولی گھٹنے کے بعد دوبارہ بھٹکا ہوا۔

”میری رات گاہ کے نیچے تہہ خانے میں

میرے شکار کردہ جانوروں کے بھوس پھرنے لاشوں کے لاتعداد جسم موجود ہیں۔ لیکن میری زندگی کا اصل مقصد کچھ اور ہے۔ تم دونوں یقین نہیں کرو گے۔ لیکن ایسا ہی ہے۔ میری رہائش گاہ کے نیچے جانوروں والے تھہ خانے کے علاوہ ایک تھہ خانہ اور بھی موجود ہے۔ جہاں انسانوں کے لاپسے لائے موجود ہیں۔ جن پر سالگرہ کارڈ نہیں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ لائے تیار کرنے کے لئے جن تکنیکی مراحل کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ میں نے اس کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔ بلکہ اس علم میں خاصی مہارت بھی حاصل کی ہے۔ آج میری رہائش گاہ کے تھہ خانے میں ایسے نادر و نوجہ نباتات موجود ہیں۔ جنہیں دیکھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ لیکن آپ دونوں کو تھہ خانے میں جانے سے پہلے میری مکمل آپ بیتی سننی ہوگی۔ اس سے دو بار ہمارا سانس کھینچنا پھر بولا۔

”لو کہ اور لڑکی کی لاش کو سالگرہ لائے۔“ میں نے ڈپٹی کے کمرے میں منتقل کرنے کے بعد کانی کا پیالہ تھا اور آرام دہ کرسی پر بیٹھا۔ کچھ دیر وقت تھا۔ جب میرے دریاغ میں انسانوں کے لاشوں سے مزین گہری بنانے کے منصوبے نے ختم کیا۔ جانوروں کے لائے تیار کرنے کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اپنے شکاری دوست احباب کو شکاری زندگی کے واقعات تنگ کر دیا جائے۔ ظاہر ہے انسانوں کے لائے شام میں کھانے کی برائی دوست کے سامنے کسی کارناموں کے طور پر سامنے نہیں لاسکتا تھا۔ لیکن میرا مقصد ایسا تھا بھی نہیں۔ میں تو صرف اتنا چاہتا تھا کہ میرے مرنے کے بعد لوگ مجھے ایک اذیت پسند شکاری کے نام سے منسوب کریں۔ تم دونوں کو یہاں لانے کا مقصد بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

بہر حال، ابھی میں کانی کا پیالہ مکمل پیتے ہی نہیں پایا تھا کہ اچانک ریٹ ہڈس کے دروازے کو زور زور سے دھڑکا گیا۔ میں بڑبڑا کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کانی کا پیالہ میرے ہاتھوں سے گر کر ٹہک گیا۔ یہ ایک غیر یقینی بات کی۔ رات کے اس پہر بھلا کون

ریٹ ہڈس کا رخ کر سکتا تھا۔ گاؤں والوں میں سے کوئی بھی ایسی جرأت نہیں کر سکتا۔ پھر باہر کون تھا؟ جو لگا تار دروازے کو کھٹکھٹانے چلا جا رہا تھا۔ میں نے کانی کا پیالہ میز پر رکھا۔ اور دراصل ہاتھ میں تھا ہے باہر کی جانب چل دیا۔ دروازہ کھولنے پر میں نے اگلے یون کو خوفزدہ چہرے کے ساتھ گھڑے پایا۔ اگلے یون کی گاؤں میں کربانے کی دکان تھی۔ میں بھی ضرورت کی ایک اشیا اس کی دکان سے ہی لاتا تھا۔ اس وقت اس کی موجودگی میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ میں نے نیکی گاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ جب وہ پریشان کن لہجے میں بولا۔

اس وقت تکلیف دہ کی معافی چاہتا ہوں۔ لیکن معاملہ غیر معمولی نوعیت کا ہونے کے باعث، اپنے آپ کو روک نہیں پایا۔ اس لئے مجبور چلا آیا۔ میں نے اسے اندر آئے کا اشارہ کیا۔ لیکن اس نے انکار کر دیا۔ پھر مجھے یہ کہنے لگا۔

”میرا نوکر توئی رات بھر سے غائب ہے۔ میرے اندازے کے مطابق شاید وہ دکان کے اندر بند ہو گیا ہے۔ بات کچھ یوں ہے کہ وہ میرے ساتھ دکان میں کام کر رہا تھا۔ میں نے کسی بات پر اسے مزے نہ لیں۔ پھر مزے اسے طور پر پاؤں کا مکمل پائل صاف کرنے کے لئے دکان سے ملحقہ گروم میں بھیج دیا۔ سرخاش میں نے دکان کو بند کر کے دروازے کو تالا لگا دیا۔ یونی پائے بھیج کر کے کھر چلا جاتا تھا۔ جبکہ میں دکان میں غرضوں نہیں کر پایا۔ وہ دکان کے زبانی کے ساتھ کسی خاص قسم کے تالا اور میں نے پیچھے موجود گروم میں پاؤں صاف کرنا اور میں نے بند کر کے کھر چلا آیا۔ اب سے کچھ دیر پہلے فونی کی والدہ نے کھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میرے پوچھنے پر اس نے فونی کے منتقل دریافت کیا۔ تب میرے روٹھنے کڑے ہو گئے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ میری دکان کے پیچھے کھلے جنگل کا آفتاب ہوتا ہے۔ آج خود کے لئے دکان کا تالا دروازہ توڑنا کچھ مشکل ثابت نہیں ہو سکتا۔ ریٹ ہڈس میری رہائش گاہ سے قریب ہے۔ اس لئے میں مدد کے لئے آپ کے پاس چلا آیا۔“

”ہوں۔۔۔“ میں نے بکاہہ میرا۔ پھر اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ لڑکے کی ماں کہاں ہے؟

”وہ میرے گھر میں موجود ہے۔ میں نے اپنی بیوی کو خاص تاکید کی ہے کہ میرے واپس آنے تک اسے باہر نہ نکلے۔ لیکن وہ بہت پریشان دکھائی دیتی تھی۔ بچے کی تلاش میں کچھ بھی کر سکتی تھی۔“

میں نے انہماک میں سر ہلا دیا اور اگلے یون کے ہمراہ دکان کی جانب چل دیا۔ اس کی دکان گاؤں سے باہر کچھ دیر کے گھٹے درختوں کے جھنڈے کے درمیان واقع تھی۔ پھر جانب ہوا کہ عالم غاری تھا۔ دکان کے پاس پہنچتے ہی میری شکاری حس نے خطرے کا اعلان کر دیا۔ وہاں غیر معمولی خاموشی اور دہرائی غاری تھی۔ جھنجھکے کے بولنے کی آواز بھی معدوم تھی۔ میں نے اگلے یون کو کھنڈ کے پاس کھڑے ہونے کی ہدایت کی اور خود راکفل تھا سے دکان کی جانب چل دیا۔ دکان دو حصوں پر مشتمل تھا۔ پہلا حصہ بڑے چوں کا تھا۔ جس کا سامنے کڑی کا آبرہ بنا ہوا تھا۔ اور پچھلا حصہ گروم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ لڑکا دکان کے پچھلے حصے میں موجود گروم میں مقید تھا۔ آبرہ کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر احتیاط کے ساتھ حالات کا جائزہ لیا۔ لیکن کوئی بھی غیر معمولی بات دکھائی نہیں دی۔ میں نے دکان کے دروازے کے ساتھ کان لگا دیے۔ دکان کے اندر خاموشی غاری تھی۔ میں آبرہ کے پاس بڑھ کر کدکان کے پچھلے حصے کی جانب موجود گروم کی کھجلی دیوار کی جانب چل دیا۔ یہاں میں گروم سے کچھ دور تھا کہ مجھے پڑیاں چھنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے ٹھٹھک کر دیکھا کہ اس آواز لاکھوں آوازوں میں ہی پھیناں لگا سکتا تھا۔ کئی دفعہ جنگل میں شکار کے دوران اس آوازوں سے میرا واسطہ پڑ چکا تھا۔ میں نے آواز کا تعین کیا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر دکان کی دیوار دائیں جانب مڑی تھی۔ میں نے نہایت احتیاط کے ساتھ دیکھنے مڑوں آگے بڑھ کر دیوار کے ساتھ چپکتے ہوئے دکان کے پچھواڑے کی طرف دیکھا۔ لیکن پھر بھی دکھائی نہیں دیا۔

آوازوں کی شدت میں نمایاں زیادتی واقع ہوئی۔ اور اب ان کی سمت کا تعین کرنا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ میں دیوار کی آڑ سے باہر نکل آیا۔ دکان کی کھجلی دیوار کا مکمل حصہ میری گھٹوں کے سامنے موجود تھا۔ بہت دور اخلا کے علاوہ کڑی کا نام و نشان بھی موجود نہیں تھا۔ آج خود شیر کے تھہ خانے میں پچھلی کی بدلت کڑی جو کڑی کی دیوار میں نصب تھی۔ دیوار سمیت کڑی جو اندر جا کر بھی غلام کے اندر گنبد اندر موجود تھا۔ میں دیکھ قدموں غلام کی جانب بڑھنے لگا۔ میری انگلیاں راکفل کے کھوڑے پر موجود تھیں۔ اور میں ہر دم کے حالات سے متجاہد کرنے کے لئے بخوبی تیار تھا۔

اچانک میری اذیت پسند فطرت اودر جاگ اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں میں شیطانت کی چمک اُبھری۔ میں آج خود گروم کا آسانی اپنی بدوق کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ لیکن ہوا نہیں۔۔۔؟ کئی میرے جذبہ کی تسکین نہیں ہو پائی تھی۔ میری اذیت پسند فطرت کا لالاک بڑھ کر چلا جا رہا تھا۔ نہایت آہستگی کے ساتھ میں دوبارہ دکان کے داخلی دروازے کی جانب چل دیا۔ درختوں کے جھنڈے کے پاس اگلے یون بت کا ٹوٹا میرا منتظر تھا۔ میں نے اس کے پاس کھنچ کرسات لیجے کیا۔

”لڑکا دکان کے اندر موجود ہے۔ دروازے کا تالا کھولا۔ اور اسے باہر نکالو۔“ اگلے یون کے یوں سے اطمینان کا طویل سانس خارج ہوا۔ اور وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے میرے ہمراہ دکان کے دروازے کی جانب چل دیا۔ یہاں کی چائیاں اس کے ہاتھوں میں موجود تھیں۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے تالا کھولا۔ اور دروازے کو کھادانے کر کھول دیا۔ ابھی اس نے کمرے میں قدم بھی نہیں رکھا تھا کہ میں نے پھرتی کے ساتھ اسے دکان کے اندر دھکیل کر دروازے کے پٹ کو بند کر کے کنڈی لگا دی۔ اس نے چلائے ہوئے دروازہ پینٹا شروع کر دیا۔ بیگفتہ شیر کے دھانڈے کی آواز سے ماحول کو بھج اٹھا۔ میں پھرتی کے ساتھ

برآمدے کے ستونوں کے اوپر سے چڑھتا ہوا چھت تک جا پہنچا۔ وہاں وسیع درمیں روشن دان موجود تھا۔ میں نے تقریباً رڈن دان کے اندر گھس لیا۔ تمام رڈن دان سامنے موجود تھی۔ اگلے یون نے اندر اوروں کرنے کے لئے ماتھی چلائی تھی۔ لیکن اسے اجس کے علاوہ اور کچھ جالانے کا موقع نہیں مل سکا۔ آدم خور نے اگلے یون کو ہتھ دے دیئے اور حمل کر دیا۔

ماجس کی تلی شئی کے تیل سے بھرے ڈرم پر جاگری۔ ڈرم نے آگ پکڑ لی۔ آگ کی بدولت ماحول روشن ہو گیا اور مجھے تھوڑے کچھ کا موقع مل گیا۔ میں نے غیر متوقع حالات کی بجائے کچھ خوشگوار کی۔ آدم خور نے کس طرح اگلے یون کو رڈن کے پاس سے پکڑا۔ پھر انہیں زمین پر گرایا۔ اگلے یون کے چہرے پر دہشت کا تاثر تھا۔۔۔۔۔ علاوہ انہیں باقی تھوڑے آدم خور کی گرفت سے باہر نکلتے تھے۔ لیکن کوکشن میں ناکا می۔۔۔۔۔ سب ہم بھری رہا ہش گاہ کے نیچے موجود وسیع درمیں تہ خانے کی دیوار پر گئیں۔ یہاں میں نمایاں ہے۔

اچانک غائب ہو گیا۔

دکان کی آگ نے شدت پکڑ لی تھی۔ شیر یقیقہ دکان سے لحدت کو دام کے اندر جا چکا تھا۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ میں نے تھمت سے نیچے چھلاک لگائی اور آندھی و طوفان کی مانند بھاگا ہوا۔ دکان کے پچھواڑے میں موجود گودام کی دیوار میں موجود خلاء کے سامنے آ کر کھڑا ہوا۔ یہاں کسی قسم کا کوئی درخت موجود نہیں تھا۔ چھپنے کے لئے کوئی جگہ موجود نہیں تھی۔ میرے مقابلہ زمین پر کھڑے ہو کر کھڑا تھا۔ میں گودام کی آکڑی ہوئی کڑی سے تقریباً تین چالیس قدموں کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ یہی ممکن تھا کہ شیر اس مختصر وقت کے دوران فرار ہو چکا تھا۔ جس وقت کے دوران میں چھت سے نیچے گودام کی کڑی کے سامنے آیا تھا۔ میں زمین پر راست کرنا اقل تانے نظر میں کڑی کے خلاء کے بڑھانے سے راستہ جامد ہو گیا۔ آگ نے نیچے پلانے کرنے کی نگرانی نہیں کی۔ پھر بڑے بڑے پوتے گودام تک آ گئی۔ اب کسی بھی لئے شیر گودام کی کوئی ہوئی کڑی سے باہر آ سکتا تھا۔ میری نگاہیں پھر کی مانند کڑی کے خلاء پر مرکوز تھیں۔

آگ کے شیشے آسمان کو چھو رہے تھے۔ لیکن وہ باہر نہیں آیا۔ ابھی تک گودام کا کچھ حصہ جلنے سے بچا ہوا تھا۔ یقیقہ وہ حصہ جو میں سے بھر چکا ہوگا۔ اگر شیر وہاں ہوتا۔ جب وہیں سے گھبرا کر باہر آ جاتا لیکن ابھی نہیں ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دکان کے گودام کے راستے فرار ہو گیا تھا۔

میں کپڑے بھاڑتا ہوا زمین سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میری کمر پر موجود دیک میں وہ کیمرو موجود تھا۔ جس میں ناقابل یقین مائنٹر فلیمبہ تھے۔ شیر کے فرار ہونے سے کچھ خاص ترس میں نہیں پڑتا تھا۔ میرا وہ متعدد ہوا ہو چکا تھا۔ جس کے لئے میں جنگوں کی خاک چھاتا ہر رہا تھا۔ میں نے رائل کوسید سے اچھے میں تھا۔ اور پھر یہ تدریس کے ساتھ گودام کی کڑی کی جانب چل دی۔ ابھی میں کڑی سے دس قدم کے فاصلے پر تھا کہ وہ موڑی

دھاڑتا ہوا باہر نکلا۔ میں چونک کر شیشے کے لئے تیار تھا۔ اس کا چہرہ خبیث و غضب کی صورت دکھائی دیتا تھا۔ میں نے رائل کوسید کا حیا اور بے دریغ کوئی جاڑی۔ وہ چیخ دھاڑتا زمین پر گر کر پھر پھرتی کے ساتھ ہٹتی کھار کھا۔ جب تک میں بندھن کو دوبارہ لوڑ نہ کرے وہ دھاڑتا ہوا دکان کے نیچے موجود جنگل میں غائب ہو گیا۔ میں نے اطمینان کا طویل سانس لیا۔ اور بندھن افشا کر گاؤں کی جانب چل دیا۔ دکان میں طور پر آگ کے لٹاؤ میں آچکی تھی۔ اسے بجھانا اب ممکن نہیں تھا۔

دوسرے دن صبح سویرے میں گاؤں والوں کے ہمراہ جب میں نے دکان کا رخ کیا۔ جب دکان میں کڑی کو کھلے میں چکی تھی۔ وہاں کسی بھی قسم کا کوئی سامان موجود نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے کی جدوجہد کے بعد راکھ سے ٹوٹی اور اگلے یون کے جسموں کی ہڈیاں دستیاب ہوئیں۔ گاؤں کے درویشین ہڈانے کے لئے گاؤں سے گئے۔ جب میں نے دکان کے پچھواڑے کی زمین کا جائزہ لیا۔ وہاں زمین پر بخون کے قطرے موجود تھے۔ اور آدم خور کے قدموں کے نشانات بھی۔ میں نے نشانات کا تعاقب شروع کیا۔ لیکن ان کا رخ جنگل کی جانب تھا۔ خون کے قطرے اب کھیر کی صورت اختیار کرنے لگے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کاربی تھا۔ موڈی کی موت کا باعث بن سکتا تھا۔ موڈی کا رخ جنگل کے ساتھ موجود پھاڑی کی جانب تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دشواری ہو گئی تھی۔ کوئی کڑی کھانے کے بعد اس نے اپنے کھار کا رخ کرنا بہتر جانتا تھا۔ خون کی کھیر موٹی ہو گئی۔ ایک درخت کے نیچے خون تالاب کی صورت میں موجود تھا۔ یہاں شاید آدم خور سنانے کے لئے بیٹھا رہا ہوگا۔ ہیریٹ کھار کے قریب چھپنے کے بعد میں نے کھار کے اندر متعدد بڑے پتھر پھینچے۔ لیکن کسی قسم کا رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ اب اللہ کا نام لے کر میں غار کے اندر داخل ہو گیا۔

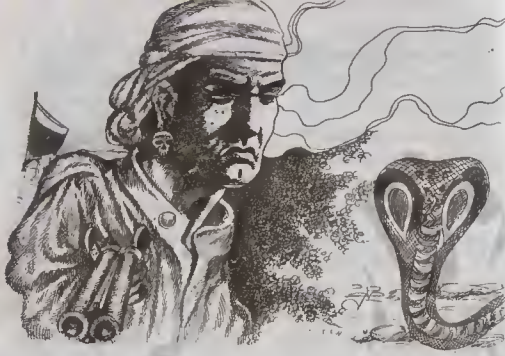
آدم خور سامنے ہی مردہ حالت میں یوں موجود تھا کہ اس کا منہ ایک بڑے پتھر پر ٹکا ہوا تھا۔ جبکہ باقی تمام مردہ زمین پر تقریباً بچھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے جسم کا معائنہ کر لیا۔ میری چلائی ہوئی گولی اس کے سینے کو چاڑھ کر دوں چھوٹی ہوئی گولی تھی۔ یقیقہ گولی نے دل کو بھی کسی حد تک نقصان پہنچایا ہوگا۔ جس کی بدولت آدم خور کی موت واقع ہوئی۔

وہ یکدم خاموش ہو گیا۔ میں نے اسٹیکر جون کی جانب دیکھنے کے بعد کڑی مانی سے مخاطب ہونے لگا۔

”تمہارے کارنامے قابل تحسین ہیں۔ اور میں کسی حد تک کارناموں کے نیچے پشیمند مقصد سے آ گیا ہوں۔ لیکن مجھے یہ سمجھنے میں وقت پیدا ہو رہی ہو کرتے ہیں۔ مجھے اور اچھا جوں کو یہاں کیوں بلایا ہے؟ کیا تم اپنے آپ کو فرائی کے لئے پیش کرنا چاہتے ہو۔ اور اہل اسکی ہی سے تو تم اسٹیکر جوں کو بلا کر ماریا کر سکتے تھے۔“

کڑی مانی طویل سانس لے کر بولا۔ ”میں انسانیت کا مجرم ہوں۔ مجھے سزا دلانی ہی چاہئے۔ لیکن اس سے پہلے میں تم دونوں کو اپنی آرت کیلبر کی ہیرا کاروانا چاہتا ہوں۔“ اس نے اپنے نوکر کو اشارہ کیا۔ وہ بھرتی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ جب وہاں آیا۔ جس اب اس کے ہمارا دہلی جیٹرو جیٹرو کی کڑی مانی کو اس پر بیٹھا کیا۔ بہرہم دونوں کے ہمارا ہش گاہ کے نیچے حصے میں موجود تہ خانے میں لے جایا گیا۔

خدا کی پناہ۔۔۔۔۔ میری آنکھیں نفرت اور حسرت کی شدت سے پھٹ گئیں۔ وہاں انسانوں کے پیسے بھرے ایسے لاشے موجود تھے۔ جن کو سائلے لاکر انہیں محفوظ کر لیا گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کی حالت خوفناک تھی۔ میں دیکھیں آٹھ کے قریب دیوانوں اور پندرہ کے قریب جوان مردوں کی لاشیں تہ خانے کے اندر موجود تھیں۔ وہاں کچل کا خاطر خواہ بندوبست کیا گیا تھا۔ فائوس کے علاوہ ٹیوب لائٹس دیواروں پر لگی تھی تھیں۔ ان لائٹوں کے نیچے کچھ دیواروں پر کمرے سے چھٹی کی متعدد تصاویر موجود تھیں۔ جن کو دیکھنے کے بعد بدن کے روگھنے کمرے ہو جاتے تھے۔ درمیان



قتل موذی

عامر ملک-راولپنڈی

اچانک مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے ایک نمازی کے دونوں ہاتھوں کے درمیان ایک کالا خوفناک ناک پھن پھیلانے نمودار ہوا۔ چشم زند میں کسی غیبی طلاق کے بل بوتے پر نمازی کا ایک ہاتھوں ناک کے سر پر اور دوسرا ہاتھوں اس کی دم پر دم پڑ گیا تو.....

دل و دماغ اور عقل کو حیران کرنا ایک عجیب و غریب دہشت ناک اور حیرت انگیز شاخسانہ

ایک دفعہ شاہ عبدالعزیز رحمت دہلوی کے ساتھ چش آیا تھا۔ کالا شاہ ناک ٹرپ رہا تھا۔ چل رہا تھا۔ مل کھارہا تھا۔ ساپ اپنی زندگی بچانے کی گھڑن کو کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ایک جوان مرد کی کڑت۔ ہاتھ کی ہویا پاؤں کی۔ اس سے چھٹکارا مانا تاہم نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہوتا ہے۔ اور جب اس گرفت میں لگتی ہے جب نہ جی میں شامل ہوتی ہے میرے گرفت ایک گھنٹہ بن جاتا کرتی ہے..... کالا ناک میرے دونوں پاؤں کے نیچے دبا ہوا اپنی پوری طاقت سے فراری جہد جہد میں مصروف تھا۔

بات دراصل ایسی تھی کہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔ ایک بک درکن میں جاتے وقت میری نگاہ کانگوں کے درمیان گئی..... ایک سیاہ ساپ چمن اٹھائے مجھ پر ہوا تھا..... لوہا اس کی نگاہوں کی چمک سے میں بہت ہوش ہو کے رہ گیا۔ موت مجھ سے اس قدر قریب تھی کہ میرے ہاتھ سے منفلوج ہو گئے تھے۔ دوسرے ہی لمحے سر کا ناک تھکے کا فرمان میرے ذہن میں گھوم گیا اور میں خوف کے عالم سے عالم ہوش میں آ گیا۔ مجھے پھر پتہ نہ چلا کہ کون سی طاقت مجھ میں درآئی اور کس طرح وہ سب کچھ ہو گیا۔

والی دیوار پر اگلے یون کی تصویر موجود تھی۔ میرے انہیں گردن کے پاس سے پکڑ رکھا تھا۔ ان کی آنکھوں میں دہشت اور خوف کا ایسا تاثر موجود تھا۔ جو آج سے پہلے میں نے کسی بھی کسی انسانی چہرے پر نہیں دیکھے تھے۔

بلند کرل سائی ایک اہر تو فرکار کا درجہ رکھتا تھا۔ میں اس نے اپنے کن کو انسانیت کے خلاف استعمال کیا تھا۔ تھہ خانے کی دیوار پر اس معصوم بچے کی تصاویر بھی موجود تھیں۔ جسے کرل سائی نے بچپن کے دنوں میں شیرینی کی بیسٹ چڑھایا تھا۔ یہ تصاویر کچھ غیر واضح تھیں۔ کچھ کرل سائی کی شکل کرنے کی کوشش کی تھی اور کچھ بچپن کی نا تجربہ کاری تھیں۔ شاید انہی دنوں میں کرل سائی نے اپنی اذیت ناک زندگی کا آغاز کیا ہوگا۔ اور نا تجربہ کاری کی بنا پر مکمل اور مفصل تصاویر نہیں لاتا پایا ہوگا۔

میں نے فزٹ بھری نگاہ کرل سائی پر ڈالی۔ پھر اسے اختیار ہوا ہاتھ فضا میں اٹھا۔ اور تھہ خانے کا حامل ٹھیکری کو گھسے۔ جھنجھکا اٹھا۔ ٹھیکری شدت کی بدولت ذہنی چیز پر پیش کرل سائی کا منہ بے اختیار مخالف سمت کو گھم گیا۔ پھر حرکت انگیز طور پر تھہ خانے اس کے گھماؤ کر دینے کی آواز سے کو گھسے۔ میں نے حیرت بھری نگاہوں سے اپنے سامنے بیٹھے اذیت پسند انسان کی جانب دیکھا۔ جو میرے ایک ٹھیکری کی بدولت بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر دروہا تھا۔ پھر اچانک ہی اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور مکمل چھتر کے اوپر سے ہوتا ہوا بچے میں پڑ کر۔ میں نے گھر کا پیچھے ہٹنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے پھرتی کے ساتھ میرے پاؤں کو قحط لیا۔ اور کرل سائی نے ہونے لایا۔

”مجھ پر دم کر..... میں ایسی بیماری میں گرفتار ہوں۔ جس کا علاج نہیں ممکن اور میں ٹرپ ٹرپ کر رہا ہوں۔ مجھے چھائی پر چڑھا دو۔ جیسا میرے حق میں بہتر ہوگا۔“

میں نے فزٹ کے ساتھ اس پر قحط دیا۔ پھر غصیلے لہجے میں کہا۔



ایک باؤس سانپ کے سر پر تھا اور دوسرا اس کی دم پر۔ اور میں نے پوری طاقت سے اسے ہارکا تھا۔ یہ سب کچھ پلک جھپکنے میں ہو گیا تھا۔ سانپ کے منہ کو میں باؤس کی آڑی سے کپٹنے میں تنہک تھا۔ یہ تصویر کوئی بھی پاس نہ تھا۔ وہ نہ اس کا تیا گیا خبردار نہ کرتا۔

سانپ کو بل کھانے دیکھ کر میں حیرت زدہ ہی تھا۔ پتہ نہیں میرے جی میں کیا آیا کہ سچے جھگ کر میں نے سانپ کے گل کھانے ہوئے کسی پر بھی ہاتھ لگائیں پھر بھی شروع کر دیں۔ کتلا تھام کتلا اس کا دھو جھنکنا اس وقت میں انسان کے لئے نہیں۔ بغض، انتقام اور ہلاکت بھری ہوئی تھی۔ اور پھر ایک ہی میرا باپاں پاؤں ذرا سا۔ بالکل ذرا سا لپٹا جانے سے گل کیا۔ لڑا سانپ کی دم آدھ ہوئی اور پھر..... اپنی منہ زار کلام اور لٹام جو میری دائیں بائیں سے ناک کے گرد لپٹ چکا تھا۔ مجھے اپنی پٹنڈی کی بڑی ٹوٹی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ لیکن میں نے انتہائی صبر اور ہمت سے کام لیتے ہوئے سانپ کے سر کو پھوپھی سے گل دیا۔ لٹام جو دیکھ کر گھبرا کر پڑ گیا۔ پڑ گیا اور چنچل ہوا۔ ایک سیاہ سانپ..... گینہ پرور دشمن میرے قدموں میں مردہ پڑا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور ہا ہا کرنا۔ ہاتھ پاؤں دھوئے پھر روک دیا اور ایک چھڑی لے کر دوا گھر کرے میں آیا کہ سانپ کا ٹھکانا کہاں ہے۔

میری حیرت کی انتہائی حد یہی تھی۔ دیکھا کہ سانپ اندر کرے میں موجود تھا۔ اور چہاں میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ وہاں کی زمین علی ہوئی سی محسوس ہوئی تھی۔ میں چند لمبے حیرت زدہ نظر اڑا رہا۔ اور ہزار ہزار میں مشغول ہو گیا۔ فرض تو فرض ہوتا ہے۔ دنیاؤں کا مومنوں کو پس پشت ڈال کر انسان پر فرض کی افادگی کے لئے خدا کے حضور میں جھک جائے۔ کتنا سعادت ہے اور یہی انسان کی پیدائش کا مقصد ہے۔

ترجمہ: ”ہم نے انسان اور جنوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت کریں۔“ (سورہ زاریات۔ آیت نمبر ۵۶)

☆☆☆☆☆

میری عادت ہے کہ میں کسی بھی جگہ جا کر دو گھنٹہ دیر بیٹھوں کرتا اور موزی کی آواز بند نہیں کرتا۔ خدا رسول کے احکام حتی المقدور بجالاتا ہوں، اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں کرتا۔ ایک انسان..... بلکہ مسلمان کا یہی شیوہ ہونا چاہیے۔

موزی کی ہوج چکا تھا۔ اور دل مطمئن ہو چکا تھا مگر کچھ دیر بعد ہی ایک عجیب سی بے چینی، بے قیاسی محسوس ہونے لگی۔ کچھ لمبا نہیں رہا تھا مگر کچھ لمبا رہا تھا۔ جی میں آیا تھا کہ باہر کھل جاؤں..... دوڑ نکلیں دوڑ..... جہاں کوئی تعارض نہ ہو۔ کچھ لمبا نہیں رہا تھا۔ لیکن میں نے اس کو سکون اور سکوت ہو..... مکمل سکوت..... دل کی باتوں پر بھی سکون اور خیر دینا چاہیے میرے صرف ان باتوں پر جن میں خدا اور رسول کے احکام کی خلاف ورزی جھلک رہی ہو۔ میرے دل کی خواہش میں مجھے کوئی تاثر بھی نظر نہ آئی۔

شام دھیرے دھیرے چلی آ رہی تھی۔ سورج بھی غروب ہوا تھا۔ شفق کے لہرے آسمان کی پہنائیوں میں چل رہے تھے، رات ابھی دور تھی..... گلیاں گلیاں سا اجالہ بھی موجود تھا اور میں بغیر دایک کے شرفی علاقے کو پیچھے چھوڑنا ہوا۔ مٹی کے لوٹے لوٹے ٹیلوں کے کٹے میدان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میرے قدم غوری خود اس طرف اٹھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کسی ایسا نہ ہوا تھا کہ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی طرف بے عافیت چل پڑوں۔

آج کا دن شاید ایک عجیب دن تھا۔ میں اپنے دھیان میں تھا۔ پھر شری آبادی بہت دور ہو گئی تھی۔ ایک ایسا جگہ میری یاد نہیں تیرہ ہو گئیں سامنے بہت سے خیمے لگے ہوئے تھے۔ انتہائی قیاسی حیرت اور خوش مزاج تھے اور ان کے قریب میں کافی اونٹنی پر ایک بہت بڑی روشنی تھی۔ جس کی روشنی چاروں طرف میں رہی کی روشنی میں علاقہ منور ہوا تھا۔ میری آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی اسی منج سے چھوٹ رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ اتنی تیز ہوا کے باوجود منج کی اوپر پھڑپھڑائیں رہی تھی۔ بلکہ ساکت..... بالکل ساکت ایک سی جگہ تھی۔ ہولی ہولی معلوم ہوئی تھی۔ ابھی میں حیرت سے جھٹکنے سے نہیں بلیا تھا کہ

دو آدمی جو درہا ہوں میں وردی پہنے ہوئے تھے۔ میرے دائیں بائیں آگئے۔ انہوں نے میرے ہاتھوں کو اپنی گرفت میں جکڑ لیا اور بولے۔

”چلو نہیں جاؤ! سلامت دیا رہے ہیں۔“
میں حیرت زدہ رہ گیا..... کیا ہوا ہاشا..... اور کیا بلالہ.....؟ لیکن ان کی مشرور گرفت میں، میں ان کے ساتھ ساتھ چلا رہا تھا۔ دو آدمی میرے ایک ایک آراستہ وسیع راستے خیمے میں کھینچ گئے۔ خیمے میں کرسیوں کی قطاریں تھیں۔ گیس اور ان پر بہت سے پائے تھے۔ میرے بہت بڑا تھا۔ جس کے سامنے والے سر پر ایک زندگنا کرسی پر ایک عقیم ایڈجسٹ میٹھا تھا۔ اس کی صورت سے اس قدر جلال اور عجب ہو گیا تھا کہ میں اس سے نظر نہ ملا۔ اور کچھ دیر کے بعد ایک گھبراہٹ سے اس پر کھینچ کر لے گیا۔

”مقدمہ پیش کیا جائے۔“
اور دوسرے ہی لمحے دو شخص میرے قریب آکر بے ہوئے۔ وہاں مجھے چھوڑ کر پٹ پٹے تھے ایک شخص کہنے لگا۔

”جہاں پناہ! اس آدمی نے زانوئے ہمارے ایک بھائی کو قتل کر دیا ہے۔ جس خدائے وہاں وقت موجود تھی۔ لیکن اس کی کوئی مدد نہ کر سکے۔“
”تم نے کیوں اپنے بھائی کی مدد نہ کی؟ جواب دو۔“ جہاں پناہ غصہ بھری آواز میں بولے۔

میں حیران حیران سانس کی صورتیں دیکھ رہا تھا اور ان کے مکالمات سن رہا تھا۔ میں تجب میں تھا کہ میں نے تو کسی کو قتل نہیں کیا۔ پھر یہ کیوں کہیں مجھے مورد الزام ٹھہرا رہے ہیں اور خواہ وہ اپنی خیمے گرفتار کر رکھا ہے۔
”عالی جاہو! یہ اس وقت مجھ پر تھا۔“ دوسرا شخص بولا۔
”اور شاہد میں ان کا حکم ہے کہ کسی آدمی کو ہلاک نہ کرے۔“
گزشتہ پچھلے پچھلے جانتے۔

شاہد میں ان کا نام لیتے وقت اس کی گردن جھک گئی تھی اور تمام حاضرین نے بھی اسے سر جھکا لیا تھا۔
”جہاں پناہ کرے۔“ تم جن بجانب ہو اس شخص نے واقعی کیا ہے۔ اسے سزا ضرور ملنی چاہیے۔“ حاضرین

پکڑے۔ ”لازار! زانیہ چاہیے۔“
ایسا کہ ان میں سے ایک کرسی نشین اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دونوں اشخاص سے سوال کیا۔

”کیک آدمی نے زانوئے ہمارے بھائی کو قتل کر سکا ہے؟“
آدمی زانو پڑی کرسی پر تسلیں رکھتا ہے۔ اور اسی لمحہ جہاں پناہ کی سیسے سے ہو کر بیٹھ گئے اور بولے۔ ”ہاں.....“
ہاں..... اس شخص نے پھر ہوا کی نظر نہیں گئی۔ ایک آدمی زانو میں بھلا کر جرات اور طاقت کہاں کہ وہ ہمارے سامنے کیونان سے ملے۔

دوسرا اشخاص میں سے ایک بولا۔
”حضور وہ اس وقت سانپ کی صورت میں تھا اور اس انسان نے اسے آسانی سے ہلاک کر دیا۔“
”لیکن وہ سانپ کی صورت میں کچھ نہیں کیوں کیا تھا؟“ جہاں پناہ کی آنکھیں شعلہ دار ہو گئیں۔
”یہ تو ہم نہیں جانتے کہ وہ کیوں کیا تھا۔“ دونوں کی آواز ڈوب گئی۔

”مقتول کی لاش حاضر کی جائے۔“ حکم دیا گیا۔
اور فوراً ایک ایک طاقت میں ایک مردہ سانپ پیش کر دیا گیا۔ میں متشددہ دیکھ رہا تھا۔ وہی سانپ تھا جسے میں نے آج نماز عصر کے وقت مجھ پر ہلاک کر دیا تھا۔ اب حالہ کچھ میری یاد میں آئے گا۔

وہ سانپ دراصل سانپ نہیں بلکہ جن تھا اور یہ لوگ کسی انسانی نہیں تھے بلکہ جن تھے اور اسے ایک سانپ کو ہلاک کر دینے کے جرم میں مجھے ہلاک کرنا چاہتے تھے۔ میں زندگی میں خدا کے عادی کسی سے خوش نہ رہیں ہوا تھا۔ اس وقت میں میرے ذہن میں یہی بات تھی کہ..... میں نے خواتین اور خواتین کے طور پر مرد کا نکتہ نگاہ کے فرمان کی روشنی میں موزی کو ہلاک کیا تھا۔ مجھ پر کوئی جرم عام نہیں ہوتا..... اور اب ان کی بحث ایک نیا موڑ مڑ چکی تھی۔ سر راہ پر چھ رہا تھا۔

”وہ سانپ بن کر مجھ میں کیوں گیا تھا؟ یہ اس کا بہت بڑا جرم ہے۔ اس آدمی نے زانوئے ہمارے سامنے ہلاک کیا تھا۔“ سر راہ کی بات سن کر مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ میں نے



ناگن کا انتقام

زویب حسن - احمد نگر

رحم! کیا تجھے اس حقیقت پر رحم آیا تھا جب تو نے میرے ناک کو مار دیا اور مجھے بھی زخمی کر دیا تھا۔ وہوشیزہ کے روپ میں ناگن نے کہا اور پھر ساری حویلی چوہدری کی چیخوں سے گونج اٹھی۔

انتقام کا ایک خوفناک اور زہر خیز واقعہ جو پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈال دے گا

پرانے دوتوں کی بات ہے ایک گاؤں کنگن پور تھا جو اپنے نام کی مناسبت سے سدھیا، بہت خوبصورت اور ہر ابھرا تھا۔ اس گاؤں کے ارد گرد پہاڑوں نے اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیے تھے۔ اور پھر اس گاؤں کے ارد گرد ہرے بھرے لہلہاتے گیٹ بھی تھے جو اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے تھے گاؤں کے تمام لوگوں میں بہت محبت تھی جیسے بھر، خشا، اگاس گاؤں کے کسی ایک آدمی کوگی تکلیف ہوتی تو پورا گاؤں اس کی مدد کو جاتا تھا۔ اس گاؤں کے ارد گرد چنگوں میں بہت زیادہ

جنگلے ہوئے ہلال کیا۔
 ”کیا میں کچھ پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں؟“
 سردار بولا۔ ”کوئی کیا پوچھا چاہے ہو۔۔۔؟“
 میں نے پوچھا۔ ”کیا آپ مسلمان ہیں؟“
 سردار نے جواب دیا۔ ”الحمد للہ، ہم سب اسلام کے شیعہ ہیں۔ میں نے کہا۔ ”مگر آپ دین اسلام کے پیروکار ہیں تو میری بات غور سے سمجھئے۔“
 ”میں نے آپ کے ساتھی کو کسی ذلتی دشمن کی بنا پر ہلاک نہیں کیا۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ وہ حقیقت وہیں جو نظر آ رہا ہے تو میں اسے قطعی طور پر جان سے نہ مٹاتا۔ مگر وہ ایک سانپ کی صورت میں قابلِ پوز سانپ انسان کا جالی دشمن ہے۔ ہر مودی کے لئے یہ دردناک حقیقت کا نام بھی ہے۔ میں نے اپنے ایک دشمن کو ہلاک کیا تھا۔ اگر آپ مجھے تصور دے رہے ہیں تو میں ہر قسم کی سزا دے سکتے ہیں۔“
 میں نے دیکھا۔ سردار میری بات نہ کر سوجھ میں پڑ گیا۔ پھر وہ حاضرین سے خطاب ہوا۔
 ”سب بزرگوں کو اکٹھا کیا جائے۔ میں اس سے اس بارے میں مشورہ لیتا چاہتا ہوں۔ کیونکہ معاملہ بڑے نازک منظر پر آ گیا ہے۔“
 ٹھوڑی دیر بعد ہی میدان میں بہت سی کرسیاں اور بچے گئیں۔ اور ہزاروں سفید ریش پوش انسان ان پر براجان ہو گئے۔ جب سب اطمینان سے بیٹھ گئے تو سردار اپنی زندگی رکھ کر اسے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اور اس نے اونچی آواز سے کہا شروع کیا۔
 ”آج آپ کو اس لئے تکلیف دی گئی ہے ایک عجیب مقدمہ پیش ہوا ہے۔ اس آدمی کو لے کر ہمارے ایک ساتھی کو ہلاک کر دیا ہے۔ ہمارے ساتھی اس وقت ایک سانپ کی صورت میں تھا اور بلاوجہ سبھی میں اس کا تھا۔ آدمی زنا کار تھا۔۔۔۔۔۔ وہ فراز پڑھ رہا تھا۔ جب وہ سانپ اس کی ناگوں کے سردیاں آ گیا۔ تم اس بات کی تصدیق کر رہے ہیں کہ آدمی بلاوجہ پکار رہا ہے۔ اس بارے میں صداقت بیان کر کے کہا ہے کہ اگر وہ تصور دیکھا جاتا ہے تو وہ ہر قسم کی سزا دے سکتے کے لئے تیار ہے ہم آپ سب سے پوچھتے ہیں کہ



طلساتی انگوٹھی ایک عظیم تختہ ہے۔ ہم نے سورہ یاسین کے نقش پر فیروزہ، محبت، عیش، مہر، راج، لاجورد، نیلم، زمرہ، یاقوت پتھروں سے تیار کیا ہے۔ انشاء اللہ جو بھی یہ طلساتی انگوٹھی پہنے گا اس کے تمام بھگتے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ ہندو بدھ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو نیکے کے چپے رکھنے سے لاشی کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں قاعدہ ہوگا یا نقصان ملے گا۔ آفسیر اپنی طرف مائل، ناخبرانہ اولاد نیک، میاں کی عدم توجہ، بی بی حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، قلیف یا دکان کا قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، بربق، جسم میں مردود عورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراضی کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگوٹھی کی بدولت ہوگا۔ یاد رکھو سورہ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطہ: صوفی علی مراد
0333-3092826-021-2446647
M-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر
بالمقابل سندھ مدرسہ کراچی

جھ سے باتیں کرنے والی آگئی ہے، اب میرا دل بہل جائے گا۔ یہ ایک نئی نئی پور ہو جاتی ہوں۔ رضیہ بانو نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔
”تمہارے ساتھ کی زبردستی نہیں ہے، نیلم، تم جب جاوے ہو شہر کے پاس دایں بائیں کو اس کے ساتھ گھر جاؤ، پھر یہ تمہاری شادی نہیں اور کرویں گے تاکہ تمہاری زندگی آرام و سکون سے گزرے۔“ چوہدری نے سہماتے ہوئے کہا۔
چوہدری صاحب میں اب نہیں نہیں جاؤں گی، اگر آپ مجھے اس جلی میں ایک کروڑے دیں گے تو میں آپ کی بہن شکر گزار ہوں گی۔“ نیلم نے سہماتے ہوئے کہا۔ ”مفروضہ جب تک جاوے اس جلی میں رہتی ہو۔“ چوہدری نے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔
چوہدری صاحب آپ ہاتھ دھو کر آئیں، میں آپ کے کانا کاتی ہوں اور نیلم کو بھی کپڑے دیتی ہوں۔ تاکہ یہ کپڑے بدل لے۔“ رضیہ بانو نے کہا۔
کچھ دیر بعد بس کانا کے میز پر بیٹھ گئے۔ نیلم نے کپڑوں میں بہت خوبصورت لنگ دیکھی۔ چوہدری کانا کاتے کاتے بار بار سر اٹھا کر نیلم کی طرف دیکھا اور جواب میں نیلم بھی مسکرا دیتی۔
کانا کاتے کے بعد رضیہ بانو نے نیلم کو اس کا کمرہ دکھایا اور خود اپنے کمرے میں آ کر کچھ چوہدری بھی کمرے میں آ کر لیٹ گیا، اوروں نے کی کوٹھن کمرے کے دروازے پر کھینچ کر آئے والی کی کوٹھن جب بھی وہ سونے کی کوٹھن کرتا تو نیلم کا خوبصورت اور گھٹس راسا اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا۔ اور اس کی آنکھوں سے نیند اڑ جاتی۔ اچانک وہ اٹھ کر بیستر پر بیٹھ گیا اور غور سے بیوی کی جانب دیکھا جو کمرے میں نیند میں آسائینا کرنے کے بعد وہ اٹھ کر نیلم کے کمرے میں چلا گیا۔ چوہدری کو دیکھ کر نیلم چونک گئی۔ ”چوہدری صاحب آپ اور اس وقت؟“ نیلم نے حیرانگی سے پوچھا۔
”ہاں نیلم، تم نے مجھ پر نہ جانے کیا جادو کر دیا

”تم یہاں اکیلی بیٹھ کر کیوں رو رہی ہو؟“ چوہدری نے لڑکی سے پوچھا۔
”میرا نام نیلم ہے۔ اور میرا دل دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ رات کے اندھیرے میں میری عزت کے ٹیڑوں نے میرے کمرے پر حملہ کر دیا۔ لیڈی ماں کوٹھن کر دیا۔ اندھیرے میں میں اپنی جان اور عزت بچا کر بھاگ گئی۔ ماں نے میری کھٹی کردی تھی۔ میرا ہونے والا بی بی شراب میں دھت رہنے لگا ہے، دن رات نشے اور شراب پینے کے علاوہ اور اسے کچھ نہیں سوچتا، اس کی خواہش ہے کہ شادی کے بعد میں اس کے اشارے پر چلوں۔ میں وہ مجھ سے برا کام کرانے تاکہ بنا تھا میرا لڑے میری کمائی پر عیش کرتا رہے، اس وجہ سے میں بھاگ آئی ہوں۔ اور میرا اب کوئی شکایت نہیں ہے۔“ ناگن جو نیلم کے روپ میں تھی اس نے جواب دیا۔
”کون کیا ہے کہ تمہارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، میں کلنگ پور گاؤں کا چوہدری حیات خان ہوں، میں تمہیں اپنی حویلی میں رانی بنا کر رکھوں گا، تم میرے ساتھ چلو۔“ چوہدری نے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔
”چوہدری صاحب آپ بہت اچھے ہیں میں آپ کا یہ احسان جیتے جی پوری زندگی نہیں بھولوں گی۔“ نیلم ناگن نے ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔ اور اس طرح ناگن جو نیلم کے روپ میں تھی چوہدری کے ساتھ اس کی حویلی میں آ گئی۔
چوہدری نیلم ناگن کو لے کر حویلی میں آ گیا۔
”چوہدری صاحب آپ کے ساتھ یہ کیوں ہے؟“ چوہدری کی بیوی رضیہ بانو نے حیرانی سے پوچھا۔
”یہ بھاری جھل میں بیٹھی رو رہی کی اس کا دل دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ زمانے کی ستانی ہوئی ہے بہت دکی ہے۔ اس لئے میں اس کو ساتھ لے آیا ہوں آج سے یہ بیٹھیں جو میں سر نہ کی۔“ چوہدری نے کہا۔
”آپ نے بہت اچھا کیا جو اس کو اپنے ساتھ لے آئے جو ابھی کی تھائی تھی ہر وقت کا تھی رو رہی تھی۔ اب

دے دی ہے جو آج سے پہلے کی سانس نہیں دی، ناگن دیتا ہے۔“
”ہاں۔“
”دو جھل کی میری غرض ہے کسی بھی تھوڑی دور جا کر اسے گھوڑوں کی ٹانگوں کی آواز سنائی دی ناگن ایک خوبصورت لڑکی کا روپ دھار کر اسے میں ایک درخت کے پاس بیٹھ گئی۔ اور گھڑ سوار کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔
☆.....☆.....☆
”چوہدری صاحب آپ کی طبیعت دن بدن بگڑتی جا رہی ہے۔ کچھ تو کچھ پانی پئے گا ہوتا جا رہا ہے آپ کو؟“ رضیہ بانو نے چوہدری سے پوچھا۔
”جی نہیں جب سے وہ ناگن نے میری خرابیاں میں آ کر ڈالی ہے تب سے کسی کام میں جی نہیں لگتا، صبح اٹھتے سے بھوک بھی نہیں لگتی تب سے میری طبیعت بھی خراب رہنے لگی ہے۔“ چوہدری نے کھٹے نمائے سلجے میں کہا۔
”آپ شکار پر کیوں نہیں چلے جاتے آپ کا دل بھی بہل جائے گا۔“ رضیہ بانو نے چوہدری سے کہا۔
”تم ٹھیک کہتی ہو شاید اس طرح میری طبیعت کچھ سنبھل جائے۔“ چوہدری نے کہا۔
”جی ہاں۔“
”کہہ کر آپ کا گھوڑا تیار کر دیتی ہوں۔“ رضیہ بانو نے کہا۔ اور پھر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ کچھ دیر بعد چوہدری اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر جنگل کی طرف شکار کی غرض سے نکل گیا۔ وہ اپنے گھوڑے پر بیٹھا اپنی ہی دھن میں جا رہا تھا کہ اسے کی عورت کے رورے کی آواز سنائی دی۔ اس نے اپنے گھوڑے کی رفتار کم کر دی۔ کچھ دور خوبصورت کے نیچے اس کو ایک لڑکی رو رہی ہوئی دکھائی دی۔ چوہدری اس لڑکی کے پاس جا کر کھڑا کیا۔ اتنی خوبصورت لڑکی کو روئے دیکھ کر چوہدری کی نینت میں غور آ گیا۔ ”اس لڑکی کو اپنے ساتھ حویلی میں لے جانا چاہیے۔“ چوہدری نے سوچا۔

ہے کہ میں جب بھی سونے کی کوشش کرتا ہوں تو تمہارا
خوابدہ صورت چہرہ میرے سامنے آ جاتا ہے۔“ چوہدری نے
محبت بھرے لہجے میں کہا۔

”چوہدری صاحب آپ کا گردو جوان جسمانی
انداز شاید میرے دل دماغ پر بھی چھا گیا ہے جس کی وجہ
سے مجھے بھی خیر نکس آ رہی ہے اور میں آپ سے بے یار
کرتے لگی ہوں۔ میں نے جب سے آپ کو دیکھا ہے
مجھے جین نہیں آ رہا دل چاہتا ہے کہ ہر وقت آپ کو
دیکھتی رہوں۔“ ٹیلم نے اچانک کھینک کر تے ہوئے کہا۔

”اہں ٹیلم! شاید میں تم سے بے یار کرتے لگا
ہوں۔ میں نے شاید کتنا چاہا ہے چوہدری نے بے یار
کرتے لگا۔“

”مگر چوہدری صاحب آپ کی ٹیلم کو اگر ہم
دروں کے پیار کے بارے میں پوچھ چل گیا تو وہ طوفان
کھڑا کر دیں گی۔ شاید کرتا تو درو کی بات ہے۔“ ٹیلم نے
سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”اس کا مل بھی نکالنا ہی پڑے گا۔“ چوہدری نے
پکھو سے ہوتے جواب دیا۔

”میں حل نکالیں گے آپ اس مسئلے کا؟“ ٹیلم
پریشانی کی آنکھیں کرتے ہوئے کہا۔

”کیوں نا دروؤں مل کر اسے قتل کریں اور اس
قتل کو سامنے کا روپ دے دیں۔“ چوہدری نے کہا۔

”کیا کہہ رہے ہیں چوہدری صاحب اگر کسی کو
شک ہو گیا تو ہم دروؤں چھانچا کر چھ جائیں گے۔“ ٹیلم
نے جے اہن ہوتے ہوئے کہا۔ میں کل رات گھر سے باہر
رہوں گا اور تم اپنے کمرے میں اکیلے ہو کی اور رضیہ اپنے
کمرے میں اکیلے ہوگی۔ میں نے اپنے دو خاص بندوں
سے بات کر لی ہے، وہ بہت اعتماد والے ہیں۔ وہ چور کن
کرو چلی میں داخل ہوں گے اور الماری سے رضیہ کا زیور
ساتھ لے جائیں گے اور ساتھ ہی رضیہ کا تمام کپڑوں
گے۔ اور اس طرح یہ قتل ہم دروؤں پر نہیں آئے گا۔“
چوہدری نے غصہ سے سوچے ہوئے کہا۔

”اہں چوہدری صاحب یہ ترکیب ٹھیک رہے
چوہدری نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ پھر دروؤں اپنے
اپنے کمرے میں جا چکے۔

”یہ مجھے چنگ پر کس نے باندھ رکھا ہے؟“
چوہدری نے ٹیلم سے پوچھا۔

”میں نے“ ٹیلم نے جواب دیا۔

”مگر کیوں؟“ چوہدری نے گھبراہٹ کے عالم
میں پوچھا۔

”ابھی بتاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر ٹیلم نے آنکھیں بند
کیں اور چوہدری کے بعد وہ تان کے روپ میں چوہدری
حیات خان کے چنگ کے کنارے بیٹھی ہو گئی۔

”تمہیں اتنے ٹیلم نہیں ہو سکتی۔“ چوہدری نے حیرانی
اور گھبراہٹ کے ملے جلے لہجے میں کہا۔

”پکھو میرے بعد تان کو دوبارہ ٹیلم کے روپ میں
آ گئی۔“

”میں ہی تمہاری ٹیلم ہوں۔“ چوہدری حیات۔“
ٹیلم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اور اب میں نہیں نہیں
چھوڑوں گی، شمع کو دیکھیں۔“

”کرمیش! تمہارا کیا رنگا زائے جو تم میری جان
کے روپے ہو گئی ہو۔“ چوہدری نے گھبراہٹ کے عالم
میں کہا۔

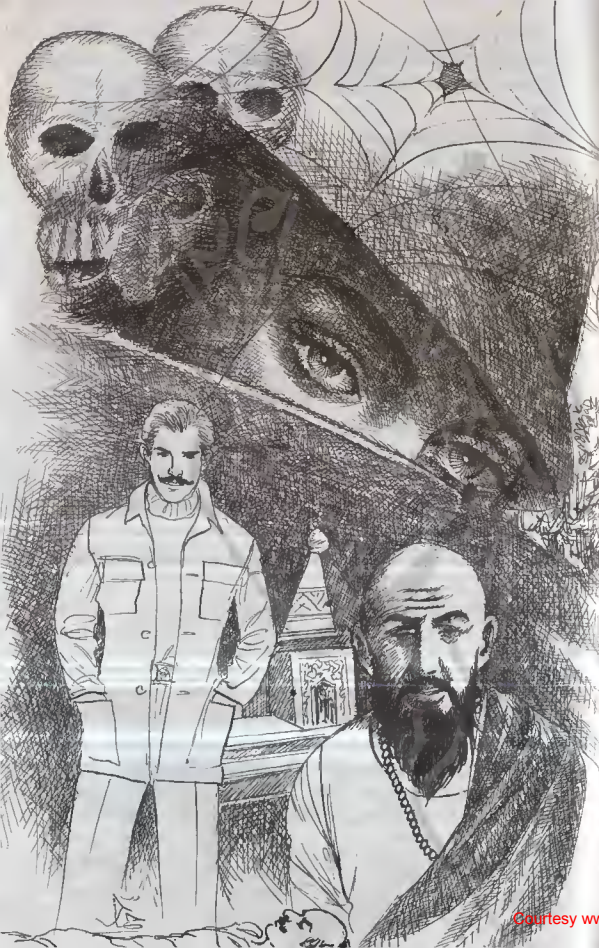
”یا کرم! وہ دن جب تو ڈھکھیلنے کے لئے جنگل میں
گیا تھا۔ باتیں اور وہی کی تھی اور وہی میں اور یہ لاک
ہم، دروؤں بادش میں خوشی سے اچھل کود ہے۔ اسے اور تو نے
بندوق سے میرے ناک پر فائر کیا تو وہ دہیں دو میر ہو گیا
پھر تو نے میرا نشانہ لے کر فائر کیا میری قسمت ابھی بھی
کرمیش بچ گئی۔ دہیں میں نے عہد کر لیا کہ تجھے نہیں
چھوڑوں گی، اب میرے ناک دہیا کے پاس پہنچا، میں نے
اس کی پوچھا تو ناک دہیتا نے مجھے ہتھی چھٹی دی کہ میں
خوابوں میں آ کر تجھے دو اسوں پھر میں نے تجھے خوابوں
میں آ کر ڈرنا شروع کر دیا۔ ناک دہیتا نے مجھے دو سال
بدلنے کی ہتھی اس شر پڑ دینے کا وعدہ کیا کہ میں درو
نکس اس کی پوچھا کروں پھر دو سال تک میں نے ناک دہیتا
کی پوچھا تو ناک دہیتا نے مجھے روپ بدلنے کی ہتھی دے
دی اور میں اپنی چالاکی کی مدد سے تجھے اپنے پیادیں پسنا
کرس جو میں اپنی آنکھ اور پھر میری بیوی کا خون کر دیا۔

قسط نمبر: 85

مگزشتہ قسط کا خلاصہ

[illegible]

دمیٹھ پر بڑا اکڑا تھا بیٹا اور فوراً اس کا ہاتھ اپنے کان پر اس کا پتلیج کیا جہاں کہ تسو کا قہر گرنا تھا۔ اس نے اپنی سیڑھی اٹھائی پانی کھوسو کیا اور پھر اچھے سے دھو لیا۔ ”اس رات سے میرے کان پر جیسے گرم کیا گیا ہے۔“ اس نے کہا۔ اور پھر اس نے اپنے اپنی پیٹ میں لایا۔ ”وہ دن سن رہا ہے اور وہ سن رہا ہے جب وہ دونوں نرناں میں منتقل ہو چکے ہوتے تھے۔“ وہ دونوں الگ الگ کیا کرشٹ میں کھج کے دوتے



دلوں کا ساتھ، کالج کے بعد دلوں اپنے اپنے کیمپارمنٹ میں چلے جاتے اور پھر شام سے پہلے پہلے دلوں اپنی جگہوں سے نکل پڑتے اور پھر پروگرام کے تحت مطلوبہ جگہ پر آن پڑتے۔ زیادہ تر وہ دلوں میر چالنے کی جگہوں پر ملتے تھے۔ دلوں ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھنے کی کئی کھڑکیاں کرتے تھے۔

اور ایسے موقع پر ریشم کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو جایا کرتا تھا۔ ”ماٹھی اب مجھ سے تمہارا دور رہتا برداشت نہیں ہوتا، یہ دوری کی گھڑیاں مجھے بہت اذیت پہنچاتی ہیں۔ کاش ایسے میرے کسی میں ہوتا تو میں نے کراٹیکا جیسا جگہ چلا جاتا مگر وہ دلوں کے علاوہ کوئی اور نہ ہو۔ کان کے وقت اور پھر وہ سے جب تک تم میرے قریب رات ہی ہو خوشی خوشی کٹ جاتا ہے مگر رات کا مے ایسے ہوتا ہے میرے لئے جیسے جہنم میں جلی چلی ہو رہی ہے۔“

یہ سن کر ماٹھی سکرانے لگی اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ہوتی۔ ”ریشم ڈرامہ سے کم لاء، دن اور رات کا زیادہ سے تمہارے ساتھ گزار دینی ہوں۔ تمہارے جیسے جوئے اور بھارت میں سونے کے لئے تھوڑا سا عی تو سہ تم سے دور رہتی ہوں، اور اگر میں اس کی بھی تم سے دور نہ رہوں تو تم ایسا قیام کی ساری حدیں چھلا کر جاؤ، اور یہ اس وقت تک کے لئے بہت ضروری ہے۔ جب تک ہم شادی کے منڈپ میں سات پھیرے نہ لگائیں۔“

”یہ تمہارے سات پھیرے میرے لئے سات جنموں سے بھی بڑھ کر ہو گئے ہیں، میں تو رات بھر بنگلوان سے پرارتنا کرتا ہوں کہ ”بنگلوان جلد از جلد ہماری سن لے اور میرے عیال میں کون خوشی دے یعنی ماٹھی کئی چھوڑ آ رہی ہے۔“ ریشم بولیں۔

”ریشم شادی کرنے کو تو میں لندن میں بھی کر سکتی ہوں مگر تم ذرا ان لوگوں کے متعلق سوچو جو میں یہاں بھیج کر ایک ایک دن کسی بنگلوان سے کراڑتے ہوں گے، ان کے بھی پیسے ہیں ان کی بھی خوشیاں ہیں

کہ میں پڑھ لکھ کر داہن جاؤں اور پھر وہ لوگ میری خوشیوں کو آج کا پانڈ لگ دیں۔ تمہارے انہوں نے بھی ایسا ہی سوچا ہوگا۔

اب دیکھتا ہمارے انہوں کو ہمارے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہوا وہ بھی ہماری خوشی میں خوش ہیں، بس اب آخری سرطلہ رہ گیا ہے، اس کے بعد صبح ہی صبح، ذرا من کو شات رکھو۔“ ماٹھی اکثر ریشم کو ان الفاظ میں سمجھاتی رہتی تھی۔

”ماٹھی ایسا کھچوڑ کہاں جلی گئیں، تم کس جہاں میں کوٹھیں، کچھ تو مجھے بتایا ہوتا، کیا میں تمہارے معیار پر عمل کرتا ہوں؟ کیا میں نے کسی تم سے بے وفائی کی؟ کیا میرے لئے تمہارے دل میں کوئی بدگمانی ہو گئی تھی؟ میں تمہیں کہاں ڈھونڈوں، کس سے تمہارا پیہ معلوم کروں۔ تمہیں احساس نہیں کہ تمہارے بن میرا اپنا جینون کتنا بوجھ بن گیا ہے، ماٹھی تم میرے پاس آ جاؤ، میں دوش آتا ہوں اپنا تاج دلوں کا، میں کیا کروں، میں پرہیز تمہاری یادوں کے سہارے ہی تو می رہا ہوں، اب تو لوگ میری حالت کے پیش نظر مجھ سے بددھارت بن گئے ہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کون کی کو برسے ہوں، میں دور دراز ہوں، اور اگر تک سہارا دیتا ہے کاش!۔۔۔۔۔ اور پھر وہ ہلکے لگا۔

کمرے میں گھانا ٹوپ اندر جیرا تھا کہ کاج کا اس نے کسی کی سکینوں کی آواز سنی تو وہ تڑپ کر اٹھا اور جھٹ سے لائین جلا دی مگر کمرے میں کوئی بھی انسانی وجود موجود نہیں تھا۔ وہ آٹھ گھنٹیں چھانڈ کر چاروں طرف دیکھنے لگا مگر کمرے میں کوئی ہوتا تو اسے نظر آتا۔ اور پھر وہ دھپ سے اپنی چار پائی پر گر پڑا اور اپنا چہرہ نیچے میں چھپا کر ڈھار ڈھار رو روئے لگا۔ وہ کب تک روتا رہا سکتا رہا اسے پس نہ چلا اور جب اس کی آنکھیں کھلیں تو کافی دن چڑھا آٹھ اسی ماٹھی سے بھاری تھی۔

”بنا ریشم! کیا بات ہے آج تو بہت دیر تک سو رہا، میں کی مرتبہ تیرے پاس آئی مگر تو بے سادہ پڑا تھا۔ اب جاکے میں نے تجھے بگایا ہے۔ تیرے باپو بھی

بول کر گئے ہیں کہ ریشم سے دلایا وہ صاحب سے دوڑا لے آئے۔ اب جا کر کتنا دھوکہ، میں ناشتہ تیار کرتی ہوں۔“ اس نے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

”مئی ماں! میں ابھی اٹھتا ہوں، آپ جا سیں، میں ترنت نہاؤ کر آتا ہوں۔“ ریشم نے کہا تو اس کی ماں اس کے پاس سے اٹھ کر چلی گئی۔

ریشم اٹھا اور اپنے کپڑے لے کر گاؤں میں بڑے تالاب کی طرف جانے لگا۔ (گاؤں دیہات میں ویسے بھی لوگ زیادہ تر تالاب، نہریا پھر کوٹیں پر پھرتے ہیں)

تھوڑی دور ہی وہ گیا تھا کہ اسے مندر کے پنڈت جی آتے ہوئے مل گئے۔ پنڈت کو دیکھ کر ریشم نے ہاتھ جوڑ کر نام کیا۔ پنڈت نے بہت شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ بچھرا، پھر پنڈت نے کہا۔ ”ریشم بیٹا! کیا بات ہے تمہاری حالت تاری ہے کہ تم رات میں سوئے نہیں، تمہاری آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ تم اندرونی طور پر کچھ زیادہ ہی بائبل پڑھ رہے گے، گوہر کی سوچ نے تمہیں بائبل کر دیا ہے۔ ایک ہفتہ سے تم مندر میں بھی نہیں آئے، تم کب سے تمہارے ہونے والے حالات کا زیادہ اثر لے رہے ہو، ظالم اور پاپی لوگ بہت بھانک انجام سے دوچار ہوتے ہیں وہ جو دلوں مرے ہیں بہت زیادہ پاپی اور آوارہ تھے، انہوں نے گاؤں والوں کے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ زیادہ تر لوگ ان سے پریشان تھے، ہر وقت نئے میں رہنا ان کا شوق تھا۔ یہاں تک کہ چوڑی چکاری سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ گاؤں کی کئی تاروں کو بے عزت کر دیا تھا چوٹ کھانے پینے پکڑنے سے تھے اس لئے لوگ ان کے معاملے میں خاموش رہتے تھے۔ تو دیکھا ہوا کہ خود بنگلوان کی انہیں ان کی کی سزا دی۔ اور یہ بھی کتنے اچھے کی بات ہے کہ اس جگہ ان کی مرتوی ہوئی جہاں مانا کا مندر ہے۔ مانا میں بھی ایسا نے کو برداشت نہیں کرتی۔ نا مانیت دیا لو ہے۔

ریشم تالاب پر پہنچا، نہایا دھوپا اور پھر داہن آ گیا۔ اس کی ماں نے اسے ناشتہ دیا، ناشتہ کے بعد ماں نے کہا۔ ”کیم صاحب کے پاس چلے جاؤ، تمہارے باپو یی بول کر گئے ہیں کہ ریشم کو بول دینا کیم صاحب کے پاس چلا جائے، انہوں نے کیم صاحب سے بات کر لی ہے۔ چنا اب تم ترنت چلے جاؤ۔“ ماں نے کہا۔

”ٹھیک ہے، ماں، میں جا رہا ہوں۔“ اور ریشم کیم صاحب کے پاس جانے کے لئے کمرے سے نکل پڑا۔ تھوڑی دیر میں ریشم کیم کے پاس پہنچا۔ کیم نے ریشم کی بیٹی دیکھی تو کہا۔ ”ریشم بیٹا تم اندرونی طور پر بہت کمزور ہو رہے ہو، تمہاری بیٹی کی رفتار بہت

ریشم پھر تم مندر میں آ گیا کرو، تمہارے من کو شانتی ملے گی۔“

”پنڈت جی! آپ کی بات ٹھیک ہے، میرا من ہر وقت بائبل پڑھ رہے ہے، آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ماٹھی میری خاطر اس گاؤں میں آئی تھی، وہ مجھے بہت چاہتی تھی اور یہ کس قدر ظلم و زیادتی کی بات ہے کہ وہ یہاں تک اچھی بھلی آئی اور پھر راتوں رات غائب ہو گئی۔ کسی کے متعلق اگر تاگ جائے کہ۔۔۔۔۔ اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”بات تمہاری بھی ٹھیک ہی ہے، اگر کسی کے بارے میں بات پڑے کہ وہ نہیں چلا گیا کسی نے خواہ کر لیا یا پھر اس کے ساتھ کوئی اور حادثہ ہو گیا تو من بائبل نہیں پڑھتا۔ میرا تو مشورہ ہے کہ تم بنگلوان سے پرارتنا کرو، میرا من کہتا ہے کہ کسی نہ کسی روز ماٹھی کے بارے میں معلوم ہو جائے گا، لیکن تم اپنے آپ کو سنبھالو اگر تم ٹھیک ہو گے تو ماٹھی کے لئے پرارتنا بھی تو کر سکو گے۔“ پنڈت نے کہا۔

”ٹھیک ہے پنڈت جی! میں اپنے آپ ٹھیک رکھنے کی کوشش کروں گا، آپ کی باتیں سن کر کوئی چیز میں کل سے مندر میں ضرور آ گیا کروں گا۔“ اور یہ بول کر ریشم آگے کو بڑھ گیا۔

ریشم تالاب پر پہنچا، نہایا دھوپا اور پھر داہن آ گیا۔ اس کی ماں نے اسے ناشتہ دیا، ناشتہ کے بعد ماں نے کہا۔ ”کیم صاحب کے پاس چلے جاؤ، تمہارے باپو یی بول کر گئے ہیں کہ ریشم کو بول دینا کیم صاحب کے پاس چلا جائے، انہوں نے کیم صاحب سے بات کر لی ہے۔ چنا اب تم ترنت چلے جاؤ۔“ ماں نے کہا۔

”ٹھیک ہے، ماں، میں جا رہا ہوں۔“ اور ریشم کیم صاحب کے پاس جانے کے لئے کمرے سے نکل پڑا۔ تھوڑی دیر میں ریشم کیم کے پاس پہنچا۔ کیم نے ریشم کی بیٹی دیکھی تو کہا۔ ”ریشم بیٹا تم اندرونی طور پر بہت کمزور ہو رہے ہو، تمہاری بیٹی کی رفتار بہت

کو چھننا دینی تھی۔ جب بجلی چلتی تو ایسا لگتا کہ اب بجلی
گھر کے پورے گاہڑوں کو جلا کر رکھ کے ذخیرہ میں تبدیل
کر دے گی۔

کمرے میں اس نے دروازے کو بھڑ دیا تھا۔ ایک کالی بلی بہت بڑے جسامت کی اس کے کمرے میں تھی۔ اس بلی کی دو قوں آنکھیں اندھیرے میں کچھ زیادہ

جبکہ ری تھیں۔ اس کی آنکھوں سے نلکی بزرگ کی
 روشنی عجیب پر ہیبت نظر آ کر رہی تھی۔ نلکی کی
 آنکھیں جس طرف کی ہوئیں اس طرف کی جگہ سفید
 روشنی سے چکا چوند ہو جاتی۔ کمرے میں نلکی چاروں
 طرف گھوم گھوم کر نہ جانتے کیا دیکھ رہی تھی۔ جب وہ
 کمرے کے چاروں طرف گھوم پھر کر کھٹکی کی تو نلکی کی
 جارائی کے سامنے بیٹے کرشن کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

میں نے کہا: "اے خداوند! یہ سب کچھ میری طرف سے ہے۔"

ضافہ ہوتا گیا..... پھر کیا تھاپی کی فلک ڈکاف چھین کرے کی درود پوار کو دہلانے لگیں۔

س نے دو سبز چھوٹے گولے دیکھے تو وہ تھرا کر رہ گیا کہ
چانک وہ دونوں سبز گولے غائب ہو گئے مگر بلی کی چیخ
ستور جا رہی تھی۔

پہلے تو ایک لمبی کی چیخ سنائی دیتی رہی اس کے
دھڑک دو۔۔۔ تین۔۔۔ اور مجرب بے شمار بلوں کی دل و

میں در ہوا تھا۔

بھڑا..... بھڑا..... سنیل کی کریماک چھین درودیار کو
دھلانے لگیں۔ گمراہ جلدی سے اس کے کمرے کی
طرف لے کر دروازہ تو اندر سے بند تھا۔

”سنیل دروازہ کھولو.....“ اس کی ماں نے چیخ کر کہا۔ مگر باہر والوں کی آوازیں سنیل تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ پھر اس پر ہی موقوف نہیں رہا۔ اب سارے

گھر کے سارے افراد افراتفری میں حال سے بے حال ہو کر رہ گئے تھے، بلیوں کی اتنی خوفناک چٹخیں اڑا لوگوں نے اب تک اپنی زندگی میں نہیں سنی تھیں۔

سینیل کا کمرہ بدستور بند تھا مگر اور دیگر کمرے کے دروازے کھلے پڑے تھے۔ پورے گھر میں گھپ اندھیرے کا راج تھا۔ اور آوازیں ہر کمرے میں گونج

سنیل کی ماں..... جلدی سے چراغ جلاؤ۔“
سنیل کے باپ نے حج کرکھا۔

”ماچس نہیں مل رہی۔۔۔۔۔ ماچس اپنی جگہ سے
غائب ہے۔۔۔۔۔“ ارے کہیں اور دیکھو۔۔۔۔۔ کچکا جلدی
سے روسوئی میں دیکھو۔۔۔۔۔ ماچس وہاں بھی ہوتی ہے۔۔۔۔۔“

سینیل کی ماں کی مدح اس آواز سنانی دی۔
 ”رسوئی میں بھی ماچس نہیں ہے۔“ سینیل کی
 بہن گنگا جیج کر بولی۔

اب تو گھر میں موجود چھوٹے بچے بھی خوف و ڈر کی وجہ سے دھاڑیں مار مار کر چیخنے چلانے لگے تھے۔

جلدی کرو..... تلسی..... تلسی۔" سکیل کے باپو اپنے

اب تو سارے گھر والے بیچ و پکار کرنے لگے تھے۔ گھر والوں کی ٹلک ٹکاف چچیوں اور بیٹیوں کی سر پر آسمان اٹھاتی خوفناک چچیوں دل کو پھاڑے دے رہی تھیں۔

اپنے کمرے میں مقید سیل کی آواز اب تو گلے میں پسنے لگی تھی۔ اس کی فلک شکاف جھینیں اب دم توڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ”ماں جی..... باپ..... ماں جی.....“

مجھے بچاؤ..... میں مر رہا ہوں..... بابو..... جلدی.....
 بابو..... بابو..... مٹی مجھے ٹوچ رہی ہے..... بابو.....
 بابو..... بابو..... بابو..... مٹی مجھے مارے

”بھو..... بھگ..... بھگوان کرپا کرو.....
بھگوان، ہم پر دیا کرو..... بھگوان ہمیں بچالو..... کالی ماما

ہم مردیا کر دے.....“ اس قسم کی زود دار آوازیں میں کے
 بابو کی تھیں۔

اچانک سیل کے کمرے کا دروازہ دھڑام سے
 کھلا..... اور ایک کبریٰ کی جسامت کی بلی اپنی انگارہ
 برساتی آنکھوں کے ساتھ باہر نکلی..... جسے دیکھ کر

سارے گھر والے لہم کر لڑنے لگے۔ وہ بی گھر والوں کے سامنے بہت زوردار آواز میں غرائی اور پھر گھر والوں نے دیکھا کہ باہر کا دروازہ بھی خود بخود کھل گیا۔ دروازہ

سنیل کی ماں دو ڈکڑوں کی میں گئی اور تختے پر ہاتھ مارا تو اب اس جگہ ماچس موجود تھی۔ سنیل کی ماں

نے جلدی سے رسوئی میں موجود جلتے چراغ کو لے کر

غلط فہمی

باب نے اپنے بیٹے کی جامہ تلاش لی۔ جب سے گریٹ نے، جس اور کی دوست کا نمبر برآمد ہوا۔ باب نے بیٹے کو بہت مارا اور کہا۔ ”مکب سے کر رہے ہو یہ سب کچھ۔“

جیناروتا ہوا یولاء۔ ”ابا جان!!! میں نے آپ کی قمیض پہنی ہے۔“

(راخانہ اقبال - جیلز الوالہ)

سو گیا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر حکیم صاحب بولے۔ ”اسے آرام کرنے دیں۔ جب یہ خود بخود سکر اٹھے گا تو اسے گرم دودھ میں لگی یلدی کے ساتھ چینی ملا کر دودھ پلا دیں۔ میں شام سے پہلے آ کر ایک مرتبہ اور دیکھوں گا اور دوسری دوا بھی دوں گا بھروسہ کی یہ حالت ہوئی کیسے“ حکیم صاحب نے پوچھا۔

سکیل کے باپ بولے۔ ”حکیم صاحب ہماری آنکھ کھلی تو ہم نے دیکھا کہ سکیل کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ یہ اندر سے بند تھا اور ساتھ ہی کمرے سے بے شمار بیلیوں کے چنچنے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ہم کمرے کی طرف بڑھے تو سارے کمروں سے بیلیوں کے چنچنے کی آوازیں آنے لگیں۔ باہر کا دروازہ بھی بند تھا۔ کسی نے باہر کی کنڈی لگادی تھی۔ پورے کمرے میں ناچنے لگ گئیں وہ رے رے کی۔ ہم کمرے نے بہت دروازہ آواز میں بھگوان اور کیا ماما کو پکارا تو ایک بہت بڑی لالی بلی سکیل کے کمرے سے باہر نکلی اور ہم سب پر غرائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے باہر دروازے سے نکل گئی۔ اچھے کی بات یہ تھی کہ اسی وقت باہر نکلتے ہوئے باہر کا دروازہ بھی خود بخود کھل گیا تھا۔ کمرے میں لیاں چلی رہیں اور ساتھ ہی ہم سارے کمرے والے بھی چنچ کر بڑبڑیں کو پکارے رہے، سکیل کی آوازیں

”بیلیوں نے لوجا“ حکیم صاحب اچھے کی حالت میں بڑبڑائے۔ ”تمہارا چل ہوں، دو اور غیرہ لے لوں۔“ وہ جلدی سے کمرے کے اندر چلے گئے اور پھر چند منٹ میں باہر آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں دو اداس کا ایک چھوٹا سا لکڑی کا بسک تھا اور ایک ہاتھ میں روٹی کا ایک بڑل تھا۔

راجھیل کے ساتھ حکیم صاحب چند منٹ میں آ گئے۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تو سکیل کی حالت دیکھ کر ششدر رہ گئے، ان دنوں کے سامنے سے قاصر تھا کہ بلیوں نے اس قدر سکیل کے سارے جسم پر اپنے ناخن مارے ہوں۔ انہوں نے زائد دیکھا تھا۔ بڑے بڑے حادثے ان کے سامنے آئے تھے، وہ زمانہ شام سے ہو رہا تھا کہ ایک بٹے کے کچھ کچھ کھانے آ دی کو بلیوں نے لوجا تھا۔ جبکہ سکیل کی دونوں آنکھیں ٹھیک ٹھاک تھیں۔

بہر حال حکیم صاحب نے اپنا علاج شروع کر دیا۔ غور انہوں نے پانی گرم کر لیا۔ پہلے گرم پانی میں ایک رقیق دوا ڈالی اور پھر اس پانی میں روٹی بھگو کر آہستہ آہستہ سکیل کے ذمہ پرے خون صاف کرنا شروع کیا۔ خون صاف کرنے سے سکیل کسمسا بھی رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ دوا کے لگ رہی ہے۔

سارا خون صاف کرنے کے بعد حکیم صاحب نے ایک گہرا جھپٹا ہم سارے جسم پر لگا دیا۔ یہ کمرے کے بعد انہوں نے ایک لال رنگ کی دوا سکیل کے منہ میں اٹھ لی دی۔ چند ساعت کی گزرے تھے کہ سکیل نے اپنی بھٹی ہوئی آنکھیں کھول دیں۔ اور خوف کھاتے ہوئے لرزہ دے آواز میں بولا۔ ”وہ مجھے مار رہے کی..... وہ مجھے مار رہے کی۔“ اور پھر اس نے پھر کراہنا ہواں سے اپنے گرد کی لوگوں کو دیکھ کر اچھے کی بات کہہ دیا۔

حکیم صاحب نے جھٹ ایک دوسری دوا اس کے منہ میں ڈال دی۔ سکیل سر دوا زیت سے تلفیہ وہ اعلا میں نہتا رہا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں کی پلکیں بند ہوئے لگیں اور وہ بے سدھ ہو کر

”یہ کیسے ہو سکتا ہے.....؟ ہم نے تو کوئی آواز نہیں کی۔ آواز اگر ہم سننے تو ضرور آئے..... اور اس سے پہلے کیا ایسا ہوا ہے۔“

سکیلی اس نے کہا۔ ”اجما ت جلدی سے پانی اور ایک صاف کپڑے آؤ۔ میں کچھ کرتا ہوں۔“ یہ سن کر لگا دوڑتی ہوئی بھی اور سکیل کے کپڑے میں پانی لے کر سکیل کے ساتھ ہی ایک بڑا سا تیل کا گڑھی بھی اٹھا لائی۔ سکیلی داس نے کپڑے کو پانی میں بھگو کر سکیل کے ذمہ سے نکلے خون کا صاف کرنا شروع کر دیا۔ سکیل کے سانس میں ہلکی چل رہی تھیں۔ مگر وہ ابھی بھی بے سدھ ہوش نہ تھا۔

”حکیم صاحب! یہ سب ہوا کیسے؟ سارے جسم پر اسے زخم، ایسا کیا رہا ہے کہ سارے جسم کو لوجا گیا ہے۔“ سکیلی داس نے کہا۔ اسنے شش گاڑوں کی کچھ سے ”اللہ اکبر“ کی آواز سنائی دی۔ اذان خیر ہوئے سکیل کی۔ اذان کی آواز سن کر اس جگہ موجود لوگوں کے جسم میں جیسے جھن کی لہر دوڑ گئی۔ ”صبح ہونے والی ہے۔ اچالا پھیلتے ہی وہ صاحب کو چلا کر لاتے ہیں، وہ سارے جسم پر کوئی مرہم لگا دیں گے اور اسے دوا بھی دیں گے۔“ سکیلی داس نے کہا۔

اور تھوڑی دیر میں صبح کا اچالا آہستہ آہستہ پورے گاؤں پر پھیل گیا۔ سکیل کے باپ نے سکیل کے چھوٹے بھائی راہیل کو ترت حکیم صاحب کی طرف دوڑایا۔ وہ بولے۔ ”حکیم صاحب سے کہنا۔ حکیم صاحب باپ نے جلدی سے بلایا ہے۔ سکیل بھائی کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ سکیل بھائی کو رات سے بیلیوں نے اپنے ناخنوں سے لوجہ ڈالا ہے۔ آپ جلدی سے چلےں اور سکیل مر جائے کہ سکیل اپنے ہوش میں نہیں ہیں، آپ جلدی چلیں۔“ سکیل بھائی کو پانی میں اگر دیر ہوئی تو سکیل بھائی مر جائیں گے، سارے جسم سے خون بہہ رہا ہے، ان کی حالت دیکھی نہیں جا رہی۔ اور سارا حکیم صاحب کے پاس پہنچ گیا۔

باہر کو آئی تو جھٹ سے سارے کمرے والے سکیل کے کمرے کی طرف بڑھے۔ ”کمرے میں سکیل فرش پر پڑا تھا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ وہ اکثر اپنے کمرے میں ٹیکہ مین کر سوا کرتا تھا۔ گھروالوں کی اس نظر پر پڑتے ہی سارے کمرے والے لرزہ کھ گئے۔“

سکیل خون میں لٹ پت تھا۔ اس کے سارے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ بلی نے اس کے ہاتھ پاؤں چہرہ اور جسم کو اپنے ناخنوں سے لوجہ ڈالا تھا۔ زخم بہت کمرے سے ادا ان سے بڑی تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔ سکیل کے باپ دوڑ کر باہر نکلے اور اپنے پڑوسیوں کا دروازہ دھڑ دھڑا دیا۔ بڑی دھواں کی حالت میں باہر نکلے۔ ”شیام بھائی خیریت تو ہے۔“ بڑی نے کہا۔

”ارے سکی..... میرا سکیل مر رہا ہے۔ جلدی چلو..... سکیل کو بچاؤ..... ارے سکی کیا کروں..... میرا سکیل مر چکا ہے گا..... جلدی چلو.....“ اور ان کے ساتھ سارے بڑی دوڑتے ہوئے ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔

سکیل کی حالت بہت ہی ابتر تھی۔ ابھی تک وہ بے ہوش تھا۔ سکیل کو دیکھ کر بڑی قرا کر رہ گئے۔ ان کی آنکھیں جیسے پتھر اکڑ رہی تھیں۔ ان میں خوف سوار ہو گیا تھا۔

”ارے دیکھو..... یہ مر چکا ہے گا..... اب میں کیا کروں..... میری بچی تو ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ بھائی سکی تم ہی کچھ بتاؤ.....“ سکیل کے باپ کھستے ہوئے بولے۔

”شیام بھائی..... یہ سب ہوا کیسے؟“ سکی داس نے پوچھا۔ ”اوسے میں تو تم لوگوں کو آواز دی دیتے دیتے تھک گیا۔ میں تو کھانا کچھ نہ پڑا تھا۔“ سکیل کے باپ نے کہا۔

بھی سوئے، چند نیک اس کا اکیلا سونا میرے خیال میں ٹھیک نہیں، کیونکہ اسی ہی اس کے ذہن پر خوف سوار ہے۔ میں چند نیک سناؤ اسے چپک کر تارہوں کا دروازہ دوں گا۔“

”حکیم صاحب پیوں کا آپ بتادیں۔“ سنیل کے باپ نے پوچھا۔

”آپ دور دوڑ پھوڑ دیں۔“ وہ ستان زنا تھا، ایک روپے میں بیس ہزار آقا تھا۔ سنیل کے باپ نے دو روپے حکیم صاحب کو دیئے۔ روپے کے حکیم صاحب کمرے سے باہر نکل گئے۔ حکیم صاحب نے ایک دوڑی کی کرات میں سوئے وقت میں ضرور کھانا کمرے۔ اور دوڑی کی گھری بند کرنے لگے۔

اور سنیل کے دوست کشیش کو بھی سنیل کے ساتھ چلنے آنے والے حالات کا پتا چل چکا تھا، تمام باتیں سن کر کشیش پر بھی کچھ سوار ہوئی تھی۔ اس نے کمر سے لٹکانا چھوڑ دیا تھا۔ اسے شام ہی کمر میں کس سوجاتا۔ انہیں نہیں بلکہ اس نے تو سنیل سے ملنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو سنیل کے ساتھ میں بھی ان میں سے کسی کی بیٹی کی نظر میں آ جاؤں۔ اس دفعہ سنیل نے کشیش کے پاس خبر بھی بھیجی کہ کشیش میرے پاس آئے مگر کشیش نے بول کر مال دینا کہ ”سنیل سے ملنا میں تہنہ آؤں گا۔“

کشیش کا اب زیادہ تر وقت کالی بات کے مندر میں گزرنے لگا تھا۔ حق بات ہوتے ہی وہ مندر میں بیٹھ جاتا اور انار سے کچے کالی بات کے سامنے بیٹھا رہتا۔ لوگ آتے اور کالی بات کے چروں میں پھول یا پھر دان دھکھتا ڈال کر بیٹھ جاتے مگر کشیش کو کسی کے آنے جانے سے کوئی تعلق نہیں تھی۔ بس وہ انار سے جھکائے بیٹھا رہتا۔ وہ پورے نکل لوگوں کا آ جانا باہر نکل شرم ہو جاتا تو پنڈت کی آواز سنائی دیتی۔ ”کشیش اب گھر چلا جائے۔ آمار کا سے ہے، اب ماما کو بھی آرام چاہئے۔“ جب کشیش نے سنا تو اپنے گھر کی راہ لیتا اور بولتا۔ ”پنڈت جی تمہیں کیوں میرا سکھ شامی سب کچھ پوچھ گیا ہے، ہر وقت میں دل دھڑکا

منٹ اپنی انگلی بغل پر رکھنے کے بعد انہوں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور پھر کس میں سے ایک شربت نکالا اور ایک گلاس منگوا کر اس شربت کو گلاس میں ڈالا اور اسے سنیل کو پلا دیا۔ جب سنیل شربت پی چکا تو حکیم نے کہا۔ ”سنیل بیٹے! تم اب لیو نہیں بلکہ تیکہ کے سہارے بیٹھے رہو۔“

حکیم صاحب کی بات سن کر سنیل تیکہ کے سہارے بیٹھ گیا۔ چند منٹ ہی گزرے تھے کہ سنیل نے ایک بہت لمبا سانس کھینچا۔ حکیم صاحب بدستور اس پر نظر میں جمائے بیٹھے تھے۔ اب سنیل اپنی آنکھیں موندتا رہا۔ اور کھولتا رہا۔ چند بار ایسا کرنے کے بعد اس نے ایک لمبا سانس کھینچا۔

”سنیل بیٹا! طبیعت کسی ہے؟“ حکیم صاحب نے پوچھا۔ ”اور تمہارے ساتھ ایسا کیا ہوا تھا کہ تمہاری ایسی حالت ہوئی چھوٹا ڈاکس کا کا ڈاکو کا سنیل نے کہا۔“

”سنیل اپنی نجف آواز میں بولا۔ ”حکیم صاحب میں گھری بندش تھا کہ چاک کی لمی کے چپٹے پر میری آنکھ کھلی گئی۔ کمرے میں کھپ اندر ہوا تھا، میں نے دیکھا کہ دو دروازے بند کرنے دیکھ کر نظر آ رہے تھے، گھر چاک کی بیٹی کی خرابی سنائی دی وہ اس کے بعد بیٹی کی لڑاؤ سے والی زوردار آواز آئی تھیں۔ آواز میں پھر زور پڑنے لگیں اس کے بعد کہ کئی لمباں ایک ماحول کر چیتھ لگیں۔ آوازیں اپنی زوردار آواز میں کمرے کے دروازے پر آتی تھیں۔ ہند کے ہند کے لیکن پھر بھی آوازیں میرا کان بھانڈنے لگیں۔ پھر ان میں نے مجھ پر حملہ کر دیا، حملہ آواز زور تھا کہ میرے برداشت سے باہر ہو گیا۔ تکلیف اور اذیت میرے برداشت سے باہر ہوئی اور میں چیخنے لگا۔ اندر آتا تھا کہ میں کو کبھی نہیں سکتا تھا اور پھر میں حیران کر کر رہا اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔“

”شیام! اس آج سے سنیل کو اندر میرا کر کے سونے نہیں دینا اور کو کس کرنا کہ اس کے ساتھ کو اور

سارے گاؤں والے مل کر بات کے چروں میں پراعتا کریں ماما نا پکا کر سے گی۔“ پنڈت نے کہا۔

کچھ لوگ گاؤں کی مسجد میں جین نام کے پاس بیٹھ گئے اور بولے۔ ”پیش نام صاحب آپ اللہ سے دعا کریں کہ اب چاک یہ سب کچھ گاؤں میں کیوں ہونے لگا۔ ہمارا گاؤں تو ہمیشہ ہمیش سے سکھ متین کا گہوارہ رہا ہے۔ گاؤں میں ایسی ایسی خوفناک لڑوہ خیر مونی، اور دہات میں خوفناک بلیوں کا حملہ۔۔۔۔۔۔ آپ دعا کریں۔ اللہ کے حضور“

”آپ لوگ گھبرا نہیں۔۔۔۔۔۔ مجھے تو لگتا ہے کہ گاؤں کے کسی فرد سے ضرور کوئی ایسا کتا مرز دوا ہے، یا پھر ضرور کوئی ایسی نافرمانی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے اس وقت سارا گاؤں دہشت زدہ ہے، جبکہ یہ معاملہ ہر کسی کے ساتھ پیش نہیں آ رہا ہے، اللہ بڑھ جاتا ہے، میں دعا کروں گا، آپ لوگ اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ اللہ بڑھ رحمن رحیم اور اپنے بندوں پر فضل کرنے والا ہے۔“

شام پانچ بجے حکیم صاحب سنیل کے گھر آئے۔ دوپہر کے وقت سنیل کو ہوش آ چکا تھا۔ محسوس کرنے لگیں۔ ہر آدمی انہیں سے تھا، کسی کو بھی یقین نہیں آ کر دے، ہاتھ لگایا بھی ہو سکتا ہے اس سے پہلے گاؤں میں کسی بھی ایسا نہ ہوا تھا۔ اور نہ ہی کسی ایسا کتا واقعہ سننے میں آیا تھا۔ پورے گاؤں میں دہشت کی اس سے پہلے گاؤں کے دو بوجوالوں کی دہشت ناک موتیں ہونے لگیں۔ ان کے ذہن میں تازہ ہیں۔ اور اب پھر یہ خوفناک واقعہ لوگ کمرہ کر گئے تھے۔

گاؤں کے زیادہ تر لوگ دوڑ کر مندر میں بیٹھ گئے اور پنڈت کے سامنے دست سوال بٹھائے۔ ”پنڈت جی! گاؤں میں یہ سب کیا ہوا ہے؟ آپ ہی کچھ بتائیں اس سے پہلے تو کسی گاؤں میں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہمارا گاؤں تو سکھ شامی سے بھرا ہوا تھا۔ مگر اب چاک دل دہلا دیا ہے حالات؟۔۔۔۔۔۔“

”بھائیو! مجھے لگتا ہے ضرور کوئی زندگی سٹھن بات ہوئی ہے اور اس کارن کالی ماما نا میں ناراض تھی ہے، سارے گاؤں والے مل کر بات کے چروں میں پراعتا کریں ماما نا پکا کر سے گی۔“ پنڈت نے کہا۔

بھی دور دوڑا اور بھلائی میں مگر کمرے سے باہر کسی کی بھی آواز نہیں گئی۔ یہ سوچ سوچ کر زوردار مرنے پنا جا رہا ہے کہ ایسا کیا تھا، وہ کسی کتنی تھی اور اس کی بی بی ایسا کیوں کیا؟

یہ سن کر حکیم صاحب بولے۔ ”شیام! اس سے تو مجھے کوئی ہوائی پھر لگتا ہے۔ وہ لیو کوئی عام نہیں ہو سکتی۔“ حکیم صاحب کی اس بات کو سن کر اس کی جگہ موجود سارے لوگ سہم کر رہ گئے۔ ”شیام! اس میں چٹا ہوں اور پانچ بجے آ کر دوبارہ دیکھوں گا۔“ یہ بول کر حکیم صاحب پلٹے گئے تو شیام داس نے کہا۔ ”حکیم صاحب کتنے پیسے ہوئے بھائیو۔“

حکیم صاحب بولے۔ ”میں ان کی گزرتی کرو، میں شام میں تادوں گا۔“ اور یہ بول کر حکیم صاحب نے اپنا چھوٹا سا بلی اٹھا دیا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

یہ عجیب و غریب اور خوفناک خبر پورے گاؤں میں جھنگلی کی اس طرح پھیلی گئی۔ گاؤں بھر کے سارے لوگوں کا تانا بانہا ہو گیا۔ جس کو کھینچتا تھا اسے آنے لگا۔ تمام لوگوں کے چروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ہر آدمی انہیں سے تھا، کسی کو بھی یقین نہیں آ کر دے، ہاتھ لگایا بھی ہو سکتا ہے اس سے پہلے گاؤں میں کسی بھی ایسا نہ ہوا تھا۔ اور نہ ہی کسی ایسا کتا واقعہ سننے میں آیا تھا۔ پورے گاؤں میں دہشت کی اس سے پہلے گاؤں کے دو بوجوالوں کی دہشت ناک موتیں ہونے لگیں۔ ان کے ذہن میں تازہ ہیں۔ اور اب پھر یہ خوفناک واقعہ لوگ کمرہ کر گئے تھے۔

گاؤں کے زیادہ تر لوگ دوڑ کر مندر میں بیٹھ گئے اور پنڈت کے سامنے دست سوال بٹھائے۔ ”پنڈت جی! گاؤں میں یہ سب کیا ہوا ہے؟ آپ ہی کچھ بتائیں اس سے پہلے تو کسی گاؤں میں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہمارا گاؤں تو سکھ شامی سے بھرا ہوا تھا۔ مگر اب چاک دل دہلا دیا ہے حالات؟۔۔۔۔۔۔“

ساگر ہوتا ہے جس میں بھی نہیں لگا، ہرے خوف اور دوز
 دیا کی سنے گی، میرے آپے ہارنا کرنا کہنا تھا پر
 دیا کرے، جس میرے جا کل میں کوشتا بی ل جائے، مانا
 جس چیز کے لئے بھی اشارہ کرے گی میں وہ چیز لا کر مانا
 کے چروں میں ڈال دوں گا۔ ہر روز پھنڈت سے اس
 قسم کی باتیں کرتا اور گھر کی راہ لیتا۔

اور سہیل کی زندگی اب جرن بن کر رہی تھی۔ وہ
 چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ وہ اپنے گھر کے
 قریب گھومنے پھرنے کے علاوہ اب دار و دلی جگہ پر
 بھی جانے لگا تھا لیکن ہر وقت سہا ہار ہوتا تھا۔ لیکن
 سب سے بڑی مصیبت اس کے ساتھ ہو گئی تھی کہ
 وہ جب بھی اور جہاں بھی اکیلا ہوتا اور جب و جوار
 میں کوئی اور نہیں ہوتا تو کسی خوشخوار ملی کی بھیاک ٹلک
 شکاف چیخ سنانی دیتی تو وہ اکیل پڑتا اور لرز جاتا۔ وہ
 گھنٹوں دار و خانے میں بیٹھا گھونٹ گھونٹ دار و پیتا
 رہتا، چونکہ دار و خانے میں ہر وقت رش رہتا تھا اس
 وجہ سے وہ اس جگہ بیٹھا رہتا تھا۔ شام کا اندھیرا ہونے
 سے بہت جی پیٹنے لگنے کہ جانا تھا۔ اس کی کوشش
 ہوتی تھی کہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی رہے، اس لئے
 وہ کوشش کرتا کہ کسی کو بھی اپنے ساتھ رکھ لے لیکن کوئی
 کب تک کسی کے ساتھ رہتا ہے، اور جب وہ اکیلا
 ہوتا تو اسے ملی کی چیخ سنانی دیتی۔

حکیم صاحب ہر روز رات کے لئے اسے نیند
 کی دوا دیتے تھے کہ وہ رات میں سوئے سے گہری نیند
 میں پڑے۔ مگر اس کے باوجود بھی وہ اکثر رات میں
 بہت زیادہ ڈر جاتا، اس کی گھٹی گھٹی آواز گھروالوں کو
 سنانی دیتی، اس کی وہ نیند میں چیخ پڑتا، بچاؤ.....
 بچاؤ..... جیسے رادو کے لئے بھی بچے تھے۔ آری
 بچاؤ..... بچاؤ..... سہیل کی آواز میں سن کر بھی
 گھر والے اسے نہیں اٹھاتے کیونکہ وہ گہری نیند میں
 ہوتا، اور حکیم صاحب کا کہنا تھا کہ "چاہے بے چہا بھی
 چیتے اسے مجھوڑ کر اٹھا جائیں، اگر اسے اس حالت

میں مجھوڑ کر اٹھا دیا گیا تو ہو سکتا ہے کہ خوف کی وجہ
 سے اس کا دماغ الٹ جائے۔
 دن بدن اس کی حالت خیر سے خیر ہو رہی تھی۔
 اس کی جسمانی کمزوری صاف نظر آنے لگی تھی۔ اس
 بڑھتی ہوئی کمزوری کے باعث اس کو اس کے باہر کی کسی
 حد پر شہر میں موجود ایک بڑے ڈاکٹر کے پاس بھی لے کر
 جا چکے تھے۔ ڈاکٹر نے انکسٹن لگائے اور اس کی دوا نہیں
 دینی کہ وہ رات اور صبح کے وقت استعمال کرے۔ مگر
 کمزوری بھی کم پڑی تھی سے بڑھ رہی تھی۔ اب زیادہ
 اور تک وہ چل بھی نہیں سکتا تھا۔ زیادہ چلنے سے اس کا
 سانس پھرتے لگتا تھا اور جب سانس پھرتے لگتا تو پھر
 وہ جسم پیٹے میں شرابور ہوجاتا۔ اس کی ماں سے اس کی
 حالت دیکھی نہیں جاتی، ماں اس کی حالت دیکھ کر اندر
 سے ٹوٹ جاتی۔ جوان اولاد کا کم ویسے بھی ماں باپ
 کے لئے بہت بھاری ہوتا ہے۔

"بیٹا! تو کل کھلا کر بتا تو کہ تیرے ساتھ ایسا
 کیوں ہوتا ہے، کیسا دور تیرے دل و دماغ میں سا گیا
 ہے، بیٹا! تم نے بڑے ارمانوں سے تیری پرورش کی
 ہے، چھتیک تو اپنے سن کا نہیں بتائے گا اس وقت بھی
 کیا ہو سکتا ہے، کیونکہ تیرے باپ کی تیرے سن میں ٹھٹکے
 جا رہے ہیں تو نے کسی کی گالی نہیں دی کہ میں بڑا
 بھگت رہا ہے۔" اس کی ماں آئے دن اس طرح کی
 باتیں کرتی۔

لیکن وہ مجبور تھا، اپنی کرنی کی سزا بھگت رہا تھا،
 چند منٹ کی موت بھی پتی نے آج اس کی زندگی کو کرنا تک
 بنادیا تھا۔ وہ اس کرب میں جلا تھا کہ کسی کو بتا بھی نہیں
 سکتا تھا۔ اگر بتا دیتا تو شرمندگی کے ساتھ ساتھ بھائی
 کے چہرے پر رلنا لگا جاتا اور یہی نہیں بلکہ اس کے گھر
 والے کی شرمندگی سے نہیں کہیں بھی نہیں رہا۔
 "ماں" بے تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ میرے
 ساتھ یہ کیا کچھ ہو رہا ہے، بس میں اب زندگی کے دن
 پورے کر رہا ہوں، میری حالت خود ہی مجھ سے باہر
 ہے، کاش! کہ میں سمجھ پاتا۔" سہیل اسی طرح کے

جواب دیتا تو اس کی ہنس سب پڑتی۔

گاؤں والے بھی اس کی بگڑی ہوئی اتر جات
 کر دیکھ کر کسی کو کھڑوڑے وقت کے لئے چند کالک بیٹھ
 دیکھتے چلے پھرنے سے بھی کام ہو گیا تھا۔ طرح طرح
 کی باتیں اور شورے لوگ دیتے مگر وہ سب کی سنتا
 رہتا، اس کے پاس یا پھر اس کے گھر والوں کے پاس
 اس کی پیاری کا کوئی حل نہیں تھا۔ ڈاکٹر، وید، سادھو،
 شریا اور بڑے سے بڑے پندت تک کے پاس اسے
 چلایا گیا مگر وہی ڈھاک کے تھیں بات..... گھٹی جنت
 منتر والا بھی کل کر اس کے بارے میں نہیں بتاتا، ایسا
 لگتا کہ اس کی حالت کی تفصیل بتانے کے لئے ان کی
 زبان اس کا ساتھ نہیں دیتی تھی۔ وہ سب باتیں سنیں
 کی باتیں کر کے ماں لے دیتے۔

رات میں سوئے سے اسے اکیلا نہیں سونے دیا
 جاتا تھا۔ کوئی نہ کوئی اس کے کمرے میں ضرور سوتا تھا۔
 رات بھر کمرے میں چرائے جلا رہتا تھا۔ اندھیرا باہل
 نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ ایک سے مشورہ دیا تھا کہ اس
 کے سر پر ایک چھری رکھ دیا کریں کیونکہ چھری رکھنے
 سے ہوائی چیزیں قریب نہیں آتی ہیں اور اس طرح ہوائی
 چیزوں سے حفاظت دیتی ہے۔ لہذا اس کے سر پر انے
 رات سے ایک چھری ضرور رکھ دینی تھی۔

گاؤں والے آہستہ آہستہ اپنے دل و دماغ سے
 خوف نکال چکے تھے اور دیے بھی کب تک کی غم، کسی
 دکھ کسی اذیت، یا پھر کسی خوف کو دماغ میں رکھا جاتا
 ہے، وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی حالت ٹھیل ہوتی
 چلی جاتی ہے، اب گاؤں کے افراد بے خوف و خطرات
 برات آتے جاتے نظر آنے لگے تھے۔

گرمیوں کا وقت شروع ہو چکا تھا اور گرمیوں
 میں ویسے بھی لوگ زیادہ تر کافی دیر تک جاگتے رہتے
 ہیں۔ پاس بڑوں کے چند کالک اپنے گھر پر آتے تھے
 بیٹے کر اپنا کچھ کچھ کہہ کر مانتے رہتے ہیں اور گاؤں
 دیہات میں تو ایسے بھی لوگ دن بھر رات سخت مزدوری
 کے علاوہ مشقت والا کام زیادہ کرتے ہیں جس میں

کھیتی باڑی یا بل جلاتا، جانوروں کی دیکھ بھال شامل
 ہوتی ہے، شام کا اندھیرا پھیلنے ہی اپنے کام کا ج
 فارغ ہو کر ٹھوڑے وقت کے لئے چند کالک ایک جگہ بیٹھ
 کر بن کر اپنے آپ کو لگا کر لیتے ہیں جبکہ شہروں
 میں بے بات نہیں، شہروں میں چونکہ رات دن کی
 مصروفیات ہوتی ہیں لہذا بڑی اپنے پڑوسی سے بیٹوں
 میں نہیں کھلی ملاقات کرتا ہے۔

رات کا کافی بے بہت چکا تھا۔ کمرے میں
 چراغ بدستور جل رہا تھا۔ سہیل کی چار پائی کے قریب ہی
 دوسری چار پائی پر اس کے باپ کی نیند میں پڑے
 تھے۔ اچانک سہیل کی آنکھ کھلی گئی، اس نے چاروں
 طرف کھنکھ کر کبھت غور سے دیکھا۔

پھر اچانک اس نے اپنا سر اٹھا کر دیکھا اور کچھ
 کے نیچے رکھی ہوئی تیرہ دھار چھری اٹھالی، چھری پر اپنی
 گرفت مضبوط کر لی، ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ اپنے حواس
 میں نہ ہو بلکہ کسی ان دیکھی طاقت کے زیر اثر ہو۔

وہ بہت احتیاط سے اپنی چار پائی پر سے اٹھا اور
 پچتا پچتا کمرے سے نکلنے لگا، خیر وہ اپنے کمرے سے
 باہر نہیں بھی نکل آیا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اپنے
 طرف سے گھر کو دیکھا اور پھر اپنے قدم باہر دروازے کی
 طرف بڑھا دیئے۔ جب وہ دروازے کے قریب پہنچا تو
 دروازہ خود بخود کھلا گیا، دروازے سے وہ باہر نکل
 گیا۔ چھری اس کے ہاتھ میں موجود تھی۔ دروازے سے
 باہر نکلنے ہی دروازہ خود بخود بند ہو گیا اور اندر سے لکڑی
 لٹکنے کی آواز بھی سنائی دی۔

وہ فرانس کی حالت میں چل رہا تھا۔ وہ اپنے ارد
 گرد سے بیگانہ ایک سمت میں آگے ہی آگے بڑھتے
 جا رہا تھا۔ گاؤں میں موجود کی توں نے اسے دیکھا تو وہ
 بھونکنے لگے مگر ہر جگہ اس کی آنکھ سے چنگاریاں کلکل کر
 نکول رہی پڑیں تو کتنے ہیمنڈ "واڈ" "کول" "کول" اس
 کوں لں..... کہے کہ خاموش ایک طرف بیٹھ جاتے۔
 پورے گاؤں میں آج کی رات ایک فرد بھی
 ایسا نہیں تھا کہ کسی کی نظر اس پر پڑتی۔ ہر آدمی اپنے گھر

فقیر

ایک فقیر کسی آدمی سے۔ "تیس روپے اللہ کے نام پر دو۔ چنانچہ ہے۔"
 آدمی۔ "جائے تو پھر وہ روپے کی ہے۔"
 فقیر۔ "معلوم ہے۔ گرل فریض بھی ساتھ ہے۔ اس لئے۔"
 آدمی۔ "فقیروں نے بھی گرل فریض بنالی ہے؟"
 فقیر۔ "نہیں بلکہ گرل فریض نے فقیر بنادیا ہے۔"
 (محمد عثمان علی۔ میاں جنوں)

جمع کئے۔ لوگوں نے پوچھ کر کہا کہ نام پر دان دیا۔ اسے پیسے پیسے ہو گئے کہ وہ کہے کہ بھائے تم کالے بکرے آگئے۔ گاؤں والوں کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔
 گاؤں والوں نے پر وگرام بنایا کہ کل چھڑ پر سوں بکروں کی بیعت دی جائے۔ اور اس بات پر سارے گاؤں والے متفق ہو گئے۔
 دوسرے دن گاؤں میں ایک عمر رسیدہ سادھو مہاراج آگئے وہ گاؤں میں داخل ہوئے تو انہوں نے آواز لگائی شروع کردی۔ "بربادی! اس گاؤں پر میٹھ لڑا رہی ہے، بہت سارے موت کے منہ میں چلے جائیں گے۔ میں تدبیر ہا ہوں، یہاں پر موت نے اپنا ڈیرہ ڈال لیا ہے۔ مرنے والوں کا جنازہ بہت مشکل ہے۔"
 سادھو مہاراج کی بات سن کر گاؤں والے دہشت زدہ ہو گئے، زیادہ تر لوگوں پر لڑوہ طاری ہو گیا، کچھ کمرہ کھٹے، کچھ لوگوں پر پیچھے سے طاری ہو گیا اور کچھ تو ایسے ہو گئے کہ کو تو ان کے جسم سے خون نہ نکلے۔

سادھو مہاراج کو چار بیعت سے ایک جگہ بیٹھایا گیا۔ ان کی آؤ بیعت کی گئی۔ ان کے آگے ہاتھ جوڑے گئے۔ ان کے آگے گاؤں والوں نے اپنے سر لگے اور سادھو مہاراج سے کہا۔ "سادھو مہاراج اس کٹھ کا کوئی تو تباہے ہو گا، آپ برائے مہربانی ہم

ہر حال تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اور اگر سبیل نے خود کشی کر لی تھی تو وہ کسی اور جگہ کی خود کشی کر سکتا تھا حتیٰ کہ وہ گاؤں سے ہٹ کر کیوں آیا؟
 سبیل کے کمر والوں کی حالت جل تریبی چمکی کی طرح تھی، انہیں ہوش آتا۔ پھر وہ پچھا کھا کر پیسے کرتے اور بے ہوش ہو جاتے، گاؤں میں موجود ہر آدمی کٹھ باہر کی غم سے سب کے سر پٹھے ہوئے تھے۔
 دیکھتے ہی گاؤں کے سارے لوگ ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے گاؤں کو تار پھرتے ہیں۔
 سبیل کی لاش کو چار پانی پر ڈال کر گاؤں میں لایا گیا، گاؤں کے سارے لوگ روئے اور بکلتے رہے اور پھر دوپہر کے بعد سبیل کو چپٹے کے خالے گر دیا گیا۔
 ایک بک بکرہ کے درخت کے پاس تین موٹیں ہو چکی تھیں۔ گاؤں والوں نے کسی ایک کے بارے میں بھی پوچس کو اطلاع نہیں دی تھی۔ اس لئے کہ پوچس کا کام سوائے کٹھ شہر اور پوچھ کچھ کے کچھ نہیں ہوتا، چند روز تک گاؤں والوں کو کھانے میں پلانا اور پھر چند باتیں کہہ کر واپس کر دینا یا پھر کٹھ کی بنا پر چھوڑ دینا کہ کچھ کچھ اٹھ لیا، اپنا چہرے سے گاؤں کو دیکھ کر پوچس نے دوری اختیار کر رکھی تھی۔
 (گاؤں کے لوگ اکثر سر جوڑ کر کسی نہ کسی جگہ بیٹھ جاتے اور آہیں میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے دیکھتے انہیں ہر وقت غمزدہ مٹی کی کرنہ جاتے ایک کس پر کچھ وقت آن پڑے اور وہ موت کے منہ میں چلا جاتے۔ یہ بات تو ان کے دماغ میں بیٹھ گئی تھی کہ کوئی کٹھ کی کارن ضرور ہے کہ اس طرح جتنا روپے ہیں اور وہ ایک ایک ہی جگہ پر ان کی موت انہیں کٹھ کر جائے ہے۔ بکرہ بکرہ گاؤں اور پرا نامندر کے پاس۔
 کسی نے یہ بھی کہا کہ "کٹھ ہے ماما ہم گاؤں والوں سے ناراض ہو گئی ہے۔" پھر یہ بات لے لی گئی کہ ماما کے چٹوں میں دو عدد کالے بکروں کی بیعت دی جائے اور ماما سے غلطیوں کی معافی مانگی جائے۔ لہذا گاؤں والوں نے تھوڑے تھوڑے ہندو برادری سے پیسے

تھا۔ سبیل چند سینکڑں میں ساکت ہو گیا۔ اس کا دایاں ہاتھ جس میں چھری تھی وہ سیدھے پہلو کی طرف گر گیا۔ اب بھی چھری اس کے ہاتھ میں ہی موجود تھی۔
 روشن ہیلول ہاتھ حرکت کرتا ہوا مندر میں چلا گیا، پھر چند سینکڑں میں مندر سے نکل کر اس جگہ آجھاں ہائی کو گزرتے میں دایاں ہاتھ۔ پھر وہ ہیلول اس جگہ آہستہ آہستہ زمین کے اندر سوتا ہوا غائب ہو گیا۔ اور اس کے بعد ہر طرف کے درخت پر بیٹھے اونے ایک کیر یہ جگہ ہر ایک ایک طرف کواڑا کواڑا پھرتے ہیں۔
 اور صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے سبیل کے باپ کی اچانک آواز آئی کہ تم انہوں نے دیکھا کہ سبیل کی چار پانی خالی پڑی ہے، وہ بڑا بکرہ کٹھ بیٹھے کھراتے ہوئے سبیل کے سر کو دیکھتے تھے، پھر وہ اپنی چار پانی سے اٹھے اور صحن میں آگئے تو انہوں نے دیکھا کہ باہر کا دروازہ بند تھا۔ کنڈی اندر سے لگی پڑی تھی۔
 سبیل کے باپ کو پہلے تو تشویش ہوئی کہ اتنی جلدی سبیل کہاں جا سکتا ہے پھر انہیں اچانک خیال آیا کہ کیتھوں میں صبح حاجت کے لئے چلا گیا ہوگا، لیکن اندر سے کنڈی لگی پڑی تھی؟ پھر انہوں نے سوچا کہ اس نے اپنی ماں کو اٹھایا ہوگا اور پھر انہوں نے کنڈی لگائی ہوگی۔ (دیکھتے ہی گاؤں وہاں سے درختوں کاؤں میں پروا اچالا پھیلنے سے پہلے کیتھوں میں صبح حاجت کے لئے جاتے ہیں)
 صبح کا اجالا پھیلنے ہی گاؤں کے افراد اپنے کام کا بج کے لئے گاؤں سے باہر جانے لگے۔ جب ایک شخص اس بکرہ کے درخت کے پاس سے گزرنے لگا تو اس کی نظر مرموہ سبیل پر پڑی تو وہ دھل کر کہہ دیا کہ سبیل کی پانی ناگوں سے بھرا ہوا گاؤں میں آیا اور یہ خبر پورے گاؤں میں گرے جے بادلوں کی طرح آفاقا پھیل گئی کہ سبیل نے بکرہ کے درخت کے نیچے کھدائی سے جا کر تیز و مدار چھری سے خود کشی کر لی ہے۔
 چند منٹ بھی نہیں گئے کہ پورا گاؤں اٹھ کر بکرہ کے درخت کے نیچے جمع ہو چکا تھا۔ ہر چوڑا بڑا انگشت

میں جوئے خواب تھا۔ سبیل اپنی حالت سے بالکل بیگانہ، ایک ہی طرف سیدھے میں چلا رہا۔ چلتے چلتے گاؤں کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ وہ جگہ بالکل سناٹا اور پرا نامندر۔
 اس جگہ کا ماما پرا نامندر گپ اندر سے میں بہت ہی مہیب سن چلا کر ہوا مندر سے چند منٹ کے فاصلے پر وہی بکرہ کا درخت تھا جس جگہ پہلے دو شخص مرنے پڑے تھے۔ ایک بکرہ کے درخت پر بکرہ کی داڑھی سے گٹھے پھندا لگ کر ماما تھا۔ دوسرے بکرہ کی ایک کٹھنی اوپر سے ٹوٹ کر گری تھی اور وہ ٹوٹنے والے کے سر پر سے ہوتی ہوئی سینے میں اتر گئی تھی۔
 سبیل بکرہ کے درخت کے پاس پہنچ کر ساکت کھڑا ہو گیا۔ چھری اس کے ہاتھ میں اب بھی موجود تھی۔
 مندر کے پیچھے جہاں کہ ماما کو مار کر ان چاروں نے گڑ گڑا حاکم رو دیا تھا۔ اب جگہ سے ایک روشن ہیلول ہا ہر کواڑا اور پھر ماما سے وہ ہیلول ایک ماما کے مندر کے اندر چلا گیا اور پھر چند منٹ بعد وہ ہیلول مندر سے باہر نکلا اور اس جگہ آ گیا جہاں کہ سبیل بے حس و حرکت خاموش کھڑا تھا۔ پھر وہ ہیلول سبیل کے چاروں طرف چکر لگنے لگا۔ ہیلول نے سبیل کے چاروں طرف چکر لگانے کے بعد سبیل کے سامنے چکر فاصلے پر ایک جگہ ٹھہر گیا۔
 سبیل اور کدو سے بیگانہ خاموشی سے بکرہ کے درخت کی جڑ کے پاس خاموشی سے جت لیت گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ جس میں چھری کی میکانیکی اعجاز میں اوپر کواٹھایا۔ چھری کی دھار کو سیدھی کر کے اپنا ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے کو اپنی گردن کی طرف لائے لگا۔ اپنا ہاتھ اپنے زخموں کے قریب لایا اور پھر ایک جھٹکے سے تیز دھار چھری کو زخموں پر پھیرنے لگا۔ وہ کسان دھکی دھکے دیر تا درگاہ تھا۔
 زخموں کی آواز کے ساتھ ہی زخموں سے خون فوارہ کی طرح ابل پڑا۔ اب اس کا پورا زخموں کٹ چکا

گاؤں والے پر دیا کرتے ہوئے ہمیں اس کشت سے چھٹکارا دلواائیں۔ ہماری تو دن کا چھین اور رات کا سکون برباد ہو کر رہ گیا ہے۔“

”جئے ماتا کی، جئے بھوانی کی، جئے درگا کی۔“
سادھو مہاراج ان تین ناموں کا نعرہ لگا کر بولے۔
”اپائے ہو سکتا ہے اور تم گاؤں والوں کی جان بچ سکتی ہے۔ اس کے لئے تمہیں تین بکرے کالے اور ایک عدد دودھ دینے والی گائے دینی پڑے گی، اور ان جانوروں کو لے کر میں تمہاری جان چھڑوا سکتا ہوں، موت سے، راکھشش موت کو بہت دور بھگا دوں گا، اگر تم لوگوں کو منظور ہے تو حای بھرہ، ورنہ میں اپنے راستے چلا جاؤں گا، اور تم لوگ آئے دن کسی نہ کسی بہانے مرتے رہو گے، جئے بھوانی۔“ سادھو مہاراج نے ایک اور نعرہ لگایا اور مسکرا کر لوگوں کو دیکھنے لگے۔

مہاراج کے آگے فوراً ٹھنڈی لمبی رکھی گئی اور پھر چند لوگوں نے ان کے پاؤں دبائے گئے۔ لوگوں نے کہا کہ مہاراج ہم ابھی مشورہ کر کے آپ کے چٹوں میں آتے ہیں۔“

مہاراج پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئے اور اپنے پاؤں دبوانے لگے۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق لوگوں نے ترنت آپس میں مشورہ کیا اور دھڑا دھڑ پیچ کر نئے شروع کر دیئے۔ تین کالے بکرے تو پہلے ہی ان کے پاس موجود تھے۔ اور ان بکروں کی بھینٹ کالی ماتا کے مندر میں دینی تھی۔ مگر اب ان تینوں بکرے اور ایک گائے دودھ والی سادھو مہاراج کے سامنے پیش کر دی گئی۔ سادھو مہاراج تین کالے بکرے اور ایک ٹھٹھری گائے دیکھ کر مسکرانے لگے اور بولے۔ ”تم لوگ موت سے بچ گئے آج رات میں مندر میں جا پ کروں گا اور کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے موت کے راکھشش کو یہاں سے دور کر دوں گا اور تم لوگ بھی خوشی اپنی زندگی گزارنے لگو گے، گاؤں میں خوشحالی آ جائے گی، تم لوگوں کی فصلیں اہلہانے لگیں گی۔ کھیتوں میں غلے کا ڈیر لگ جائے گا۔ تم لوگوں کی قسمت اچھی

ہے کہ میں اس گاؤں میں آ گیا۔ ورنہ تم لوگوں کا حال آگے اور بہت بُرا ہوتا۔“

بہر حال گاؤں والے بہت خوش تھے کہ سادھو مہاراج موت کو ہمیشہ ہمیش کے لئے اس گاؤں سے بھگادیں گے، ایسی موت جو کہ آئے دن جوانوں کو اپنا نشانہ بنا رہی ہے۔

شام ہو گئی اور پھر شام کے بعد رات کا اندھیرا پورے گاؤں پر چھا گیا۔ سادھو مہاراج کو بھوجن کرایا گیا۔ اور پھر انہیں مندر میں پہنچا دیا گیا۔

سادھو مہاراج کو مندر کے ایک کمرہ میں بستر لگا دیا گیا۔ مندر میں چند ایسے کمرے بھی تھے کہ جن میں دور دراز سے آنے والے سادھوؤں، چنڈتوں اور مہالوں کو ٹھہرایا جاتا تھا۔

سادھو مہاراج کو خوشی مندر کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد اس جگہ موجود سارے لوگ سادھو مہاراج سے آسیر واد لے کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

رات کے دو بجے کے قریب کسی نے جھجھوڑ کر

سادھو مہاراج کو گردن سے پکڑ کر اٹھا دیا۔ پورے کمرے میں چکا چوند و شہنشاہی ہوئی تھی، خوف اور ڈر کی وجہ سے سادھو مہاراج کی کھمبھی بندھ گئی تھی، ڈر کی وجہ سے سادھو مہاراج کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر کو ابل رہی تھیں۔ ان کی آواز ان کے حلق میں انک رہی تھی۔ ”ماتا مجھے معاف کر دو، ماتا میں پاپی ہوں، ماتا میں لوبھی ہوں، ماتا میں نے لالچ میں آ کر تمہارے نام پر لوگوں کو دھوکا دیا، ماتا میں اسی وقت رات کے اندھیرے میں یہ گاؤں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ ماتا مجھ پر دیا کرو، ماتا تم دیا لو اور میں لوبھی پاپی ہوں۔“ تعریف کرتے کرتے سادھو کی آواز گلے میں پھنس رہی تھی۔

کالی ماتا کی گرجدار آواز سنائی دی۔ ”تو بہت بڑا پاپی ہے، تیرا پاپ دیا کے قابل نہیں، تجھ پر کرپا نہیں کر سکتی، تو نے جان بوجھ کر میرے نام پر لوگوں کو دھوکا دینے کا سوچا اور وہ بھی میرے ہی مندر میں عیش و آرام

سے رات گزارنے کے لئے آگیا۔ تجھے ہوتا ہے گاؤں والوں نے وہ تین کالے بکرے میرے چروں میں بیٹھ دینے کے لئے لائے تھے، اسے پانی آگ میں نہ آئی تو ان بکروں اور گائے کو بے کرلا جاتا تو نے بہت برا پیالہ کیا ہے، ناقابل معافی پاپ۔ اور پھر کالی ماما کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل کر سامو کی طرف بڑھیں۔

چنگاریاں کا سامو کے جسم سے ٹکرا تھا کہ سامو بے سندھ ہو کر زمین پر پڑا، پھر سامو کا پورا جود اوپر کوٹھنے لگا اور پھر جسم سامو میں داخل ہو گیا۔ پھر اسی صورت سامو کا جسم باہر ہی منتقل کر کے سے باہر کو ٹھک کر مندر کے سامنے موجود پتیل کے درخت کی طرف بڑھنے لگا۔ اور پھر پتیل کے درخت کے ایک پتے کی کراہ کر کواٹھنا شروع ہو گیا۔ کالی اوپر چب پتے کی کواٹھ جانے لکھر سے ایک مضبوط دی لہوائی ہوئی آئی اور سامو کی گردن میں مضبوطی سے اسی کا ایک سر اپٹ گیا۔ اور اس کا دوسرا سر ایک موٹی ٹہنی میں بندھ گیا۔ ایسا ہوتے ہی سامو کا جود جھوملے لگا کہ چاک سا سامو کی اذیت ناک اور تکناک دل و دماغ کو نافذ کرتی ٹٹک ٹٹک جیچ پوری فضا کو منتشر کر گئی۔

سامو کی موت واضح ہوئی تھی۔ سامو کی جیچ اتنی کرناک اور زوردار تھی کہ مندر اور پتیل کے درخت کے قریب کے گھروں سے ہڑ ہڑا کر لوگ باہر نکھل آئے تو انہوں نے دیکھا کہ پتیل کے درخت پر بھی غامی روشنی چمکی ہوئی تھی اور اس روشنی میں پتیل کے درخت پر سامو کی جھوٹی ہوئی لاش واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ سامو کی جھوٹی ہوئی لاش دیکھ کر لوگ سمجھوت ہو کر رہ گئے، دہشت سے ان پر کچلی طاری ہوئی۔ لوگوں پر اس قدر دہشت سوار ہوئی کہ لوگ ڈر کر اپنے گھروں میں جا کر دیک گئے۔ نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور ہو گئی تھی۔

ساری رات ان لوگوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کافی۔ دن کا سورج طلوع ہوا تو پورے

گاؤں میں کھلم کھلا بچ گیا۔ دہشت اور خوف کی وجہ سے لوگوں کی نگاہیں پتھر آ کر رہ گئی تھیں۔ کسی کے بھی دماغ میں یہ نہیں آسکتے کہ دے رہا تھا کہ بھلا یہ ہوا کیسے ہوا؟ سامو نے ایسا کیوں کیا؟ جبکہ سامو اچھا بھلا اپنے کمرے میں تھا تو اس سے آئینہ ردا لے کر اپنے گھروں کو لوٹے تھے اور پھر عمر رسیدہ سامو اتنی اونچائی پر پہنچا کیسے؟

گاؤں کے دلوں جو ان بڑوں کے مشورے سے بھاک بھاک پولیس کو بلائے گئے تھے قحانے پہنچے اور انہوں نے سامو کی خود کشی کی تھا قحانہ راکر تائی۔ کسی نے پولیس والے اور ایک داروغہ اپنی جیب میں ان دونوں فوجیوں کے ہتھ گڑوں میں آگئے۔

مندر کے پاس جیب روکی گئی۔ اوپر لٹکی ہوئی سامو کی کراہ کر دیکھ کر پولیس والے حیران ہو گئے کہ ایک عمر رسیدہ سامو اسے بڑے اور اونچے درخت پر چڑھا کیسے؟ درخت کی ساخت بتاتی تھی کہ ایک جوان اور مضبوط آدمی کا بھی اس درخت پر چڑھنا بہت مشکل تھا۔ پولیس والے اور گاؤں کے لوگ ابھی سامو کی لاش دیکھ ہی رہے تھے کہ ایک ناک رسی کے ٹوٹنے سے لاش نیچے زمین پر پڑ پڑا۔ لاش کے نیچے گرتے ہی سامو کا سر پھٹ کر سمجھا دیا اور چار ڈال بہت بری حالت ہو گئی تھی اور اسے چہرہ کو دیکھ کر لوگوں پر دہشت سوار ہو گئی۔ لوگوں میں اتنی ہی ہمت تھی کہ وہ سامو کی لاش کو نظر بھر کر دیکھ سکیں۔

داروغہ نے جلدی سے ایک شخص کے گھر سے چادر منگوائی اور جھٹ لاش پر چادر ڈال دی اور اس کے بعد داروغہ نے گاؤں کی ایک نیکل گاڑی میں لاش کو اس پر ڈال کر پوسٹ ڈارم کے لئے بھجوا دیا۔

داروغہ نے چند گھنٹہ کا زور دالی کی، چند لوگوں کی کواٹھ لی اور اوروں کو کہ جب میں بیٹھ کر چلتا ہوں سامو کی لاش دیکھ کر گاؤں والوں کی بہت بری حالت تھی۔ جب تک نہیں لکھا تھا کہ اب ہمارا زور ہوتا مشکل ہے۔ جب سامو مندر میں آئی نہیں پتا تو ہم

کس کیفیت کی موٹی ہیں۔ لوگوں نے مندر کے بعد اپنے اپنے گھروں میں بھگوان نام کا بھجن گائے شروع کر دیئے۔

اب تو لوگ ہر گد کے درخت کی طرف اور پتیل کے درخت کے قریب جانے سے بھی ڈرنے لگے تھے۔ اگر اس طرف کوئی کسی کام سے جاتا بھی تو لایا نہیں جاتا تھا۔ کسی نے کہ ایک ساتھ ان دونوں درختوں کے پاس سے گزرنے لگے تھے۔

تینوں کالے بکرے لاکر مندر میں ماما کے چروں میں لٹی دی گئی اور گاؤں والے ہاتھ جوڑ کر کالی ماما سے براہ رقتا کرنے لگے تھے، ماما ہاتھ گاؤں والوں پر دیا کہ، ماماں غلطیوں کو معاف کر کے کھائیں شیشی دودھ۔ خوف اور ڈر کی وجہ سے مندر میں ماما کے چروں میں دان دھکھنا کا ڈبیر لگنے لگا۔ کھانے پینے کی چیزوں سے لے کر کپڑے لے کر اور پیچھے بھی لوگ ماما کے چروں میں رکھنے لگے تھے۔ سچ شام رات دن ہر کے پیچھے ہی اوقات ملتا وہ مندر میں شیشی دودھ مندر میں بیٹھ کر کالی ماما کے نام کا پالہ پینے لگتے تھے۔

چوتھے دن پوسٹ ڈارم کی رپورٹ آ گئی۔ پوسٹ ڈارم رپورٹ میں لکھا تھا کہ سامو کی موت دہشت خوف اور ڈر کی وجہ سے دل کی حرکت بند ہونے سے ہوئی، اس کے علاوہ کوئی اور کارن موت کا نہیں۔ رپورٹ کو جان کر لوگ اور بھی زیادہ حیرت میں پڑ گئے تھے کہ سامو مہاراج کی جیچ سے رات سے خوفزدہ نہ رہا اور وہ کون سی بلا تھی جس نے سامو مہاراج کو دہشت زدہ کر دیا۔ سامو مہاراج تو بہت پیچھے تھے تھے بھلا کسی سے کیسے ڈر سکتے تھے؟ خیر جتنے ذاتی باتیں، پورا گاؤں حیرت زدہ، خوفزدہ اور بے چارہ تھا کہ اب نہ جانے کیا ہو جائے۔

سامو کی موت نے لوگوں کو اور بھی سہا کر دکھا دیا تھا۔ نجیف دوتاؤں ایک ضعیف آدمی کو پتیل کے درخت پر اوپر چڑھنا۔ یہ بات لوگوں کے دماغ میں باطل بھی نہیں آ رہی تھی اور سونے پر سہا کہ یہ کہ جب پولیس

آگئی تو خود بخود درخت سے ری ٹوٹ کر لاش کا ٹپچہ گرنا، بد دماغ میں آنے والی باتیں نہیں تھیں۔

بڑے بڑے جب ایک کلہر جوڑ کر بیٹھے اور یہ موضوع چھڑ جاتا تو لوگ طرح طرح کے اپنے خیالات کا اظہار کرتے، کوئی بھی کسی اور بات نہیں کہہ پاتا، اور پھر سب سے زیادہ خوف والی بات یہ تھی کہ جو کسی مرثدہ کی نذر کیا ہو جائے ہر گد کے درخت کے پاس ضرور جاتا۔ اب تو کوئی کالی بے خیال نہ ہو گیا تھا کہ نہ نہ ہو ہر گد کے درخت پر کسی بھی ہوئی خونی آتما کا بھیرہ ہو گیا ہے۔

اس بات کو جتنی شکل دیتے وقت یہ بات بھی دماغ میں آ جاتی کہ کالی ماما کا مندر اس جگہ موجود ہے اور ایسا کسی جگہ میں ہو نہیں سکتا کہ دیوی دوتاؤں کے مندر کے پاس کوئی بھی ہوئی آتما بھیرا کر لے اور پھر وہ جہاں کہہ کر گد کے درخت ہو جاتا اور ایسا ہو سکتا تھا کیونکہ اگر ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ بڑے پرانے ہر گد یا پھر بھیرا کے درخت پر کوئی آتما بھیرا کر لیتے ہے۔

اور پھر دوسرا اچھے میں ڈالنے والا واقعہ سامو کی خود کشی پتیل کے درخت پر وہی مندر کے سامنے، جو کہ سامنے مندر تھا اس لئے کوئی آتما اس درخت پر آ نہیں سکتی۔

”تو پھر آخر یہ سب ہے کیا؟“ لوگوں کا دماغ چکر آ کر رہ جاتا۔ بھر حال پورا گاؤں سہا ہوا تھا۔ دن میں دن میں لوگ اپنے سارے کام مٹا لیتے اور سمرے شام ہی اپنے گھروں کے دروازے کے بند کر کے کروں میں دیک کر رہ جاتے۔

پیش کے باپو جی رام پر شاد گاؤں کے کھیا تھے۔ آئے دن گاؤں کے چند افراد ان کے پاس جاتے اور دست سوال بن جاتے۔ ”کھیا اب آپ ہی کچھ کریں، یہ کب تک طے گا اور ایسا کب تک ہوتا رہے گا آپ ہم لوگوں سے زیادہ دیکھی ہیں کوئی اپائے کریں، کسی سانیے یا کسی بچے ہوئے سے رابطہ کریں کہ

گاؤں والوں کی جان جوسوئی پر لگی ہوئی ہے اس سے شافی لے۔

یہ سن کر رام پر شاد ہو بیٹا نے اپنے ماتے پر اپنا ہاتھ بھیرے لگتے اور بولے۔ ”بھائی! اس گاؤں کے سارے لوگ میری نظر میں بدی مان ہیں، میں کسی کو بھی بے عقل نہیں سمجھتا، جنم جنم سے ہم ساتھ رہتے ہوئے آ رہے ہیں، میرے اور آپ لوگوں کے باپ دادا نے کبھی ایسا چٹھنہ نہ دیکھا اور نہ ہی کوئی ایسا خوشی واقعہ ان کے سامنے آیا۔ میری سچی محبت وہ ہیں جس سے، جہاں تک کہ آپ لوگوں کی ہے، میں اس واقعے کا ذکر اپنے کسی جاننے والوں سے کر چکا ہوں اور کہیں یہ دیا ہے کہ اگر ان کی نظر میں کوئی زیادہ بچا ہو مہاراش سے تو ہمارے گاؤں کے لڑکے یا خبر دیں ہم اس کے پاس جا کر پاؤں چڑھائیں گے۔ اس مہاراش کو ہم ہر حال میں اپنے گاؤں میں لے آئیں گے اور پھر وہ یہاں آ کر یہ پتا لگائے کہ گاؤں میں ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

بھائی! اس گاؤں میں ہم جیتے ہوگی بھی رہتے ہیں ہم ایک پر یواری طرح ہیں، ایک دوسرے کا دکھ ہم سب کا دکھ ہے گاؤں کے ہر دکھ تک میں ہم لوگ برابر کے شریک رہتے ہیں، میں نے آج اسے مانا ہے گاؤں میں میرے بچہ جی ہے۔ سنا ہے کہ وہاں مندر میں ایک بھڑت جی ہیں جو کہ علم میں مہمان ہیں، اب ان کی عمر زیادہ ہو چکی ہے۔ مگر میں نے کہا کہ ہم خود ان کے پاس جا سکیں گے اور انہیں خود گاؤں کی یا پھر نکل گاؤں پر لے آئیں گے اور ان سے پتہ چلیگا کہ اسے یہ وہ اسے ہم سے یہ معلوم کریں تاکہ یہ معاملہ کیا ہے؟

اب میں کیا تاؤں ہمارا اپنا بیٹا ہے دوستوں کی موت کو دیکھ کر خوف سے ہم کیا ہے۔ اپنے ہو گیا ہے جیسے کہ کبھوں کا بیان ہو، ہر وقت سنا رہے ہیں کہ اگر کسی وقت اکیلا ہوتا ہوا بھاگ کر اپنی مانی، بھائی بہنوں یا پھر میرے پاس آ جاتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ ”ہا پوئی مجھے اکیلے میں ڈر لگنے لگے، آپ لوگ مجھے اکیلا نہ چھوڑیں نہیں تو وہ داتا مجھے بھی مار دے گی۔ میں کی مر تیاں آتا

کو خواب میں دیکھ چکا ہوں۔ وہ آتا میرے پاس آ کر میرے چاروں اور چکر لگتی ہے اور اس کی آنکھوں سے لال رنگ کی چنگاریاں نکلنے لگتی ہیں۔ اس آواز کے ساتھ لمبے ہو جاتے ہیں اور پھر اس کے ہاتھ کے ناخن بدھ جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں آتما کا رنگ کالا جھپک جھپک ہو جاتا ہے۔ پھر وہ چپے لگتی ہے اور بولتی ہے۔ ”بھل میرے ساتھ، میں تجھے لینے آئی ہوں، آرام سے میرے ساتھ جا چلا، نہیں تو میں تجھے صحت کر لے جاؤں گی۔ ہر حالت میں تجھے میرے ساتھ چلنا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت تجھے نہیں بچا سکتی، مجھ سے۔“

میں کی موت کے بعد وہ اور بھی ڈر گیا ہے۔ اب تو ہوا لگنے لگے کہ اس کا تو ان فانی دنیا کی نہیں۔ میں اسے حکیم صاحب کے پاس لے گیا تھا۔ حکیم صاحب کا کہنا ہے کہ ”بہت تیزی سے اندرونی طور پر کمزور ہوا ہے۔ اب کل ہی کی بات ہے کہ خوف زدہ ہو کر یہ سچی باتیں کرنے لگا۔ میں تو ایسے ہی بہت پریشان ہوں۔ گاؤں والوں کی حالت کو دیکھ کر میں اسے سخت کرنا ہمارے ڈھارس دیتا رہا۔ ”بیٹا تو جان ہے، طاقتور ہے، مرنے والا نہیں کیوں بچوں کی طرح ڈر رہا ہے، مگر وہ مانا نہیں میں نے خصصے سے ایک پھنڈے لارہا۔ اس کے بعد وہ پھل کی طرح دواؤں کا ڈھیر کر دیتا ہے اور بولا۔ ”ابو! میں مری جاؤں گا۔“ کسی صورت بھی وہ آتما مجھے نہیں چھوڑے گی۔ وہ ایک آتما ہے جس نے میرے تخیل و دھنوں اور پھر ماحول ہمارا ان کو لارہا ہے آپ مجھے بچائیں..... مجھے خاص طور سے بات میں بہت ڈر لگتا ہے۔“

بھائی! اب آپ لوگ اندازہ کریں کہ میں کس قدر دھکی ہو گیا ہوں۔ جس کا جان پھر اس حالت کو پہنچ جائے اور وہ خود اپنی موت کے بارے میں بتائے تو اس کے باپ کے دل پر کیا کڑ رکھتی ہے۔ میں تو خود اتنا بے حال ہوں کہ کوئی بھی سے ہزاروں لے لے اور اس بھیا تک حالت سے نکل دلا دے۔“

”کھائی! آپ پر بھگوان دیا کرے اور ہم تمام گاؤں والوں کو سکھ شافی دے۔“ یہ کہتے ہوئے لوگ

واپس آ گئے اور اپنے اپنے گھروں میں بھگوان سے پراختیا کرنے لگے۔

دن وصال گیا۔ شام کے بعد رات آگئی۔ ہر طرف گٹا ٹوپ اندھیرے کا راج ہو گیا۔ رات کا ڈھائی کا ہر تھا کہ اچانک کھائی کے باڑے میں بندھے ہوئے نکل ڈر گئے۔ نکل اس قدر زور مارا دواڑ میں ڈکرا رہے تھے کہ پاؤں پڑوں کے کہی تیندیں سوئے ہوئے لوگ تیندے سے بیدار ہو گئے اور گردنوں میں شمشیر ہو کر ادھر ادھر کھینچنے لگے۔ ”اتنی رات مجھے کیا مٹی کے گٹا گٹا چٹا کر کیوں ڈکرا رہے ہیں۔“ ”قرب و جوار کے لوگوں کے دماغ میں بھی سوال تھا۔

نکل تھے کہ چپ ہوئے کہ نام نہیں لے رہے تھے۔ ان کا ڈکرا نا تھا کہ جیسے انہیں زبردست طور سے تکلیف پہنچ رہی ہو۔ دھتے دھتے سے ایسا بھی لگا کہ جیسے ان کے گلے پر پھری چلائی ماری ہو گیا جی! ابھا گئے ہوئے ہاتھ میں آئے، لائین ان کے ہاتھ میں تھی۔

اس دوران پاس پڑوں کے اور بھی چند لوگ آ گئے اور کھائی کے ساتھ باڑے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ والے والے دو لوگوں کے ہاتھ میں لائین تھی۔ کھائی نے جیسے ہی دروازہ کھولا وہ سب بھاگ کر گر گئے۔ نکل کھونٹے پر مضبوط دسیوں سے بندھے پڑے تھے اور بری طرح جھپکی ناگوں سے اچھل رہے تھے۔ بیلوں کی لہا میں باہر کوئی پڑی تھی اور چاروں نکل ڈکرا رہے تھے۔ لوگوں نے اندازہ لگایا کہ نکل ناقابل برداشت تکلیف سے ڈکرا رہے ہیں۔

ایک بڑی جسامت کی خوشخوار کا لی بیلوں کے سامنے چھوڑے پڑے تھی، ایسا دلخوش منظر جس نے لوگوں کی سلسلہ کڑی تھی، اس منظر کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں پھرا کر رہ گئی تھیں۔ وہ تو بے دل گردہ کے لوگ تھے اور اگر کمزور دل کے مالک ہوتے تو وہ حواس باختہ ہو کر اگلے پاؤں اس جگہ سے بھاگ کھڑے ہوتے۔ ایسا دل دلا دینے والا منظر تھا کہ لوگوں کے دل

دل کر رہ گئے تھے۔ ایسا خوفناک اور بھیا تک منظر انہوں نے اپنی زندگی میں نہ دیکھا تھا اور نہ ہی کسی سے سنا تھا۔

لیلی کی آنکھوں سے سبز رنگ کی چنگاریاں سی روشنی نکل کر بیلوں کی آنکھوں میں پڑی تھی۔ نکل تھے کہ ان چنگاریوں کے آنکھوں میں پڑتے ہی کرب و اذیت سے اچھل رہے تھے۔ نکل میں اتنی ہمت نہیں کھڑی تھی کہ وہ اپنا منہ کسی اور طرف کر لے۔ اکیلا تھا کہ کوئی مرنے کی اندیشی میں رکھا ہے۔ بیلوں کا سر پل کر کر کر بیلوں کی سیدھ میں گر رہا ہو۔ اس جگہ موجود سارے لوگ کھائی کے فراس میں آ کر سہوہر ہو گئے تھے کہ اچانک دل دلا دینے والی بیٹی نکل کاغذ خنوار پر پڑے ہاتھ میں کھینچ لی کہ نکل اب لیلی نے آنے والے لوگوں کو دیکھا تھا۔

اب لیلی کی آنکھوں سے سبز روشنی کی جگہ سرخ رنگ کی چنگاریاں نکلنے لگی تھیں۔ لیلی بدستور خوفناک طرے سے غرائی تھی۔ اس کی جسامت اتنی بڑی تھی کہ وہاں پر موجود لوگوں نے فانی بری لیلی اپنی زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔

چنگا لگائی اور ایک نکل کی مینہ پر جا پھری۔ لیلی کا نکل کی پٹہ پر بیٹھا تھا کہ کرب و اذیت سے دو چار ہو کر نکل چوچھ کر نکل چلا گیا۔ اور پھر بچھا ڈکھائے ہوئے بہت زور سے ڈکرا کھٹکا ہو گیا۔ بانی تینوں نکل جیسے ساکت و جاہد ہو چکے تھے۔ نکل کے ٹپچے کرتے ہی لیلی آنکھوں سے اوچل ہو کر غائب ہو چکی تھی۔

اچانک جیسے کھیا رام پر شاد ہو ش کا جھٹکا اور وہ جھٹ دھڑک کر نکل کے پاس پہنچ کر نکل اپنی زندگی باہر کیے گئے گئے اٹھا تھا۔ اس کے پیچھے اس جگہ موجود لوگ بھی آگے کو بڑھے مگر سب نے نکل کی اثر حالت دیکھ کر کھٹکے میں آ گئے تھے۔ کھائی کی آنکھیں جیسے پتھر لگی تھیں، ان کی نظروں کے سامنے ان کا مینہ نکل مچ رہا تھا۔

سب لوگ ایک دوسرے کو لڑکھڑکاتے رہے تھے،

تعلیمات قرآن

برطانوی رکن اسمبلی مسیو بیرک نے برطانوی پارلیمنٹ میں کہا: ”بے شک تاریخ جن قوانین کو جانتی ہے ان میں سب سے زیادہ حکم، زیادہ قابل فہم اور زیادہ رحم والی تعلیمات قرآن کریم کی ہیں۔“

(The Magnificence of the
Qur'an Page 82)

(ایس حبیب خان - کراچی)

معینیت سے گاؤں والوں کو چھکارا دلوادیں۔ خیر انسان جب سب سے کس ہو جاتا ہے تو وہ اوپر والے کی طرف دیکھا شرع و کردار ہے اور یہی حال گاؤں کے سارے لوگوں کا تھا۔

اب اماں کی رات میں شرع ہو چکی تھی۔ سرشام ہی پرے گاؤں پر محبوب اندھیرا مسلط ہو جاتا تھا۔ چونکہ گاؤں والے بہت زیادہ خوشخود تھے لہذا سرشام ہی اپنے اپنے گھر میں بند ہو جاتے تھے۔

رات دس بجے طحیانی اپنے کمرے بیٹھ گئے تاکہ اگر کچش سوچا ہو تو اسے جگا کر اندر کمرے میں لے آئیں۔ جب وہ بیٹھک میں گئے تو کچش بیٹھک میں موجود نہیں تھا۔ انہیں خوش ہوئی کہ اس وقت کہا جاسکتا ہے؟ اس پر دس میں بھی انہوں نے اسے دیکھا، اب تو ان کا دل دھڑکنے لگا کیونکہ ان دنوں کچش کمرے کے علاوہ کہیں جاتا بھی نہیں تھا۔

وہ اپنے پڑوسی کو ساتھ لے کر باہر نکلے، اس پڑوسی کے ہاتھ میں لائین تھی اور کھاتی کے ہاتھ میں ایک بڑا اور مضبوط لٹھا تھا۔ کیش کے لئے وہ بہت زیادہ پریشان ہو گئے تھے۔ قرب و جوار میں ان دونوں نے سب سے پوچھ لیا کہ کیش کا کہیں بھی نہیں تھا۔ "اب کیا کریں؟ کہاں ڈھونڈیں؟ ہر جگہ تو کھجور لیا۔" اتنی دیر میں حدیثی لوگ کھاسی کے ساتھ ساتھ بھرنے لگے۔

کیا تجھ کو دس دس بیس تین چار بھاگے ہوئے آئے
 نہ کیا تھی کے سامنے کھٹکے ہوئے ہاتھ جوڑ کر ہام کیا
 اور پران میں سے ایک بولا۔ ”بائی باپ خیر تو ہے، آپ
 نے آج صبح ہمیں باجیا۔“

”اگر سے خیر مت نہیں، ہمارا ایک نیک رات
 سے مر گیا، باؤں سے پڑا ہے، اسے اٹھا کر لے جاؤ،
 گاؤں سے باہر جس محل، کمال اتاریا، اور پھر محل کو
 لوگ سے لوگ آگ میں روٹے بانٹ لیں۔ کچھ کو تو چھ
 منٹ میں کھڑا کر دوں گے، چھپ کر جائیں گے، اس کے
 بعد بڑوں کو چنگل میں گڑھا حوکر دبا جائے۔ یہی کام
 ہے۔“ کھائی نے کہا۔

”جی سرکار! جیسا آپ بول رہے ہیں ایسی
 کامیابی ان چیزوں سے لکھا اور محسوس ہوتے ہیں جو
 ایک نیک کامیابی میں ڈال کر جنگی کی طرف لئے گئے۔
 کیا جی تیل کے سرے سے بہت ادا اس سے
 کیا کہ ان پادریوں کی جوڑی بہت زبردستی
 اور وہ تیل سے بھی بہت پیچھے۔ ان کا دل نہیں کھتا کہ
 کامیابی میں، بہر حال زبردستی کے لئے تو کامیابی
 ہے۔ اب یہ کہ وہ لڑنے کی بہت پریشان تھے۔
 سب سے بڑی پریشانی تھی کہ جوڑی کے سرے سے
 دھان کا محسوس ہوتا تھا۔

کھا جی نے اپنے اماکے گاؤں میں موجود مسند
کے چنڈت کی کوئی بھیجی کسی کہ "چنڈت جی آپ تائیں
کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ اور اس سسپا کا حل کیا ہے؟ تو
چنڈت جی نے کہا بیچا تو کہ بہت سمجھ سسپا ہے اور
پاتی آسان بات نہیں، جان بوجھوں کا کام ہے اور آج
کل میں ایک بہت بڑے چاپ میں مصروف ہوئے
میرے پاس وقت نہیں اور ویسے بھی میں کافی بڑھا
ہو چکا ہوں، اب مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ اتنا بڑا کام
کر سکوں، کیا یہ اچھا ہو کہ آپ کسی اور کا انتظام

پنڈت جی کا انکار سن کر کھیاجی بہت افسردہ اور

خونی آتما کس آئی ہے اور طرح طرح سے یہ خونی کھیل کھیل رہی ہے اور اگر اس کا روک تمام نہ کیا گیا تو.....“ اور کھیل چائی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

کھجائی! پھر کیا پائے کیا جائے، ہر اچھے اور برے کا کوئی نہ کوئی تھل ہوتا ہے۔ ”رگھو بولا۔
 ”ہاں! رگھو کو بتا تو ہے مگر جس تیز سی گاؤں کے لوگ مر رہے ہیں، یہ دیکھ کر ہوتا آدمی حال سے بے حال ہو گیا ہے۔“ کھجائی بولے۔

جو بھی حالات و اوقات ہو رہے ہیں وہ نہ
اتفاق کہلا سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی چارو ٹوا ہو سکتا
ہے، چارو ٹوا اس قدر سرچر نہیں ہوتا۔ سراسر کسی
خوفی آواز کا سا رہا ہے۔ ابھی جو کچھ بھی ہوا ہے وہ
میری آنکھوں کے سامنے ہوا ہے۔ وہ کچھ بھی کام نہیں
نہیں کرتی۔ کسی عام ٹپا کی آنکھوں سے سبز اور ایل
ڈیگر ایوں کا لٹکانا اور پھر ایک ایسے کا چھلکا لگا کر
تل کی گیند پیٹنے سے، ایسے کا ٹپکاؤں میں وہی
ہوتا جس سے آنکھوں کا ایک بلک جھٹکتی ہے چھو جھٹکتا
چھوٹا کام اور پھر جیسے ہی اس کا سر جھانپے عام بات
نہیں بلکہ تل کی پٹت سے ہے۔ کئی ایسے کام۔ اور وہاں
جو موجود لوگ رہائش گاہوں پر کھڑے ہیں۔

”جی کیا ہی آپ کی باتیں سو فیصد ٹھیک ہیں۔“ ایک شخص نے کہا۔
 ”صل تو یہی ہو سکتا ہے کہ ہم پورے گاؤں کے لوگ البتہ کے ساتھ ہی آئے ہمارے پاس اور گڑو گڑ کر اپنی طبیعتوں کی صفائی بائیں۔“ چلے جاتے ہیں کہ کچھ لوگ بیسویں دوروں کے، یعنی انہوں نے الٹی روکی تارناری کی۔ دو کی اور سارا گاؤں دھک دھکا رہا ہے۔“ کھابھی نے کہا۔
 اس جگہ موجود سارے لوگ اور کھابھی طرح طرح کی باتیں کرتے رہے اور انہیں سے کہتے نہ چلا اور صبح کا اجالا جاواں اور بچل گیا تو وہ لوگ اپنے اپنے گھر لوٹ کر پہلے گئے تاکہ اپنے اپنے کام کو

کھاجی نے گاڑا، مگر موجود کئی چاروں کو مارا

میں کی ہمت نہیں تھی کہ وہ ایک دوسرے سے پوچھیں
 ”یہ سب کیسے ہو گیا؟“
 ”مزگا!!!“ عیاضی کے منہ سے نکلا۔
 ”مجانا ہم پر کر پکا؟“
 اور ان کا سر کے بلوچے سے جھک گیا۔ ایک شخص نے ان
 کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو جیسے انہیں ہوش آ گیا۔ وہ
 کھڑے ہو گئے اور بے کسی کی حالت میں لوگوں کی
 طرف دیکھا۔ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ
 ہوا کیا۔

خود خواہی کہ کنی اس کی آکھوں سے پہلے
 بزرگ کی چنگاریاں، (آخر رنگ کی چنگاریاں نکلنے
 لگیں، اس کا نکلنے پر چھٹا لاکر پینٹ پر سوار ہونا اس
 کے بعد بوتل کا ڈانڈے کی حالت میں نیچے گرنا اور پھر اُڑا
 سے تیل کا مچا جانا، یہ سب کتنے اجنبی کی بات تھی۔
 بہر حال کھانے کی ایک شخص سے کہا: ”رنگو!
 آتی قہقہے بیبلوں کہ یہاں سے ہمارے دوسری طرف باغ
 دو، میں تو سے تیل اس مردہ بوتل کو دیکھ کر حیرت پریشان
 ہوں گے۔“

رکھو کے ساتھ دھنسل اور بھی لگے اور انہوں نے تینوں بیلیوں کو کھول کر اس جگہ سے تھوڑے سے فاصلے پر دوسری طرف لے جا کر باغ دے دیے۔ اس کے بعد کھیا نی نے ایک چلتی ہوئی لائٹن باز سے میں لٹکادی۔ اور لوگوں سے بولے۔ ”یہاں سے چل کر باہر بیٹھے ہیں۔“

دیکر کل چہ افراد تھے کھیاچی کے علاوہ۔ سب کے سب بازے سے باہر کل کر جا رہا نہیں پر بیٹھ گئے۔ کھیاچی! کیا آپ کی دہی میں کوئی بات آئی ہے کہ یہ سب کیا ہے؟ ہم تو یہ سوچ سوچ کر ہلکان گئے ہیں۔“ ایک شخص بولا۔

میرا دل تو یہ سب سوچ سوچ کر اب سنسان ہے۔
 ہے اندرونی طور پر میں خود کی کچکپانے لگا ہوں، یہ
 میں کر مجھے ڈر لگا رہا بلکہ یہ سوچ کر کے گاؤں والے
 روز ایک نئی مصیبت سے دوچار ہو رہے ہیں۔ میرے
 بارش میں تو بس یہی بات آ رہی ہے کہ گاؤں میں کوئی

تھے وہ سب ملا کر تقریباً پانچ روزہ کے قریب لوگ تھے۔ ان میں سے ایک بولا۔ ”سب جگہ تو دیکھا کیا، کھنہ ہر جگہ کے درخت.....“ اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی کیونکہ سب اس میں ہمت نہیں تھی کہ کوئی بات اپنی زبان سے نکالے۔

ہر جگہ کے درخت کی بات نہ کر لوگوں پر پیسے سکتہ ملاری ہو گیا اور کھیا کی تو ناگھیں سچکھانے لگیں، سارے لوگوں کے دل و دماغ پر خوف ہوا ہو چکا تھا۔ بہر حال ایک شخص بولا۔ ”چلو چلو اس طرف ہی دیکھ لیتے ہیں۔“ ہاں..... ہاں..... چلو..... چل کر دیکھنے میں کیا ہے۔ ”ایک دوسرا بولا۔

گاؤں دیکھنا تھا میں ایک بات ابھی ہے کہ جب لوگ گھر سے رات برات نکلے ہیں تو اپنے ہاتھ میں مضبوطی ضرور رکھتے ہیں۔ اس وقت بھی لوگوں کے پاس ان کے اپنے لٹھے تھے۔ ان لوگوں کے قدم ہر جگہ کے درخت کی جانب اٹھنے لگے۔ چھ لوگوں کے ہاتھوں میں جلتی ہوئی لائٹیں بھی موجود تھیں۔

جب سارے لوگ بھگوان بھگوان کرتے ہوئے پرانے مندر کے قریب ہر جگہ کے درخت کے پاس پہنچے تو سب کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا، گھوڑی دور سے ہی انہوں نے بھانپ لیا تھا کہ کوئی ہے جو ہر جگہ کی جڑ کے پاس ہر جگہ کے درخت سے لپک لگائے بیٹھا ہے کیونکہ بیٹھے والے نے منہ کپڑے بہن رکھے تھے۔

اور جب سارے لوگ بہت قریب گئے تو لوگوں کے جسم میں گھڑن کا خون چھینے لگا ایک ٹنڈ ہو کر رہ گیا۔ ان کی آنکھیں پھڑک رہی تھیں۔ دماغ ناؤٹ ہو گیا، ناگھیں جیسے پکپکاتے لگیں، چند کے پندرہ لوگ سہم کر رہ گئے تھے۔ اسی اثنا میں کوشش کے پتا تو دلش کما کر زمین پر گر گئے تھے۔ کیونکہ انہوں نے کوشش کو پہچان لیا تھا۔ کوشش کا سحر سے آگ ہو کر اس کے قریب ہی پڑا تھا جسے کسی نے سر کو کھڑا کر کے رکھ دیا ہوا اور اس کا دھڑ ہر جگہ کے سنے سے نکلا ہوا تھا۔

اچانک ایک اداویہ کی کپڑا دان لٹا لٹا ہوا درخت

پہرے کسی کی جانب پر واز کر گیا تو لوگ اداویہ کی جیسے چونک کر ہوش میں آ گئے۔

سب کے سب اپنا سر پھڑک کر اڑا دیں بیٹھے گئے اور غور سے کوشش کی کئی ہوئی گردن کو دیکھنے لگے۔ کسی لوگ کوشش کے پتا کی جانب لپک کر دو تھوڑے عرصے پر بیٹھے۔

کسے ہوش پڑے تھے۔ کوشش کی گردن اور دھڑ کو دیکھ کر اداویہ ہوتا تھا کہ کسی دزدی گلابی دوسرے بھارتی گنڈا اسنے کسی مضبوطی آدی نے ایک ہی دھڑ دھڑ اور گردن کو لٹک کر دیا ہوا کوشش کے دھڑ سے نکلے خون کی وجہ سے اس کا سفید جڑوا بالکل سرخ ہو گیا تھا۔

بہت ہی ڈراؤنا اور ہیبت ناک منظر تھا۔ اداویہ کی کپڑے پیچھے نے لوگوں کو اور بھی سہا کر رکھ دیا تھا۔ لوگوں نے نہیں کے پتا کو بہت ہلایا جلا یا۔ گھوڑا اور سناٹا ناک تک بند کر کے تاکہ ہوش آ جائے مگر چند سیکنڈ کے لئے انہیں ہوش آ تا اور پھر سے وہ اندھا دھواں کھینچتے۔

”اب کیا کیا جائے؟ پوری رات تو یہاں نہیں بیٹھا جاسکتا۔“ ایک شخص بولا۔

”بھیا بھیا رات بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن کرا کیا جائے؟“ ایک اور نے کہا۔

”اسے تو بغیر چار پائی کے نہیں لے جاسکتے، چار پائی پر ڈانٹا ضروری ہوگا۔“ ایک اور کی آواز سنائی دی۔

”اب کیا کیا جائے کہ چند لوگ چل کر چار پائی لے آئیں، مگر چار پائی دو چائیں کیونکہ کھیا بھی اپنے ہیروں سے چل کر نہیں جاسکتے، انہیں اسے حواس قابو میں کرنے کے لئے تھوڑا سا لے گا۔“ کھیا کی پڑوسی نے کہا۔

بہر حال سب کی مرضی سے چار افراد اس بجہ سے گاؤں کی طرف چل پڑے، ان کے ہاتھ میں ایک لائٹیں تھیں، اور ان سے کہا گیا تھا کہ ادھیسی پر دو چار لوگوں کو اور بھی لیتے آئیں اور ساتھ میں دو چار پائی ضرور لائیں تاکہ ایک چار پائی پر کوشش کی لاش بھی جائے اور دوسری پڑوسی

کھیا کی کوٹنا گاؤں سے لے جایا جائے۔

ڈراور خوف کی وجہ سے اس جگہ موجود ہر جگہ کے درخت کے نیچے لوگوں کا پتا پائی ہوا چار پائی تھا۔ مگر جب دیکھا جی، وہ لوگ اس حالت میں نہیں اور کھیا کی کوٹنا کر ہماگ نہیں سکتے تھے۔ سارے لوگ کوشش میں تھے کہ کھیا کی کوٹنا آ جائے، مگر آدھا گھنٹہ گزرنے کے ایک باپ کی نظروں سے آئے۔ وہ باپ ہی جان سکا ہے، جو ان لاش کی حالت میں دیکھتا تھا۔

ایک باپ کی نظروں سے آئے۔ وہ باپ ہی جان سکا ہے، جو ان لاش کی حالت میں دیکھتا تھا۔ ایک باپ کی نظروں سے آئے۔ وہ باپ ہی جان سکا ہے، جو ان لاش کی حالت میں دیکھتا تھا۔ ایک باپ کی نظروں سے آئے۔ وہ باپ ہی جان سکا ہے، جو ان لاش کی حالت میں دیکھتا تھا۔

ایک باپ کی نظروں سے آئے۔ وہ باپ ہی جان سکا ہے، جو ان لاش کی حالت میں دیکھتا تھا۔ ایک باپ کی نظروں سے آئے۔ وہ باپ ہی جان سکا ہے، جو ان لاش کی حالت میں دیکھتا تھا۔ ایک باپ کی نظروں سے آئے۔ وہ باپ ہی جان سکا ہے، جو ان لاش کی حالت میں دیکھتا تھا۔

ایک باپ کی نظروں سے آئے۔ وہ باپ ہی جان سکا ہے، جو ان لاش کی حالت میں دیکھتا تھا۔ ایک باپ کی نظروں سے آئے۔ وہ باپ ہی جان سکا ہے، جو ان لاش کی حالت میں دیکھتا تھا۔ ایک باپ کی نظروں سے آئے۔ وہ باپ ہی جان سکا ہے، جو ان لاش کی حالت میں دیکھتا تھا۔

رکھ دیا گیا۔ اور پھر دلوں چار پائی اٹھا کر لوگ گاؤں کی طرف چل پڑے۔ چند منٹ میں سارے لوگ کھیا جی کے گھر کے پاس پہنچے۔

چار پائی نیچے رکھ دی گئی۔ ہمت سے چند لوگ اپنے گھر سے دی آئے جس پر لوگ بیٹھے۔ چند منٹ میں ہی کھیا جی کا انتظام ہو گیا۔ کھیا جی کے گھس جی ایک جگہ ایک میز پر رکھ دی گئیں، کھیا جی کے چہرے پر تھوڑا سا ڈال دیں اور گھنٹا گھنٹا تو کسمار کسمار انہوں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ وہ دھڑک رہے تھے مگر ابھی کئی دھڑکا ہوا ہاتھ تھے۔ دوسرے دھڑکا ہوا اپنی جگہ بیٹھے تھے اور ان کے گھر سے گھر والوں کی درد میں ڈوبی تھیں کر لے کی آواز میں لوگوں کا دل دھڑکا۔

پھر سب کے گاؤں میں کھرام چل گیا۔ اور گھر وار پاس پڑوسی کی غور میں رات سے ہی کھیا جی کے گھر میں آئے لگیں۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کا گھر واروں سے ٹکرایا گیا۔ اور پھر گاؤں کے سارے مرد حضرات آ بیٹھے۔ سب کی آنکھیں ہم کھیا جی کے قوت کو دیکھتی جیسے سلس ہو کر رہ گئی تھیں۔ دوسروں کے قریب لوگ دی پر بیٹھے تھے مگر سب کی زبان گھسی گئی، ہر آدمی اپنی جگہ جیسے بت بنا بیٹھا تھا۔ سب کی گردنیں کھینچ کر پڑوسیوں اور دماغ میں ان کثرت سوالات تھے کہ کسی کے پاس بھی ان سوالات کے جوابات نہیں تھے۔ کہ سب یہ اچانک کیسے اور کیوں ہو گیا؟

مگر اور صدے کی رات دیکھے ہی پھاڑیں جاتی تھیں۔ کسی جگہ کھیا جی اس حالت میں بیٹھے ہوئے لوگ پہلے نہیں کہ گرفت گزارنے میں گرفت ہوتا ہے کہ گزرنے کا نام نہیں لیتا اور اس کے مقابلے میں ناچ گانے اور خوشی کی رات ہلک جھپکے گزرتی ہے۔ لوگوں کو احساس تک نہیں ہوتا کہ رات گزرتی اور اچانک صبح کا سپید ہو گیا تھا۔ جہاں ہم اور صدے ہواں سب کو صرف اور صرف اپنی ذات میں مقیم ہوتے ہیں، ہم کی وجہ سے کوئی کسی سے بات نہیں کرتا، لوگ اپنی اپنی سوچوں میں بے ہوش ہوتے ہیں۔ بہر حال رات ہم کی غور خوشی کی

گزر رہی جاتی ہے۔

رات گزرنی۔ اب تک کھائی کو بالکل ہوش آچکا تھا۔ اسے حواس بحال ہو چکے تھے مگر وہ بالکل چپ تھے جیسے کھرچے بہت ہوں، جس سے بڑا الجھا ہماگ دودھ لگے۔ کسی گمروں سے منافقت جانے بن کر آگئی۔ دل تو کسی کا بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ جانے بچیں مگر دل مار لوگ پائے جانے لگے۔ لاش کی حالت بہت خراب ہونے لگی تھی۔ مارا بدن سیاہ پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ لہذا جلدی جلدی کر کے کاریم گردیا گیا۔ چٹاکے شلے ہلے ہوتے ہی کش کے جاتی کا کیجے جیسے پھینک دیا۔

”لوگو! میرا پیش مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ چڑا میں تیری یادوں کا جو جیسے سنہال پاؤں کا مارے اسی سال تیرا گم ہونا تھا، تو دی بھائی سے میرے دود بازو تھے، تو چلا گیا، اب تو میرا ایک بازو دک گیا، میں تو اب اپنا بوجھ بھی نہیں اٹھا پاؤں گا، بھگوان! تو نے مجھے چھوڑ دیا، ارے کش کے بدلے مجھے اغلیا تے۔“ رام پرشادی زار و مارو نہ لگے تھے، کوئی لکون نے انہیں سہارا دے رکھا تھا۔ چٹاکے شلے خنڈے سے پڑے تو لوگ واپس آ گئے۔

دو ماہ پہلے چٹاکے گاؤں مارچور وکشی خوبصورتی اور جاذب نظر شہس اپنا کافی نہیں رکھتا تھا اور اب پورا مارچور ویران اور اجال نظر آتا تھا۔ چھر نظر اٹھ جاتی عجیب قسم کی ویرانی نظر آتی تھی۔ بڑے اور عمر رسیدہ لوگ تمام خوشی واقعات کو سوچ سوچ کر خون کے آنسو روہتے تھے مگر سب کے سب مجبور ہو چکے تھے کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا، تمام اندازے تمام سوچ، تمام اپائے تمام خوشی بے کار ثابت ہوئی تھیں۔

مرنے والے چاروں دوست چندر، رامو، سنیل اور کش اپنے دوست تھے۔ اکثر خرابی، لوگوں پر حملوں جتنا ان کا شیوہ تھا۔ بڑوں کی عزت کرنا ان کے شریعت میں شامل تھی، وہ بہت زیادہ نہ پھٹ ہو گئے تھے۔ زیادہ دقت شراب کے نشے میں دھت رہتا ان

کا شیوہ تھا۔ گاؤں بھر کی جوان لڑکیاں تو انہیں دیکھ کر لڑیہ ہو جاتی تھیں۔ ہر جوان لڑکی کی کوشش ہوتی تھی کہ ان میں سے کسی کی نظر اس پر نہ پڑے۔

گاؤں میں اس طرح کی کشیں ہو چکے تھے۔ رات کے اندھیرے میں تین لڑکیاں ان کی ہوس کی بیعت چڑھ چکی تھیں۔ اس قسم کے معاملات وہ اندھیری رات میں کرتے تھے۔ اور وہ بھی یہی گاؤں دیہات میں چھوٹی چھوٹی چار دیواریاں ہوتی ہیں۔ جب زیادہ رات بیت جاتی اور لوگ گہری نیند میں شرق ہو جاتے، اس سے وہ لوگوں کے گمروں میں کود جاتے اور لڑکی کا سنبہ کار بھر لے جاتے اور پھر اپنی ہوس پرستی کو عروج پر پہنچا دیتے اور سن مانی کرنے کے بعد لڑکی کا گھونٹ کر مار دیتے، پھر اسے قریب کے جنگل میں گہرا گڑھا حاکموں کی قبر بناتے۔

صبح ہوتے ہی لڑکی کو پورے گاؤں میں موعظا جاتا مگر لڑکی نہ سنی۔ یہی نہیں چوری چکاری بھی ان کا کام تھا، کوئی اور چیز وہ چراتے نہیں تھے سوائے روپے کے، کیونکہ کوئی اور چیز چراتے تو وہ پکڑتے جاتے۔ گاؤں میں جو بھی رات میں ہوتی تھی لوگوں کا شک ان پر جاتا تھا۔ ان پر شک کرنے والے جو لوگ آگے آگے ہوتے تو وہ چاروں ان لوگوں کے ساتھ جس رات کے اندھیرے میں چھپ کر کوئی لکنا کارروائی کر دیتے کہ وہ کاٹوں کو ہاتھ لگے ہوئے اپنی زبان پر لٹا لگ لیتے تھے۔ وہ دشق کے عادی تھے اور بھر پور کوئی جانتا تھا کہ وہ اور ہاش قسم کے جوان تھے۔

لوگوں کے ذہن میں یہ بات بڑ چلا چکی تھی کہ آخر یہ چاروں ہی کیوں کے بعد دیکرے موت کا شکار ہوئے۔ چاروں کی موت الگ الگ طرح سے تھی۔ اور پھر سب سے اہم بات جو لوگوں کو انہیں جیسے ہی ڈانٹتی تھی کہ ان چاروں کی موت کی جگہ کسی ایک ہی تھی۔ پرانا مندر کے قریب بڑے بڑے درخت پر یاد رخت کے پاس۔ لوگوں کو تو یقین تھا کہ وہ جانتا تھا کہ وہ ان چاروں نے کوئی ایسا پاپ ضرور کیا ہوگا جو کہ ناقابل معافی تھا۔

یاد رہا ہے کہ ان کے باپ یاظم کے کڑو توں کا کسی کوظم تھا۔ انہی تک ان چاروں کے علاوہ کوئی اور اس آتما کا شکار نہیں بنا تھا۔ لیکن درمیان میں دو ماسو بھی آگیا تھا جس نے اس آتما سے گریز کی بات کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میں چاہ کر کے اس خوشی آتما سے پورے گاؤں کو کٹی کٹا دوں گا۔ اور اس کا بارود اپنی جان پر ہاتھ بٹھایا تھا، اور نہ کوئی اور کارن تھا کہ اس کے ساتھ ایسا بچھو۔

جس رات کش کی موت واقع ہوئی تھی اور جب لوگ بڑے بڑے درخت کے نیچے بیٹھے تھے تو انہوں نے واضح طور پر دیکھا تھا کہ رات کے اندھیرے میں مندر کے پیچھے دو چھائی چھائیوں کی جگہ سے ایک مردن بیولہ اچا کھنڈا نمودار ہوا، اور پھر وہ چھائیاں ہومندر میں جا گھسا اور پھر توڑی دیں بعد وہ روشن بیولہ مندر سے نکل کر مندر سے باہر چھائیاں رہا۔ دیکھ کر لوگوں کے اوسان گم ہونے لگے تھے۔ ایک تو کش کا کٹا اور پھر اس بیولہ کا نمودار ہو کر مندر میں جانا اور پھر مندر سے نکل کر چند منٹ تک چھائیاں رہنا ضرور کوئی بات تھی۔ اس کے بعد وہ بیولہ دوبارہ مندر کے اندر چلا گیا اور پھر وہ توڑی دیں بعد باہر نکلا، واضح طور پر لوگ دیکھ سکتے تھے کہ وہ بیولہ کسی عورت کا تھا۔

پھر وہ بیولہ اس طرح چھائیاں رہا، جس جگہ اس کے جس طرف سے آتا تھا، اس جگہ جا کر آہستہ آہستہ زمین کے اندر گھٹتا گیا۔

اس کیابھی کسی ہوش و حواس میں تھے اور وہ لیے بھی مرنے والے کے ساتھ گر نہیں جاتا۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب کوئی مرتا ہے تو اس کے قہس اور خوشی رشتے اپنے ہوش و حواس کو پیٹتے ہیں اور جب مرنے والے کو آخری منزل تک پہنچا کر لوگ آتے ہیں تو کافی حد تک حواس باختہ اور غمزدہ لوگوں کو سکون مل جاتا ہے اور پھر اس کے بعد جب وہی اس کے پیٹ میں جاتی ہے تو تقریباً تین حصہ کم ہو جاتا ہے، بعد اسے بھی ہوتا آ رہا ہے اور بھی ہوتا رہے گا۔

کھائی بھی آہستہ آہستہ اپنے کام کاج میں دلچسپی لینے لگے تھے، ہر وقت جاتے سے گاؤں کے چند افراد کھائی کے پاس بیٹھ ہی رہتے تھے۔ اور اور اور اس کی باتیں کر کے کھائی کا دل بھلاتے رہتے تھے۔ ایک دن شام کے بعد جب پاس پڑوں کے لوگ کھائی کے پاس بیٹھے تو ایک ان کے بڑی دھمکائی رات والا دھن دیو یاد آ گیا جس رات کش کا کٹا ہوا تھا۔ دھن دیو سن کے بعد بچھو چھان کر دیکھا کہ اس طرح ایک مردن بیولہ چھائیوں میں نمودار ہوا، اور پھر وہ چھائیاں رہا ماتا کے مندر میں گیا، اس کے بعد پھر وہ بیولہ چھائیوں میں نکلا، پھر وہ بیولہ مندر میں چلا گیا۔ پھر جب وہ بیولہ کا کٹا واضح طور پر نظر آ گیا کہ وہ بیولہ کسی عورت کا تھا۔ پھر وہ چھائیاں رہا اس جگہ جا کر زمین کے اندر آہستہ آہستہ گھٹتا گیا۔

اس بیولہ اور ڈانٹنے والے کو کون کر کھائی جیسے من کو پورے لگے۔ اس وقت کی بھی موجود تھی جنہوں نے دھن دیو کی باتیں کی تھی وہ کوئی ایسا ہوا تھا۔ کھائی بولے۔ ”یہ لے لے گا چھائیوں سے لکنا اور پھر ماتا کے مندر میں جانا، پھر باہر نکل کر چھائیاں رہنا پھر دوبارہ مندر میں جانا اس کے بعد مندر سے نکل کر چھائیوں کی جگہ جا کر زمین میں گھٹنا، اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی سجدہ ماتا کے مندر سے ضرور ہے۔ جبکہ ماکا یا مندر گاؤں کے بیچ میں چکا ہے۔ اس کے قہس یہ ہوگا کہ ماکا اپنے پرانے مندر میں آگیا، آگن جاتی ہے۔ پرانے مندر میں ماکا کی آگن نہیں ہوتا تو وہ بیولہ مندر میں بھی نہ جاتا۔

بھائی! اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ ہم لوگ ماکا کے چڑوں میں اپنا اپنا ماتھائیں تو یقیناً ماتھ پر کپا کرے گی۔

یہ سمجھا بہت سمجھیں گتھی ہے اس نے میرے لما کے گاؤں کے چڈت بی نے یہ بول کر جان چھڑائی کہ یہ میرے بس سے باہر ہے اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ وہ چڈت بی بہت مہمان ہیں، دیوی دیوتاؤں سے ان کے



دولہا دہن

ذیشان اقبال عظمیٰ - کراچی

مردے کو دفنانا لوگ قبرستان سے باہر نکلنے نہ ہاتھ تھکے
اچانک ایک لڑوہ خیر چیخ سنائی دی، لوگوں نے مڑ کر جب اس
جانب دیکھا تو ایک شخص زمین پر گرا تڑپ رہا تھا وہ منظر بہت
دلخراش تھا..... اور پھر بھگدڑ مچ گئی۔

عشق و محبت اور محبت و عشق کی لازوال کہانی مرنے کے بعد بھی دلوں کا ساتھ نہ چھوڑے

9۔ سہ پہر تین بجے کا وقت تھا جب فرین
راولپنڈی اسٹیشن پر گئی۔ سہ فرین سے باہر آیا تو سروسے
پر تک کرادری میں اس کا ہوا تھا۔ جس اس کی بھی کراہے
کی کیا رشت میں جک نہ ملنے کے باعث مجبوراً مجھے
اکاٹوی در سے میں سفر کرنا پڑا تھا کراچی سے راولپنڈی
تک مختلف گاؤں، قصبوں اور دیگیتانوں سے گزرتے
ہوئے دھول ٹی میر سے کپڑوں اور جسم کے میاں محسوس

رابطے رہتے ہیں۔ اور دیوی دیوتا ان کی بات ماننے
ہیں۔ اور یہ تو ہمیں ملنا کہ جو کچھ ہمارے گاؤں میں
ہو رہا ہے، اس کی خبر دیوی دیوتا یا پھر کالی مانا کو نہ ہو۔
کالی اتنا پروقت اپنے ہتھکڑوں پر نظر رکھتی ہے اور ان کی
حفاظت بھی کرتی ہے۔

میں نے تو یہ سوچا ہے کہ آنے والی پورن مافی کو
مانا کا بہت بڑا پوجا کیا جائے۔ اور ساتھ ہی سات
کالے بکروں کی ہیمنٹ بھی دی جائے، مانا کو خوش
کر کے یہ ہم گاؤں والے کو شادی میں رو سکتے ہیں۔
میں مانا ہوں کہ کیشن ابھی سوچ کا نہیں رہا تھا
اور اس کی سنگت بھی اپنے لوگوں سے بھی جو کہ بھگوان
کے احکام ماننے والے نہیں تھے، آپ لوگ جتنی طور پر
پورن مافی کے پوجا کے لئے تیار ہو جاؤ اور یہ باتیں باہمی
لوگوں کو بھی بتا دیا اور ان سے کہنا کہ زیادہ سے زیادہ تم
اپنے حصے کے جمع کرواؤ۔“

اور یہ خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی کہ آنے والی
پورن مافی کی رات مانا کا بڑا پوجا ہوگا اور سات بکروں
کی ہیمنٹ دی جائے گی، لوگ دھڑا دھڑا کھانسی
پاس پہنچنے کرانے لگے اور بھڑکیں بھی دیکھنے آنے
والے ہیں میں نہ بیجا غلطیوں ہوا۔

ایک دن..... دو دن..... اور پھر اس طرح کر کے
پورن مافی کی رات آگئی۔ سارے انتظامات مکمل تھے۔
سات بکروں کی ہیمنٹ دی گئی۔ طرح طرح کے لوازمات
اور پھول پر شاہ مانا کے چروں میں رکھے گئے۔

پوجا کے دن ایسا ہوتا ہے کہ پنڈت جو کہ دیوی
دیوتا کا بہت بڑا بھکت ہوتا ہے۔ وہ اس دیوی یا دیوتا
کے نام کا اشوک پڑھتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اشوک
پڑھنے والے پر اس دیوی یا دیوتا کی حاضری آ جاتی ہے،
جس کے لئے وہ اشوک پڑھ رہا ہے۔ پھر وہ دیوتا یا
دیوی اشوک پڑھنے والے کی زبان میں بات کرتی ہے
اور اس بات یا مسئلے کے لئے دیوی دیوتا کی حاضری کی
جاتی ہے وہ مسئلہ ان کی زبانی سامنے آتا ہے۔

بہر حال وقت مقررہ پر گاؤں کے سارے لوگ
(جاری ہے)

مصروری میرا شوق تھا اور کراچی میں اس حوالے سے میرا بھی ایک چھوٹا مونا تھا۔ چھوڑ دینے پہلے آئرش کنٹریل کے زیرِ اہتمام ہونے والی ایک تصویریں نمائش میں میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی جو عالمی مصروری ادارے کے اعزازی ممبر تھے۔ انہوں نے میرے کام کو سراہا اور مجھے اسلام آباد آکر اس عالمی تصویریں نمائش میں شامل ہونے کی دعوت دی۔

ان صاحب کا نام تیور اور تھا۔ کزنش میں سالوں سے کینڈا میں مقیم تھے لیکن کچھ ماہ پہلے مرن کی یاد شدت سے ستا رہی تھی پاکستان واپس آ گئے۔ یہی طور پر ایک برادر اور بھی پہنچی خیمیت کے مالک تھے۔ کچھ سوچ بچار کے بعد جس نے ہائی بمری لے لی۔ انہوں نے فرمائش کی کہ فریخ اور دیگر تعلقات تانے بونے زادانی کرائی کہ انہی تعداد پر کے مرنے فرمائش سے چار روپے پہلے ہی جمع کرا دوں ورنہ بعد میں مرنے قبول نہیں کئے جائیں گے۔ پہلے وقت مجھے یاد آیا کہ میرے ایک دور کے ملاقات دار اور اونٹنی میں ہمیں ہمیں۔ میں نے سوچا چلو ان سے رشادت بھی ہو جائے گی اور ہائش کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

جب میں نے انہیں فون کر کے اپنے آنے کی اطلاع دی تو وہ بہت خوش ہوئے اور اپنا بیٹا اور دیگر تفصیلات مجھے بتا دیں اور بلور خاص تاکید کی کہ میں ہوٹل میں نہ بھولوں۔ سو اسی وقت میری کسی راہپنڈی کی مختلف سڑکوں سے گزرتی ہوئی اقبال روڈ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ راہپنڈی آنے کا یہ پہلا اتفاق تھا اس لئے میں دیکھی سے ہاؤس کے معاملہ دیکھنے میں مصروف تھا۔

میں نے مختلف سڑکوں سے گزرتے ہوئے راہپنڈی کے مقامات پر غلط سے گزرتے ہوئے دیکھا۔

”اور کتنی دور جانا ہے بھئی؟“ میں نے سفر کی طوالت سے اکتا کر پوچھا۔

”بس تھوڑی دور اور جانا ہے باڈ۔ آپ نے پتہ بھی تو کلکشن آباد کا دیا ہے۔ پنڈی کے کونے میں ہے کلکشن آباد۔“

[illegible]

”میں تو بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔
 ماشاء اللہ محنت ہو گئی ہو۔“ انہوں نے مجھ سے بغلیں
 ہوتے ہوئے کہا۔

”جی بس ٹرین قین گھنٹہ دیر سے پہنچی۔ پھر اسٹیشن سے یہاں تک کا فاصلہ کافی تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”تم اندر چلو۔ میں تمہارا سامان اتروانا ہوں۔“ انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”اُدھر شیرے! جلدی باہر آکر ٹھیکسی سے سامان اترو۔ اور ٹھیکسی والے کو کسی پانی پوچھ۔“ انہوں نے دروازے کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔ میں ڈرائیور کو پیسہ دینے کے لئے جیب کی طرف ہاتھ بڑھاتا تو انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

”بس بس۔ اب تم کھرچنے کے ہوتے ہو تو اب سے
سارے معاملات ہمارے ذمے ہیں۔ تم اندر جاؤ“
انہوں نے عطا علی خٹی سے کہا تو میں نے بے پارگی سے
ہاتھ دابھ کر کھینچ لیا۔ آخر میں ایک نوکدار سے ہماگ
ہماگ آیا اور کسی سے سامان اتارنے لگا۔ مگر بھائی نے
مجھے ایک آراستہ کر کے لے چھوڑا اور کچھ دیر میں
میرا سامان بھی آچھپا، میں تھکا ہوا تھا۔ اچھی طرح
نہانے اور کپڑے بدلنے کے بعد بستر پر دوکر سو گیا۔

آنکھ کھلی تو رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ بھوک
بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں کچھ دیر لیٹا آنکھیں جھپک رہا
پھر اٹھ کر باتھ روم میں کھس گیا۔ باتھ روم سے باہر آیا تو

”بھئی تم جیسے ہوئے تھے اس لئے میں نے
 تنگ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ابھی کرے کی جی جلتی
 دیکھی تو سمجھ گیا تم جاگ گئے ہو۔ آج آکا کا تار ہے۔“
 انہوں نے مسکرا کر کہا۔ رات کے کھانے پر صرف میں
 اور منو بھائی موجود تھے۔
 ”منو بھائی! آپ کی بیگم اور بچے نظر نہیں
 آ رہے۔“ میں نے ادھر ادھر سمجھاتے ہوئے کہا۔

”دو تین چار دن ہونے کا اکاڑہ ہونے لگا۔
 میں کہہ کر کوئی شادی وغیرہ ہے۔ ابھی بھتہ دن
 اور دیر میں ہے۔“ انہوں نے سرسری اعزاز میں کیا تو میں
 نے سر ہلا دیا۔ رات کے کھانے کے بعد سو بھائی مجھے
 گھر لے گئے۔ آگے بڑھے مضافاتی علاقہ تھا لیکن یہاں
 آپ دھوا ہے حد صاف تھری میں اور چاروں طرف
 اونچے پے پہاڑی سلسلے موجود تھے کہ پانی بھی نہ صرف
 اور جزیرہ نما ہے۔ دریاں خاموش اور نہر خطا سے
 ملنے ہوئے ہیں۔ خود کو حد کا محسوس کیا۔

اگلے روز میں اسلام آباد جا کر تیسرے صاحب سے ملا۔ کچھ ضروری کاغذات پر کرنے کے بعد میں نے اپنی مصوری کے کچھ نمونے ان کے پاس جمع کرائے جنہیں قرائش میں شامل ہونا تھا اور کچھ دیگر کپ شپ کرنے کے بعد میں واپس لوٹ آیا۔

منو بھائی رات کے کھانے کے بعد ٹہلنے کے
عادی تھے۔ آج بھی انہوں نے مجھے ہمراہ لے لیا۔ میں
نوحی خان کے ساتھ ہولایا ٹہلتے ہوئے انہوں نے سرسری
معاوضہ دیکر کیا کرکل وہ ایک روز کے لئے فیصل آباد
جا رہے ہیں۔ منو بھائی کا کاشٹھل کا کاروبار تھا اور ان
کا کیش پیسل آباد پتادیں جاتی تھیں۔ انہوں نے بتایا
کہ وہ ایک روز بدلا واپس آئی تھیں۔ ان کی عدم
حضورگی میں، میں خود کو توتناں سمجھوں اپنی کسی ضرورت
کے لئے ملاقات ڈیڑ (لازم) سے کہوں۔ مجھے بھلایا
معرض اس وقت تک تھا میں نے خاموشی سے مہلادی۔
انگلے روز میں بھی میری چلا گیا اور سارا دن
خصوصاً دوپہر کو کوا گھر میں بیٹھا کرتا تھا شام

میں واپس آ کر میں نے کچھ دیر آرام کیا پھر مرات کا کھانا کھا کر میں اکیلے ہی ٹیبلے تک آ گیا۔ کوئی نصف وقت تو جی نہیں۔ میں ٹیبلے تک آنے کا دو رکھ آیا۔ سامنے ایک چھوٹی سی پھاڑی تھی۔ سرے دل میں آیا کہ کیوں نہ اس پھاڑی پر قدم رکھ دوں کب شہر کا نظارہ دیکھوں۔ میں آہستہ آہستہ قدم بجا کر پھاڑی پر چڑھنے لگا۔ کچھ پہاڑ کا اندھیرا تھا کہیں ایک اور گھاٹی سے یہاں سے لوگ گزرتے تھے جتنے ایک پھوٹے پھاڑی پر ایک پٹری پڑی سی تھی وہی تھی۔ تقریباً آدھ گھنٹے کی چڑھائی کے بعد میں پھاڑی کے اوپر کھڑا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لے کر صاف ستھری دھوا کو اپنے پیچھے دھول میں سمونے کی کوشش کی اور ماحول پر ایک طائرانہ نظر ڈالا۔ مجھے کچھ پائی ہوئی۔ دوں کب اندھیرا ہی اندھیرا ہو گیا۔ کوئی نظر آ رہی تھی۔

میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ چاند زرد گویا
اپنے عروج کو پہنچنے کے بعد اپنے اختتام کا سفر شروع
کر چکا تھا۔ کچھ دیر تک وہ چل کر ٹھہرے اس کے بعد میں
نے پلٹ کر دواہن اثر شروع کر دیا۔ ابھی میں پہاڑ کے
ان سمن میں ہی پہنچا تھا کہ مجھے آس پاس کی کسی موجودگی کا
احساس ہوا۔ میں نے سرگھبرا کر ادھر ادھر دیکھا پھر میری
 نظر بائیں جانب ایک اونچی چٹان پر پڑی۔ کچھ جہاں وہ
سے دالے سے مجھے نظر آ رہے تھے۔ شاید وہ کسی کیسے ہیں
رہنے والے لوگ تھے جو شاید عداوتی کے لیے یہاں
آئیے تھے۔ میں کچھ دور چلتا ہوا وہ لوگ مجھے صاف
نظر آنے لگے۔ وہ ایک قویا تھا جوڑا تھا۔ انہیں نے سرخ
عروسی لباس پہنا ہوا تھا اور دلہا سفید ریشمی ڈال اور چڑکی
میں بیٹھیں تھیں۔ مجھے تعجب ہوا۔ بھلا ان کی رات کی کوئی
بیوی ان کے ساتھ نکلتی ہے میں نے ان کے چہرے پر نظر ڈالی۔
چاند کی دم زرد روشنی میں دونوں خاموش بیٹھے تھے۔
ملاؤں میں تک وہ بے تھے۔ ان کے چہرے ناشریت
سے مایل اور پتھر کے دے تھے۔

Dar Digest

جیلہ اور اشفاق نے عدالت میں صاف بیان دے دیا کہ دونوں ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ دونوں عاقل و بالغ تھے لہذا عدالت نے دونوں کی شادی کا فیصلہ سنایا اور دونوں کمروں کی آپس میں صلہ کا حکم دیا۔ جیلہ کے کمر والوں نے ناچا رس کی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اشفاق تو مجھے ان دونوں موازن میں اثر دلایا تھا۔ لیکن شادی کے روز مصحفی کے بعد جب بارات واپس آ رہی تھی تو راستے میں دو لہا کی گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی اور بعد میں ایک موٹر گاڑی کھڑی ہوئی لی انھیں بدھت ہو کر ایک ٹرین بھیچہ پتہ چلا۔ طرح طرح کی گلیاں آ کر ان کی ٹرین۔ کچھ نے کہا کہ یہ جیلہ کے بھائیوں کی سزا ہے۔ کچھ نے کہا کہ دونوں میاں بیوی خطرے کے چپن نظر نہیں رو پڑیں ہو گئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اس وقت گاڑی اشفاق کا ایک دوست چلا رہا تھا کہ وہ بھی غائب تھا۔ اس سے شادی ہو گیا کہ اشفاق نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر ٹرین فرار ہونے کا منصوبہ بنایا ہوگا تاکہ بعد میں کوئی انھیں جک نہ کر سکے۔ اس بات کو آج سال سے زیادہ گزر چکا ہے۔ دونوں کے مال باپ کا ان کی جدائی میں برا حال ہے لیکن آج تک ان کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔

بھیر کی روداد ختم ہوئی تو ہم دونوں سکتے کے سے عالم میں بیٹھے تھے۔ بھیر بھی بے دھان ناساتے دکی سا ہو گیا تھا۔ اس نے بات ختم کرنے کا خاموش بیٹھ گیا۔ بھر اچانک کچھ دیر بعد اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

”لیکن باؤنٹی آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے انھیں ہمیں نہیں کہیں دیکھا ہے۔ آپ کی بڑی بھریاں ہوئی اگر آپ ان کا پتہ بتادیں۔ ان کے مال باپ کا ان کی یاد میں روداد برا حال ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا تو میں نے بے اختیار ایک گہرا سانس لے کر گزشتہ دووں کی ساری تفصیل اسے بتادی۔

”کمال ہے۔ اگر وہ کہیں قریب رہ رہے ہیں

اور رات کو چھپنے بھی نکلے ہیں تو اپنے رشتے داروں سے ملے کیوں نہیں؟“ سو بھائی نے حیرت سے کہا۔

”شاید وہ اب بھی ہم سے انک رہنا چاہتے ہیں۔ رات کو بھی وہ اس پہاڑی پر چلے جاتے ہیں۔ سب جاتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ تاکہ کوئی انھیں نہ دیکھ جائے۔“ بھیر نے کہا تو میں چونک پڑا۔

”کیوں؟ سبھی لوگ اس پہاڑی پر جاتے ہوئے کیوں گھبراتے ہیں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”اس کی وجہ میں بتا ہوں۔“ سو بھائی نے گھما کر کہا۔ ”تم نے تو دیکھ ہی لیا ہے کہ نہ علاقہ تو غیر مشرق ہے اور پہاڑی سلسلوں کو کائنات چھانٹ کر پلاٹ اور سوئس بنائی گئی ہیں۔ مذکورہ پہاڑی پر کسٹرنٹن کے دوران کچھ حادثات پیش آئے جنہیں تو ہم پرست لوگوں نے آسیب اور جنت وغیرہ کے تصور دیا کیونکہ یہ پہاڑی علاقہ گزشتہ پندرہ سال سے دریاں بدلتا تھا۔ سو اس پہاڑی پر سر زمین اور مکان تو نہ بن سکے لیکن دن میں لوگ پھل اے آئے جانے کے لئے استعمال کرتے رہے کیونکہ پہاڑی کی دوسری طرف موجود علاقے سے یہاں تک کا یہ شارت کٹ راستہ ہے لیکن رات میں جنت یا آسیب کے کورسے کوئی اس طرف نہیں جاتا۔“ سو بھائی نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”تو آپ اعلیٰ میں اس طرف جانے کو ان کا سراغ لے کر ان کو وہ شاید اب بھی پتہ نہ چلا۔“ بھیر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو پھر اب کیا پروگرام ہے؟“ سو بھائی نے پوچھا۔

”پروگرام کیا ہونا ہے صاحب! آج رات کو میں وہاں جا کر اشفاق سے ملوں گا اور اسے کمر واپس لے کر آؤں گا۔“ بھیر نے مضبوط لہجے میں پوچھا۔

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ سو بھائی نے بے کچھ سوچ کر کہا تو بھیر کچھ کچھ بغیر خاموش ہو گیا۔

رات کو کھانا سے کچھ بعد ہم تینوں اس پہاڑی کی

طرف چل پڑے۔ پہاڑی کے نزدیک پہنچ کر میں نے اصرار اور دیکھا لیکن اس وقت یہاں کوئی نہیں تھا۔

”بھلی بار میں نے انھیں پہاڑی کے اوپر سے دیکھا تھا۔ کیوں نہ ہم اوپر چل کر ان کا انتظار کریں۔“ میں نے تجویز پیش کرتے ہوئے کہا تو دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ کچھ دیر بعد ہم پہاڑی کی چوٹی پر موجود تھے۔ کافی دیر تک اصرار اور ہم کا جھانک کر کے کے بعد بھی ہمیں وہ دونوں نظر نہیں آئے۔

”شاید آج وہ نہیں آئیں گے یا پھر وہ ہم سے پہلے آ کر جا چکے ہیں۔ سو بھائی نے خدشا ظاہر کیا۔

”وہ ہے۔“ اچانک میری نظر ان پر پڑ گئی۔ وہ دونوں اسی طرح ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے پہاڑی کے دامن میں چلے جا رہے تھے۔ ہم نے تیزی سے پہاڑی سے اتار خاڑی کر دیا۔

”اشفاق! او کیے! میں ہوں بھیر۔ تیری رضی خالد واپر۔ بات سن۔“ اچانک بھیر نے انھیں زوردار سے آواز دیں دینا شروع کر دیں۔ بھیر کی آواز سن کر اشفاق نے پلٹ کر دیکھا اور اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہو گئے۔ وہ دوبارہ چلا اور اپنی دھن کا ہاتھ تھامے پہاڑی کی غمتی سمت جانے لگا۔

”یہ دونوں پہاڑی کی جھنجھلی سمیت جا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ ہمیں جلدی کرنی ہوگی۔“ میں نے ہانپتے ہوئے کہا اور تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ وہ دونوں ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ ہم تھروں اور چٹانوں کو کھانٹتے، چڑھتے اترتے جیسے ہی پہاڑی کی دوسرے پٹیچے، اپنے اعتبار کھٹک کر درگ گئے کیونکہ وہ دونوں ہمارے سامنے کھڑے تھے۔

ساعت اور خاموش وہی دیاں آئیں۔ وہی تاثرات سے عادی پھرے۔

”کہاں چلا گیا تھا کچھ تو تیری ماں کا تیری یاد میں برا حال ہے۔ چل کر واپس چل۔“ بھیر نے بے تابانہ لہجے میں کہا۔ اشفاق اور اس کی دھن نے کدھمیری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر اشفاق نے کہا۔

”تو نے بہت دیر گزری تھی۔“ اب وہ اپنی کا راستہ بند ہو چکا ہے۔ اب تو ہمیں مل رہا ہے۔ نہ جانے کب تک۔“ اس نے باؤنٹی سے کہا۔

”کچھ نہیں ہو سکتا۔ سب تیری اور باؤنٹی، جیلہ کی راولک رہے ہیں۔ سب ماں باپ کے گھر تو اپنی خند چھوڑ دے۔“ بھیر نے سخت بھیر سے لہجے میں کہا۔

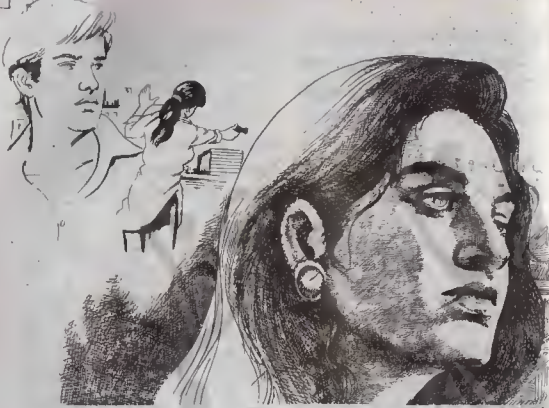
”تو کچھ نہیں رہا ہے۔ بھیر۔“ اصرار ساتھ جو ، کچھ ہو رہا تھا وہ شادی کی رات ہو چکا۔ میں گاڑی سے اُٹو آ گیا کیا اور..... اشفاق کہتے کہتے کہ گیا۔ کچھ نے کسے کچھ رہنے کے بعد وہ پھر کو باہر۔

”خدا کرے۔“ میں نے انھیں یہاں لاکر ہم پر بے انتہا تشدد کیا۔ ہمیں ڈھونڈ، بیٹوں اور موٹر سائیکل کے بیچن سے زردوب کیا کیا۔ خالوں نے میری جیلہ تک کا علاقہ نہیں کیا۔ یہ کہتے ہوئے اشفاق نے دکھ بھری نظروں سے جیلہ کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر بھی دکھ اور تکلیف کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔

”ہمیں ڈھونڈنے سے چور چور کرنے کے بعد انہوں نے ہمیں اٹھا کر اس پہاڑی کے پیچھے ایک کڑے، میں بیٹک دیا اور میں خڑ پتا بے یار و دھار چھوڑ کر چلے گئے۔ نہ جانے کب تک ہم اسی طرح گڑھے میں پڑے رہے۔ پھر کچھ وقت گزرنے کے بعد تکلیف کا احساس آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔ ہم کڑے سے باہر تو نکل آئے لیکن ہمیں یہاں سے باہر نکلنے کا راستہ نہ مل سکا۔ ہم اکثر اس پہاڑی کے ارد گرد گھومتے رہتے ہیں گھر میں اس پہاڑی اپنے گھر جانے کا راستہ نہیں ملتا۔ نہ جانے کب تک اب چلا رہا ہے؟“ اشفاق نے کھونٹے کھونٹے لہجے میں کہا۔ ہم سب ساکت کھڑے اس کی روداد سن رہے تھے۔

”فلز نہ کھیرے بھائی۔ اب میں آ گیا ہوں۔ آہارے ساتھ چل۔ مجھے راستہ معلوم ہے۔“ بھیر نے جوف بھر سے لہجے میں کہا۔

”تو اب بھی کب بات نہیں سمجھا بھیر۔ ہمیں اتنی آسانی سے ایک راستہ نہیں ملے گا۔ اس کڑے میں پڑے



بزدل روح

ابنِ امتیاز احمد - کراچی

ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والا گھٹا لوپ اندھیرا پورہ علاقہ پر مسلط تھا، وقف وقفہ سے فلك شگاف چیدیں پوری فضا کو منتشر کر دیتی تھیں کہ پھر اچانک پورا علاقہ جیسے روشنی میں نہا گیا اور پھر.....

ایک اچھوٹی انوکھی عجیب و غریب اور اچھے میں ذاتی نظریہ اور پھر فریب کھائی

جسی اس سڑک کے سامنے سے دن میں دوسرے گزرتا تھا جس پر دفتر لانگ آئے جلی کر اس کی چٹکی کا مکان تھا۔ وہ سڑک اب ٹوٹ چوٹ چکی تھی اور اس کے اطراف جھانپیاں لگ آئی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سڑک پر کوئی آبادی نہیں تھی اور اس کی چٹکی کا مکان خالی غالی پڑا ہوا تھا کیونکہ وہ آسپزدہ مشہور تھا۔ بستی والے اس مکان سے دور رہتے تھے۔ خود بخود اپنی

گڑھے سے باہر نکال لئے۔ اس کے بعد انہیں باقاعدہ نماز جنازہ ادا کر کے دفن دیا گیا۔ اس موقع پر اشفاق اور جیلہ کے گھر والے بھی موجود تھے۔ فاتحہ خوانی اور دو عاکے بعد سب لوگ بوجمل قدموں سے واپس چل دیئے۔

اشفاق اور جیلہ کا قصور کیا تھا؟ صرف اتنا کہ انہوں نے محبت کی اور ایک دوسرے کے ساتھ قانونی اور جائز طریقے سے زعمی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ کیا سچے نہیں دیکھے ہوں گے انہوں نے ساتھ ساتھ رہنے کے۔ دکھ سکھ میں ساتھ نبھانے کے۔ بچوں کے اور اپنے پیارے سے گھر کے۔ ایسے کئی سوال تھے جو مجھ سمیت کئی لوگوں کے دل میں موجود تھے۔

ابھی ہم قبرستان سے باہر بھی نکلنے نہ پائے تھے کہ اچانک فضا میں ایک لڑخیز چخ کی آواز بلند ہوئی۔ ہم سب بے اختیار چونک کر مڑے، ہمارے ساتھ آ رہے ہوئے لوگوں میں سے ایک آدمی نیچے گرا کر تپ رہا تھا۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ وہ جیلہ کا بڑا بھائی پرویز تھا) اچانک کسی نے چلا کر کہا۔

”وہ تو مینوسا پ۔“ سانپ کا سننے ہی بھکڑو رنج گئی۔ ہر کوئی ادھر ادھر بھاگ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پرویز کے ہاتھ پاؤں اٹھنے لگے اور منہ سے بھاگ بچنے لگا۔ اسے ہم اچانک بھاگ ہسپتال لے جایا لیکن بعد میں اطلاع ملی کہ وہ راستے میں دم توڑ گیا۔ پرویز کی اس ناگہانی موت نے کئی سوالوں کو جنم دیا۔

تقریباً بیچتہ حالات و واقعات کی کڑیاں ملا کر اعلازہ لگائیں گے کہ پرویز کی اس اچانک اور پراسرار موت کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

میں نے اشفاق اور جیلہ کی جو پیشینگ منائی تھی، وہ میں آتے ہوئے بشیر کھٹنا سے آیا۔ شاید اس پیشینگ کے سہارے اشفاق اور جیلہ ان کے رشتے داروں کی یادوں میں ہمیشہ کے لئے زعمور ہیں گے۔



پڑے ہماری موت واقع ہو گئی تھی۔ جب تک ہمارے بے گود کو نکال لائے وہاں پڑے ہیں۔ ہم یہاں سے نہیں نکل سکتے۔“ وہ اسی سے سکرایا۔ اس کی بات سن کر ہمارے تو کایا سڑوں پر پھاڑوٹ پڑے۔ مجھے کچھ بھیرا دل بھی اچھل کر قفل میں آجائے گا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ دلوں سرپکے ہیں اور مردہ حالت میں بھگ رہے ہیں۔ لیکن بشیر پر اس بات کا اتنا رد عمل ہوا۔

”مجھے معلوم ہے تو مجھے مال رہا ہے۔ میں تجھے ساتھ لے کر ہی جاؤں گا۔“ لگتا کہ کراس نے تیزی سے آگے بڑھ کر اشفاق کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی لیکن اس کا ہاتھ ہوا میں یوں گوم کیا جیسے اشفاق ٹھوس وجود کے بجائے ہوا کا کئی کوئی حصہ ہو۔ یہ دلوں دیکھ کر بشیر بھی ہکا بکا رہ گیا۔

”میں نے کہا تھا میں یہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔“ اشفاق نے اسی طرح کھوئے کھوئے لہجے میں کہا اور جیلہ کا ہاتھ تمام کر واپس مڑ گیا۔ لیکن اس بار کچھ قدم چلنے کے بعد ان کے جسم اسی طرح ہوا میں تحلیل ہو گئے جیسے وہاں بھی کئی تھا ہی نہیں۔ ہم تینوں کی حالت تو ایسی تھی کہ کافو تو بولیں۔ میں کس طرح گھر واپس پہنچا تھا یا نہیں.....

اگلے روز منو بھائی اور بشیر کسی پیر صاحب کے پاس گئے اور انہیں ساری صورت حال بتائی۔ پیر صاحب ان کے ساتھ ذکورہ پھاڑی پر پہنچے۔ منو بھائی نے مجھے ساتھ لے لیا تھا۔ کچھ دیر کی تک دود کے بعد ہم نے وہ گڑھا دریافت کر لیا جہاں اشفاق اور جیلہ کی لاشوں کے بچر پڑے تھے۔ ان کے اوپر پھردیاں کا کافی ذخیرہ تھا اور گڑھ خورد و خوراک جھاڑیاں بھی اکی ہوئی تھیں البتہ جیلہ کے عروسی جوڑے کا ایک کاربہار بھگتا ہوا تھا جس سے ہم نے اس جگہ کی شناخت کی۔

پیر صاحب گڑھے کے کنارے بیٹھ کر کوئی دغیفہ پڑھنے لگے جبکہ بشیر کچھ مژدوروں کو ساتھ لے آیا جنہوں نے احتیاط سے اشفاق اور جیلہ کے ڈھانچے

تلاکھول کر مکان کے اندر داخل ہونے کا عمل شاید جی کی زندگی کا سب سے زیادہ جرأت مندانہ اقدام تھا۔ اس نے اپنے پیچھے دروازے کو کھلا رہنے دیا اور فوراً اندر کا محاسبہ کیا۔ اس وقت وہ ایک بڑے ہال میں کھڑا تھا جس کے دونوں طرف کمرے تھے اور

”تو روح نے اسے ڈرانے کی کوشش کی تھی اور وہ ڈر گیا۔“ جی نے خیال کیا اور یہ سوچ کر اس کا سارا خوف زائل ہو گیا بلکہ مارے غصے کے اس کا خون کھولنے لگا۔ پھر اسے حالی کا خیال آیا جو دروازے پر بیٹھ

”ایسا نہیں ہوتا لڑکے۔“ روح نے کہا۔ ”تم بہت زیادہ بے قوف ہو تمہیں اس اصول کا علم نہیں کہ

”اوہ معاف کرنا۔ مجھے بالکل خیال نہیں رہا۔“

تالا وہ روح رو رہی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد روح بچے آئی۔ ”لڑکے خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو۔“ روح نے بے بسی سے کہا۔ ”میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اب تو مجھے سکون سے رہنے دو۔“

جی نے کہا۔ ”وہ صرف اس سے ملنے اور یہ پوچھنے آیا ہے کہ اس کی زندگی کسی کڑی رو رہی ہے۔“ ”بس کڑی رہی ہے۔“ روح نے افسردگی سے جواب دیا۔ ”میرے نقطہ نظر سے یہ بہت اچھی جگہ ہے۔ خاموش ویران، یہاں کوئی نہیں آتا۔“

”نیک ہے۔“ جی نے کہا۔ ”اگر تم ہمارے کرائے داروں کو یہ بیان نہ کرنے کا وعدہ کر دو تو میں تمہیں یہ بیان نہیں کروں گا لیکن اگر تم اس مکان میں داخلے کی کوشش کی تو۔“

”نہیں میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔“ روح نے جلدی سے جواب دیا۔ مکان کرائے پر اٹھ جانے کے بعد جی اور اس کی چچی کے حرمے آگئے۔

جی کے ڈھیر سارے پڑے سن گئے اور وہ اپنے حرمے میں ایک مرتبہ اور بھی کسی دو مرتبہ ظلم بھی دیکھنے لگے۔ روح سے جی مانوس ہو گیا تھا اس لئے وہ اس سے ملنے کے لئے ہفتے میں ایک مرتبہ ضرور جاتا تھا۔ بہت جلد وہ آپس میں گہرے دوست ہو گئے۔

اس سال کرسمس کے موقع پر جی نے روح کو اپنے گھر کھانے کی دعوت دی تھی اس نے شہر کے ساتھ قول کر لیا۔ ظاہر ہے روح نے کچھ نہیں کھا یا لیکن وہ روشن اور گرم مکان میں آکر بہت خوش ہوئی اور اس نے خوب باتیں کیں۔ روح نے جی کو اکثر

ترتیبیں سکھائیں جن میں سب سے عمدہ ترکیب انکاروں کی طرح روشن اور دھکی ہوئی آنکھوں والی ترکیب تھی۔ یہ ترکیب بعد میں جی کے بہت کام آئی۔ جب وہ ڈاکٹر بن گیا تو وہ لوگوں کے گلے کا سنا سنا سی ترکیب سے کرتا تھا اور اسے معلوم ہو جاتا تھا کہ مرینس کے ٹوٹس کھانے چاہیں گے یا دواسے علاج ہو جائے گا۔



فانج زدہ

قاسم رضا۔ چنیوٹ

چیخوں کی آواز سے نوجوان کے کپڑے کے پھٹے جلا رہے تھے، بہت ہی بردشاک منظر تھا، اس جگہ ایسے نرمادہ تھے جو شکل و لہڑی سے سسور اور فلنگین انسان جیسی تھیں وہ کربناک آواز میں چیخ رہے تھے۔

قدرت کے نافذ کردہ قوانین کو نہ ماننے والوں کے لئے اپنی نوعیت کی گنہگار تھاک کہانی

”میری بات مانو جی! ایسا تم کرو، ہمارا مذہب ہمیں اس بات سے منع کرتا ہے، خدا کے بنائے اصولوں کے خلاف جو بھی اپنی مرضی کرتا ہے اس کا انجام ہمارا ہوتا ہے۔“ بوڑھے سنان نے اپنی جوان بیٹی کو بیکار سے کہا۔

”کیسی بات کر رہے ہیں آپ! کوئی ماہ مذہب؟ پندرہ لوگوں کی خود ساختہ باتوں کو آپ نے مذہب کا نام دیکھا ہے اور بلا مقصد میں اُٹھ کر یہ باتیں دہرائے ہیں؟“

اسے علم نہیں ہے کیا کرنے جا رہی ہے تم کو بت سمجھا دو
اسے سمجھاؤ اگر کیا کرے گی تو شاید واقعہ ہم جیتوں
سمیت اس ساری سچی کوئی شے نہیں کروے گا۔
”واللہ اعلم“ افسوس! جو کہہ رہی ہے بالکل ٹھیک کہہ
رہی ہے پہلے ہی ایسا ہوا رہا ہے جو کبھی کسی کو اس بات
کا خیال نہ دیکھتا تھا۔ سو اس بات سے متنبہ ہوں
اور اس میں میری اپنی خواہش بھی شامل ہے۔ ”میں
جو اس تک پہنچا ہوا ہا تھا بہت زری سے مگر فیصلہ نہ
انعامیوں پر ملا۔

افراد مقام کی طرف کوچ کر جاتا تھا۔ اس وقت سے دو کمریوں کی چٹیاں بنانے کے لئے انتہائی خوبصورت علاقے میں آیا ہوا تھا۔ وہ طبعیات کا کچھ گوارا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اصحابی اور انگریزی میں اعلیٰ ترین سطح پر مہارت بھی ہوتی تھی۔ جس کی وجہ سے کچھ پورے ملک میں اس کی اسٹوری بڑا کافی بکھڑا تھا۔ جہاں وہ اس طرح سے کہاں کہاں لکھتا تھا وہ پراسرار علوم کا مجسم بھی رہتا تھا۔ کثیر ہزار تجزیہ جیٹ، ٹیٹ، ٹیٹ، چھانچا اور اس طرح کے کئی علوم پر وہ پیکل بھی کر چکا تھا مگر بد قسمتی سے چنانچہ اس کے علاوہ کسی علم پر اسے دسترس نہ ہوئی۔ وہم الدین کے لئے علم ہی تھا۔ مگر وہ اس علم کا استعمال بھی نہ ہونے کے برابر کرتا تھا۔

”میرے بچہ! لو کہ جاہل تھے ان کے پاس کسی گاہے گاہے خدا کے نیک بندے آتے رہے مگر انہوں نے ان کو سنا نہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ خدا اور اس کے بتائے ہوئے اصولوں سے مخالفت کرنے والے لوگ دنیا میں ہی ذلیل و خوار ہوئے۔ مگر میں نے تمہاری مذہبی تعلیم کی کہ کچھ نہیں چھوڑی مگر تم کیوں نہیں سمجھتے یہ جو تم کو بتا رہا ہے وہ بہت بڑا نشانہ ہے۔ میں نہیں اس کی ہرگز اجازت دیتا ہوں گا۔“

بوڑھا حنا ان آخری جملہ سے بے کہتا ہوا اٹھ کر کمرے سے باہر چل پڑا۔

اس ہوٹل کو چھوڑ دیا تو اس سے رہائش گاہ
اور وہ لوگوں کی سی لڑا۔

”آپ کون ہیں اور کون جیسے ہوٹل چھوڑنے کا
کہر ہے میں جانتے ہوں۔ آپ دوسرے ہوٹلوں
کے کارکنے ہیں تو یہاں آئے دل سے سچا ہوا اپنے
ہوٹوں میں آئے ہیں۔“

”میری طرف غور سے دیکھو اور بتاؤ کہ کیا میں
کسی کے ہوٹل کا کارکن ہوں میری بات کو اگر مان لو
میں تو محفوظ رہوں گے۔“

”جیسی نے اپنی بات
اور میری چھوڑ دی۔“ تب وہ سب نے اس کے پیچھے جا کر
جاڑا لیا۔ وہ واقعی کسی طرح سے بھی اس طرح کا آدمی
معلوم نہیں ہوتا تھا۔ فیکٹرٹ کال کال پینڈ اور اس پر کمرے
تک کی گئی تھی اس میں کون سا کچھا اور شخص گھس گیا تھا۔

”اب دیکھ لیا تو کون سی ہوٹلی باتوں میں شرمندہ

ہو رہی تھی اس نے سخت مٹانے کے لئے اس نے
 آپ کا آگے بڑھایا اور بلا۔ ”میرا نام وسیم الدین ہے اور
 آپ کا؟“
 ”نیل!“ انہی نے معافہ کرتے ہوئے
 جواب دیا۔
 ”نیکر آپ مجھے اس اوٹ میں ٹھہرنے سے منع
 کیوں کر رہے ہیں؟“ وسیم نے اپنے دہے ہوئے ٹھکس
 سے مجبور ہو کر کہا۔
 ”کیونکہ میں نہیں جانتا کہ تم ”قلعہ زدہ“ ہو جاؤ۔“
 ڈاکٹر نیل نے غصیلکی سے کہا۔

”واٹ!“ فاج زدہ، ”یہ کیا بات ہوئی۔“
 صاحب اب تو سمجھ چکے تھے کہ آپ کی اپنی طبیعت
 خراب ہے۔ ”دسم کے کچے میں ان کو گاری بھرے عود
 کرائی۔
 ”میں بالکل بچ کر رہا ہوں یہاں آنے والا جو کسی
 شخص سے اب ہوئی میں روئے کی جرأت کرتا ہے۔ فاج کا
 ڈار ہو جاؤ گا۔“ فاج کرٹیل نے ایک ایک لفظ پر زور
 دے کر کہا کہ آپ کی بارڈ کرٹیل ان کے مصلحتاً تھا۔
 ”فاج زدہ۔“ وہ یہ تو کسی فلم یا کہانی کا نام ہوتا
 ہے۔ دسم کے سحر آواز سے ان کا من بٹنے لگا۔

”میرا کام تھا کہیں روکنا، آگے بڑھنا اور کھڑے رہنا۔“
 میں دعا کر رہی تھی کہ کھانا اچھا ہو، دینا ہے جو پہلے آئے
 والے لوگوں کا ہوا ہے۔“ ڈاکٹر نیشنل نے عجیب انداز سے
 اسے گھورا اور بول دیا۔
 ”تم کو کھانا کب کھانا ہے؟“
 رابرٹ بول رہا۔ ”میں بیچ کر دے دیتا ہوں۔“
 کرے میں چلا گیا۔ اس بول میں اب تک اسے ایک
 آدمی کے علاوہ کوئی دگر نظر آیا تھا اور کوئی دوسرا ظاہر
 پاشا اس بول کا بچہ تھا۔ اور اس نے اسے کمرہ
 دینے وقت عجیب سرسری انداز میں کہا تھا۔ ”پہلے کام
 سے آکر کھانا اور اسے کمرے تک محدود رہنا۔“
 وہم کو تو کہنے سے تنہا ہی ہی ضرورت تھی
 ہونے کے ساتھ کہنے سے علاوہ بول میں اس کو کوئی نہیں

تھا۔ تو اس کی پچھون میں کہانی لکھا اس کے لئے بہت موزوں تھا۔ ایک تو تنہائی میں وہ کیسوی سے کہانی کا پلاٹ بنا سکتا تھا دوسرے اس کے کام میں کوئی خلل بھی نہیں ہوتا، یہی وجہ تھی کہ اس نے طاہر پاشا کے کہے ہوئے الفاظ کو سن کر حلیم کا اور ان پر کوئی توجہ نہ دی۔ مگر ڈاکٹر نیل کے ملاقات کے بعد وہ سوچ رہا تھا کہ ”ضرور اس کی کوئی بات اس ہوگی سے بڑی ہوئی ہے جو طاہر پاشا بتانے لگے تھا اور اس بات کی وجہ سے دوسرے لوگ اس ہوگی سے خائف ہیں۔ ان خیالات کے آگے میں اس کی تجسس نفرت جاگ اٹھی۔

شام ہو چکی تھی اور وہ کئی لمحہ اسی جگہ پر بیٹھ کر غور کرتا رہا۔
 کرنے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ کیا حکم ہے جب ظاہر پاشا
 سو جانے لگا تو اس نے ہوش کو اپنے گریز سے بچنے کے لیے
 اور اس کے لئے اسے بارہ بجے کا انتظار تھا۔ خدا
 کر کے بارہ بجے اور آج بھی اسے اپنے گریز سے بچنے کا
 دے دیں تو اس نے ہوش کو اپنے گریز سے بچنے کے لیے
 کے بارہ بجے اور آج بھی اسے اپنے گریز سے بچنے کے لیے
 میں ظاہر پاشا اس کے اندر سے عجیب عجیب آوازیں اُڑی
 تھیں۔ اس کا تجسس بڑھ کر اٹھا تو وہ دیکھنے لگا
 آہستہ آہستہ اس دروازے کے قریب ہوتا گیا۔

آزاد کیا، آہستہ آہستہ لوہی کو بی بی باری سکس دو-
خود خرابی خبروں سے لوگوں کے اندر مستحکم کی کہ وہ دروازہ
دیتا تھا۔ خود ان خدو ان دھمکاک غیر انسانی قیامت آوازوں
کے ڈر کا پربا رہا۔ وہ لڑتے ہوئے دروازے کے
قریب پہنچا اور دھڑکنے والے سے پھٹل پر ہاتھ رکھا تو
اسے سمجھا کہ وہ دروازے پر بہت دیر تالا لگا رہا ہے۔
کارڈیڈر کے اس صدمے میں دروازے کا کوئی انتظام نہیں
تھا۔ دور کے لپک کی روشنی بالکل بلی بیلاں بڑبڑی گی جو
داخل کا دور پہنچا کر بڑی ہی۔ اس نے آخری کوشش کے
طور پر جمبوں سے نکلے سے فسلک چھوئے
سوراخ سے آگے نکلی چاہی تو ایک ہمدردی بھرا ہاتھ
انچاؤں کے شانے پر جم گیا۔ وہ جس قدر آواز
دیا تو اسے اس قدر کھرا تھا۔ "آواز کا کہنے سے نہیں

جیسے کوئی سے آ رہی تھی۔

”کیا تم جانتے ہو کہ اس کرے میں کیا ہے؟“
دیسم نے اس خیال کے آتے ہی طاہر پاشا سے سوال کیا۔

”ہاں۔“ طاہر پاشا کا جواب مختصر تھا۔
دیسم کا ہنس نہیں چلا رہا تھا کہ وہ تمام معلومات ایک
یہی بار لگوا لے۔

”کیا یہ اس کرے میں، کیا تم نے بھی خود دیکھا
ہے اس کرے میں جا کر؟“ دیسم کا ضبط جواب دینے لگا۔

”ہاں! میں ایک ہی بار اس کرے میں گیا ہوں۔
اور وہ دھشنگ مندر دیکھا تھا۔“ طاہر پاشا بھی جیسے دیسم
کو زنج کرنے پر تیار ہوا تھا۔

”کیا دیکھا تھا تم نے؟“ دیسم نے جیسے چیختے
ہوئے کہا۔ فیصل اس کے کنٹرول سے باہر ہو رہا تھا۔ اس کا
دل کہہ رہا تھا کہ طاہر پاشا کے گلے میں ہاتھ ڈالے اور تمام
راز کھینچ لے۔

”میں نے وہاں دیکھا کہ..... آہ..... آہ.....“
اور پھر طاہر پاشا کا منہ ٹیڑھا ہوتا گیا اور تکلیف کے
باعث وہ کہتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ دیسم تیراگی سے اس کی
بدلتی ہوئی کیفیت دیکھ رہا تھا۔ طاہر پاشا فرانس سے باہر
آ چکا تھا۔ اور عجیب نظر سے اسے غور رہا تھا۔ جیسے کہہ
رہا ہو۔ ”اب پرانی کیلے میں شہنشاہ۔“

دیسم کو اس کی حالت دیکھ کر ترس بھی آ رہا تھا اور
اپنے آپ پر اعتراض بھی ہو رہی تھی۔ طاہر پاشا کے متعلق
اغذ کیے ہوئے اس کے تمام اعزازے ٹٹا ہو چکے
تھے۔ یہ بے جا رہا تو اسے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

دیسم نے اسے سہارا دیا اور لے کر اس کے
کرے کی طرف چل پڑا۔ اسے اس کے کرے میں
چھوڑنے کے بعد وہ خود اسے کرے میں آ گیا۔ اس
نے اپنی رگڑی ہوئی کپاہی کو آٹے پر بچا دیا اور طاہر پاشا پر
گزرنے والی چٹا لکھ دی۔

اب اس سب سے بڑا انتظار تھا۔ ساری رات
جاگ کر گزارنے کے بعد اس نے فجر کی نماز پڑھی اور
طاہر پاشا کے ساتھ کی جانے والی زیادتی کی خدا کے

حضور رو کر معافی مانگی۔ خمیر پر پڑا پتھر روٹنے سے ہلکا
ہوا تو وہ اٹھا۔ طاہر پاشا کے کرے میں گیا۔ جانے
بٹائی اور اسے اپنے ہاتھوں سے گلادہ بولا۔ ”میں نے
تمہارے ساتھ بہت بڑی زیادتی کی ہے مجھے کچھ نہیں
معلوم تھا کہ میرے ہنس کی وجہ سے تم اس حال کا
پتھر گئے۔ میں تم سے اپنے کئے کی معافی مانگتا
ہوں۔“ دیسم نے اس کی ٹیڑھی گردن کو سیدھا کر کے
اپنے رو رہو کرتے ہوئے کہا۔

طاہر پاشا اپنے ہاتھوں سے کچھ اشارہ کر رہا تھا
جس کا مفہوم دیسم نے سمجھا کہ وہ اسے ہونٹ سے جلد زائد
گل جانے کا کہہ رہا ہے۔

”تمہیں میرے دوست! اب تو میں یہ راز جان کر
ہی رہوں گا کہ اس خرون کی ایسی قوت ہے جو اس کرے کا
راز کھینچ لے۔ یہی میں ضرور جانوں گا اور وہ اس قوت
دینا کہ بھی بتاؤں گا۔ جا چا اس کے لئے مجھے جو بھی قربانی
دینی پڑے۔“ دیسم نے مضبوط لہجے میں کہا۔

طاہر پاشا اشاروں سے اسے روک رہا کہ دیسم
وہاں سے اٹھا اور ہونٹ سے باہر آ گیا۔ مارکیٹ سے اس
نے چند ضروری اوزار خریدے اور وہ ہونٹ کی سمت چل پڑا۔
رات ہونے میں ابھی دیر ہی۔ اور وہ یہ کام رات کو ہی کرنا
چاہتا تھا۔ صبح کے وقت کرے سے کوئی ایسی آواز نہیں آئی
تھی جو اسے باہر اشارے دے۔ اور دیسم نے بھی اس کے لئے
رات کا وقت چننا تھا کہ جو ہوگا وہ سامنے ہوگا۔

خدا خدا کر کے رات ہوئی۔ دیسم سے صبر نہ ہوا گو
مگیا کہ بیچے ہی وہ اس کرے کے دروازے پر جا
پہنچا۔ اوزاروں والے تھیلے سے لوہا کاٹنے والی آہنی
ٹٹائی۔ اور تالے پر گرنے لگے۔ جب کٹائی پر کے بعد تالا
آدھا کٹ چکا تو اس نے تھیلے میں سے ڈوٹی اٹھوڑا
ٹٹالا۔ اور ایک زردار چوٹ تالے پر ماری۔ اسی وقت
اندروں سے غیر انسانی چیخوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ تالا ایک
یہی چوٹ سے زوردار چکا تھا۔ دیسم نے بیٹہ جاچ پر وقت
دیکھا۔ بارہ بج چکے تھے۔ دل دلا دینے والی چیخوں کا
سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ دیسم کا دل کہہ رہا تھا کہ وہاں چلا

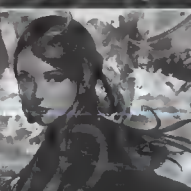
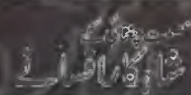
صاف طرز صفت اور جسم کے عجیب و غریب لٹریٹ ہڈ



قیمت = 150 روپے ڈاکٹر اختر باقی

قیمت = 150 روپے ڈاکٹر اختر باقی

صرف مخصوص پتہ والی کے سامنے چھوڑنا ڈاکٹر باقی



قیمت = 150 روپے ڈاکٹر اختر باقی

قیمت = 150 روپے ڈاکٹر اختر باقی

آج ہی اپنے قریبی بگ اشال سے طلب فرمائیں۔

کامیاب بک ڈپو نوبل اسکوائر کراچی
اردو بازار

جائے مگردماغ دل کی بات تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ آخر فرار
دماغ کی جیت اور دوسم نے شکل قبول دی اور ایک
جیسے سے دروازہ نکلا۔

دروازہ کھلتا تھا کیچڑ کا سلاب جیسے قسم کا گیا۔
ہر سو گھر اسکوت۔ خاموشی اور سستی۔ گھر اندر میرے میں
ڈوبا ہوا تھا۔ دسم نے دیواروں کو ٹھول کر سونچ پورڈھو ڈھوڑا
اور اس پر گئے تمام ہٹن یکے بعد دیگرے بچے کر دیئے۔
مکرمے میں روشنی ہونے سے اس کی آنکھیں چٹو چٹیا
لگیں۔ کافی دیر بعد جب وہ دیکھنے کے قابل ہوا تو
کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ کمرہ بھی دوسرے کمروں کی طرح
کا تھا۔ مگر یہاں تھوڑی سی صفائی نہ ہونے کی تھی۔ کمرہ
کڑکی کے جالوں سے گھرا ہوا تھا۔ دسم کمرے کا بخوبر
جائزہ لے رہا تھا کہ اس کی نظر فرش کے ایک کمرے پر پڑی
جہاں سے تالین ہتا ہوا تھا۔ صرف تالین ہتا ہوا تھا بلکہ
وہاں ایک دروازہ تھا اور صفحہ تھا جگہا ہوا تھا۔ دسم بے اختیار
اس کھلے چالچے کی طرف بڑھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہاں
کوئی خزانہ ہوگا مگر چالچے کے اندر نظر نہ پڑے ہی وہ دکا
یکارہ گیا۔

کیچڑ کا سلاب پھر سے شروع ہو گیا تھا اور اب
چھین چھین ہو رہی تھی وہ ہشتیاں مخرجی اس کے سامنے تھا
جس کو دیکھ کر نہ چاہے وہ کیسا بے دہاں ہو گیا ہوا تھا۔
منہر کی فیت اس کی توقع سے بھی گہن زیادہ تھی۔
کیچڑ کی آواز سے اس کے کان کے پردے پھٹے
چارہ تھے۔ اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ کوئی اور بھی اس
کمرے میں ہے۔ وہ وہاں پر بہت خوف محسوس کر رہا تھا
اور پھر ایک نئی ہی افکار اور خیال دربارہا نکلا ہوا کمرے
سے نکلا۔ لیکن اپنے کمرے میں جاتے ہی وہ بیڈ پر
جا کر لہوہ ہشتیاں مخرجی اب بھی اس کی آنکھوں کے
آگے آ رہا تھا۔ اور اس منہر کی صیت سے وہ کچھ بڑھا ہوا تھا۔
کیا باریگہ اسے اپنے کمرے میں کسی کی موجودگی کا
احساس ہوا۔ کوئی خزانہ ہو جسے اس کی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس
نے بیڈ پر اٹھا لی اپنے اور گریڈ لپٹ لپٹ کر اور کڑکی کی طرف
میں چھپا لیا۔ اسے کسی نا دیدہ وقت کی شرائیکہ کی ڈاڈر تھا۔

مگر ساری رات اسے کسی سے نہیں چھیڑا۔

صبح کی روشنی نے اس کے اندر پہلے ڈر کے
اندر میرے کو دور کر دیا۔ حسب معمول جبر کی نماز پڑھتے ہی
اس کو سکون کا احساس ہوا۔ تھوڑی دیر باہر کے نظاروں
سے لطف اندوز ہوا۔ جب کہ بعد جب وہ ہونچا ہوا تھا کافی
فریض تھا۔ اس نے اپنی ادھوری کہانی کو آگے بڑھا دیا
کے لئے کا قدم سنبھالا اور جیسے ہی اسے حالات لکھنا
شروع کیے اسے عجیب سا احساس ہونا شروع ہو گیا۔ اس
نے فکر دلو لیا۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ کوئی غیر مرئی
وجود اس کے آس پاس ہے۔ اس کی جسمی سر کی سرخی
کہ اگر اس نے اس دہشت ناک منہر کی عکاسی کی تو
بہت غلط ہوگا۔

اس وقت داخلی کمروں کے ساتھ ظاہر یا شاس کی
کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے اس کی گہنی ہوئی کہانی کو
اٹھا اور لقمے لکھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد دسم کو ظاہر
یا شاس نے اس کا مسودہ دیا اور دسم نے بیج پر نظر ڈالی تو اس
کی ادھوری کہانی کے آخر پر "مختم شد" لکھا ہوا تھا۔

"اس کا کیا مطلب ہے؟" دسم نے ظاہر یا شاس کی
طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ظاہر یا شاس نے اپنے دونوں ہاتھ
ہائے اور دشاؤں پر ڈھکی کمروں کو ہلکے ہلکے جھٹکے دیئے
شروع کر دیئے۔ جس کا واضح مطلب تھا کہ "یہاں
سے چلے جاؤ۔ خدا کے آخر پر "مختم شد" یہاں سے چلے جاؤ۔"
دسم نے اب جیسے تھک چکا تھا اس نے ہونچے سے
جائے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اپنے کمرے میں جا کر نا ساسا
ہائے لگے۔ مسودے کو بیگ میں ڈالتے ہوئے اس کا
دل بہت ادا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں اس نے کوئی کہانی
ادھوری نہیں چھوڑی تھی مگر یہ پہلی کہانی تھی جو اسے بھر پور
تاکمل رہی تھی۔ اس نے اپنی سزا پر ایک کاغذ پر لکھا
اور ہونچے سے باہر نکلا۔

ہونچے کے ہانکل سامنے ایک عجیب اقلقت شخص
بیٹھا تھا۔ علیے سے وہ کوئی بیگ لٹکتا تھا۔ وہاں لکھا تھا۔
کہ جسم کی قومیت عجیب سی ہے۔ بے ڈھنگا سر یا اچھو
بڑے بڑے۔ چنگاریاں چھوڑتی آنکھیں۔ وہ دسم کو بھی

گھور رہا تھا۔ جب سے دسم اس ہونچے میں آیا تھا اس نے
اس شخص کی گہنی نہیں دیکھا تھا۔ مگر آج جب وہ چاہنے لگا
تھا تو ایک نئے عجیب قسم کا فقیر اس کے سامنے تھا۔ دسم
اس سے نظر بیکار کر رہا تھا جانتا تھا کہ اس کی آواز آتی۔
"مگر تم نے اپنی انجام کو پہنچی ہے۔ مگر تم نے اپنی
کہانی ادھوری چھوڑ دی۔ منزل پر آ کر دوا میں جارہے
ہو چیتا۔"

اس شخص کی آواز میں اتنی مٹاس تھی کہ کہیں سے
ہوتے قدم رک گئے۔ وہ چلا اور اس بھکاری کی نظر اس
کے پاس پائیٹھا۔ عجیب قسم کی بڑاس محسوس کے سامنے
آ رہی تھی۔ غصہات کا پتھر اور کھٹے کی وجہ سے دسم کو
اس بکے پر کیٹے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ یہ فانسوس کی بو
تھی۔ یا تو اس شخص کے کپڑوں سے یہ بو پھرتی تھی
یا پھر کپڑوں اور وجہ تھی۔

"بابا آپ کون ہیں اور کون سی کہانی کی بات
کر رہے ہیں؟" دسم نے ٹھنوں کے تل بیٹھے ہوئے
کہا۔

"انجیان بننے سے کچھ نہیں ہوگا۔ خود شرم لگے دینے
سے کہانی ختم نہیں ہو جاتی۔ جائز حالات کا قہار بلکہ
کوڑاؤں میں خاتمے میں، یہی تمہاری منزل ہے، تم
کا سباب لٹو گے۔ اور تمہاری کہانی کا انجام نہیں شرم
کی بلندیوں پر پہنچاؤ گا۔" فقیر نے عجیب سی مسکراہٹ
کے ساتھ کہا۔

"آپ جانتے ہیں کہ میں موت کا پھندا اپنے
ہاتھوں خود اپنے گلے میں ڈال لوں۔ مجھ سے یہ نہیں
ہوگا۔" دسم نے کوئی شے ہلایا۔

"تمہیں یہ کرنا پڑے گا۔ امیریں تم سے جڑی
ہوتی ہیں وہ صدیوں سے اس غلاب میں گرفتار ہیں۔
جاؤ اور وقت ضائع کے بغیر اس کہانی کو انجام تک
پہنچاؤ۔" اب کی بار فقیر کے لہجے میں سختی تھی۔

دسم اٹھا اور کمرہ اترے۔ ہونچے کی جانب بڑھ
گیا۔ ہونچے کے داخلی دروازے پر پہنچتے ہی اس نے مذکر
الغیر کی طرف دیکھا۔ مگر اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ دسم

مسکراتا ہوا ہونچے میں داخل ہو گیا۔ اب اسے روکنے والا
کوئی نہیں تھا۔ وہ دیکھا کہ کارور کے آخری کمرے کی
طرف گیا اور دروازہ کھولا تو اس کھلا تھا۔ اندر جا کر اس نے
ایک نظر چالچے کے نیچے غلام میں دیکھا وہاں اب پہلے
جیسی دہشت نہ تھی۔ وہ دسم جیسے سکون سے سوزہ ہے تھے
غلاب کا وہ گھورتے کہ بارہ بجے کے بعد شروع ہوتا
تھا۔ اب تو سب سے زیادہ دہشت اس ان غلاموں میں
کونے سے ہو رہی تھی۔ نیچے آسمان پر سورج اپنی آپ
دہشت سے چمک رہا تھا۔ کبھی وہ غلام چاندی کھینچنے والے کو
وہاں زندہ کر دیتا تھا۔ غلام میں اوپر اوپر مگر تھے جو
بغیر متروں کے غلام میں گئے ہوتے تھے۔ مگر جہاں
زمین ہوتی تھی وہاں آسمان تھا۔ یعنی وہاں سب
الٹ تھا۔ اس جگہ کونے کی اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔
اور اب تو وہ سورہا انسان یا انسان نما سورہے ہوئے
تھے۔ جبراً تو غلاب میں گرفتار ہوتے تھے۔

سورہوں کے پھلے آتے جو کہ آدمی انسان اور آدمی سور
نئی صورت کی چھاتیوں کے درمیان بچے چھ کر دسم کو ابھی
طرح پر اٹھا کر دھکے کھڑکھڑنے کے ذریعے سے لٹکتے تھے۔
اور جب یہ ختم ہو جاتا تو سارے گھروں میں آگ
بھڑک اٹھتی۔ اور پھر کیچڑ کا زخمیے والا سلاب شروع
ہو جاتا۔ مخرج ہوتے ہی پائے سکون سے سو جاتے جیسے
کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اور اب اس کی غلامی جہاں تک نظر
پڑتی تھی جیلتی ہوئی تھی۔

آخر کار دسم نے آنکھیں بند کیں اور خدا کا نام
لے کر غلام میں گھس گیا۔ وہ مگر جا رہا تھا۔ اور بھی اس کو
محسوس ہوا کہ وہ کسی سے بچے سے زیادہ پلٹا ہو گیا ہے۔
کھانوں کے دروازے پر کچھ اور اڑتا محسوس کرتا رہا۔ پھر
جب اس کے قدموں نے زمین کو چھوا تو اس نے آنکھیں
کھول دیں۔ انہی گھروں میں سے وہ ایک گھر میں تھا۔
وہاں دیکر ایک گھر میں کھڑا رہا۔ مگر شے اسے بارہ اور
زیر سورہے نظر آئے جو کہ بچہ دھڑ اور اکل سے سورہے
جنگہ گئیں انسانوں جیسی تھیں۔

[illegible]

”اوردہ جو دوسرے گھروں میں رہتے ہیں کیا وہ بھی ممکن بنائی؟“ ”دسم نے پوچھا۔
 ”ہاں! اگر وہ جن ہم میں سے کسی وہ آگ اور پتھر نے تمام تفصیل بتا دی تو دسم بولا۔

”یہ جہت آسمان تھا۔ آپ ایسے اس سورن کی طرف دیکھ کر رنخا کرتے رہے۔ آسمانوں کی دنیا میں جیسے عیاں کر میں لپے چکا ہوں۔ وہاں سے کیوں نکالے گا۔ کیوں نہ نکالے گا۔ کیوں نہ نکالے گا۔“

عاقلاً ہے۔ ہر بندے کو اپنے اعمال کی سزا ملتی ہے۔ مگر یہ نہیں جانتے اور پھر عذاب کا شرف نہ انہیں اٹھا کر اس دنیا میں ٹھیک کیا۔ اور اس ساتھ ہی کا فوجوں کا بھی براہدقت آگیا۔“

”مگر بابا! یہ سب اس ہوش میں آنے والوں کو کیوں نظر آئے گا اس کی بھی کوئی وجہ ہے؟“

”خوب کہی! آپ کم نہیں کر جاتے۔ مگر وہ کیا ہے؟ جو کہیں کوئی نایاب چیز ہو۔“

”جسے ہم سب مگر دیکھتے ہیں، وہاں سے نظر نہیں آتا۔ وہ ہلکی سی آواز ہے کہ وہاں سے جو بھی نظر نہ آئے۔“

”پڑے سناں نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔

”مگر یہ سب ہم نے اس خطبے سے پہلو ہٹا کر ”کیوں“ کے مگر کہہ کر لوگوں کے لئے نہ سمجھائی۔“

”تم اسے غلام و سچو سمجھو جو مرضی! اس میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں۔ یہ جتنی دنیا کے اصول ہیں کہ یہاں کی کوئی بات ہمارے نہیں جانے کی۔ باقی یہ انسان کو یہاں لانے کی بات ہمارا ہی مجبوری ہے۔ یہ اس دنیا کا قانون ہے کہ یہاں کی کوئی اگر کوئی ظاہر کے گائے کو اس کی ناک سے کھینچ لے جائے گی اور یہاں کا حکمرانے خلیج زندہ نہادے گا۔“ بوڑھے منان نے نری سے کہا۔



جادوئی گڑیا

ساجدہ راجا-ہندوا سرگردھا

درخت کے نیچے کھڑی بند جیب کی جھٹ پر اچانک سانپوں کی بارش ہونے لگی، زبردست خوفناک سانپ اپنا پھن بھیلانے آگے کو بڑھنے لگے تو اس جگہ موجود چاروں دوست جیسے پتھر کے بت بن گئے۔

خوفناک جھگ میں ختم ہونے والی ناقابل فراموش درشت ناگ اور درشت سے لبریز حقیقت

جنگلات کی سر اور شکار کرتے تھے۔ اس ناگ کا تعلق جنوبی امریکہ سے تھا، انہوں نے ایک ساتھ اپنی تعلیم مکمل کی تھی اور اب قارئین وقت میں شمالی افریقہ چلے آئے تھے۔ یہاں کے جنگلات کے بارے میں انہوں نے کافی کچھ سیکھا تھا اور وہ اس سے بہت متاثر تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ اندرونی جنگلات میں اس جگہ تک جا سکیں گے جہاں ابھی کسی انسان کے قدم نہیں پہنچے، اپنی حفاظت

اور ادھاری پر چٹا ہوا دوسرے گھر میں داخل ہوتا تھا۔ گھروں سے ہو کر جب وہ واپس لکھا تو چیخوں کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رک چکا تھا۔

بڑا حمان بہت خوش تھا۔ دسم نے کچھ دیر اس کے ساتھ رہنے کے بعد اجازت چاہی تو بڑا حمان اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ بڑے سے جن نے مہینے میں کچھ رہا تو آسمان کھونٹے لگا، دسم کو لگ رہا تھا کہ جہاں وہ کھڑا ہے، وہ فرش آہستہ آہستہ ٹیلر جا رہا ہے اور پھر آسمان کو کھٹا کھٹا اور ہوا، وہ تمام کھٹا کھٹا ہو گئے، دسم نے بڑے کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی مگر بڑے نے ہاتھ نکال دیا۔ دسم ہل ہل چمپے زمین کے نزدیک ہوتا گیا۔ اور پھر موت کے خوف نے اس کے حواس بچھین لئے۔

☆☆☆☆☆

دسم کو ہوش آیا تو وہ ہوش کے کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ اس نے طلسم کی طرف دیکھا۔ وہی تھا مگر وہاں کسی غلام کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ دسم اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا آیا پیکل پراس کا ادھر موجود اسے کھینے کی دھت دے رہا تھا۔ دسم کھینے بیٹھ گیا۔ بقیہ رات اس نے کھانی مکمل کرنے میں گزار دی۔ اب کی بار اسے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا۔

وہ بہت خوش تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ کھانی اس کی دوسری کھانوں سے بھی زیادہ پسند کی جائے گی۔ اور انہماک اس کی توقع سے بڑھ کر ہوا۔

اس کی کھانی نے پورے ملک میں ہنگامہ مچا دیا تھا۔ لوگوں نے کھانی کو بہت سراہا تھا۔ اور اسے بہت سے کٹھ اور انعامات موصول ہوئے تھے۔

ایک دن دسم کے گھر کے سامنے لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ بات یہی تھی، کیونکہ جس شخص نے یہ نسخہ خیر کھانی "قانع زدہ" لکھی تھی وہ دوسرے بہرک "قانع زدہ" ہو گیا تھا۔



"مگر آپ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ میری کھانی یہاں آکر مکمل ہوگی اب آپ کبہرے ہیں کہ یہاں کی بات باہر نہیں جاسکتی!"

"تمہیں میں نے بتا دیا ہے، تمہارے لیے میں یہ بہت دیتا ہوں کہ تم اپنی کھانی مکمل کر سکتے ہو۔" منان نے اس کے کانہ پر ہاتھ رکھے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

"آپ واقعی بہت اچھے ہیں!" دسم نے بے اعتدال اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"نہیں ہو سکتا۔ یہاں کی بات باہر نہیں جائے گی۔" دسم آزاد ہتھ ہی خواہ ایک لہجہ کی جھنجھکی فرما کر تھاجو نہ جانے کب سے ان کی بات میں رہا تھا۔

"سواگت ہے کیا کبہرے ہو تم امت بھولو کہ یہ تمہاری اور ہماری اولاد کے لئے نجات بن کر آیا ہے۔" بڑے منان نے اس کے قریب جا کر کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ یہ انسان یہاں ہماری اولاد کو نجات دلانے آیا ہے مگر میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ ہماری زندگی کے راز باہر جائیں۔" سواگت نے ٹوک کر دار انداز میں کہا۔

"تو پھر میں ہی دیکھا ہوں کہ اسے کون روکتا ہے! اس کی کھانی مکمل کرنے سے۔" بڑے منان نے جتنی انداز میں کہا۔

سواگت کے تھنے پھولنے لگے اور وہ غصے سے سر چٹا ہوا بالکل کر گیا۔

"ایسا تم بالکل غرمت کرو۔ یہاں سے قارئین ہو کر اپنی اپنی جگہ چلے جانا اور کھانی مکمل کرنا ہے آپ کو اکیلے۔" منان نے کھانی کھانی تمہارے ساتھ مل کر مکمل کرنا دلائے۔

"رات کے بارے بیجے۔ اور وہ ڈراؤنا منظر شروع ہو گیا۔ دسم اپنی جگہ سے اٹھا بڑے منان کی طرف دیکھا اور اشارہ دیا جسے اس کی بیٹی کے سر جیسے سر پر ہاتھ پھیرا۔ حیرت انگیز طور پر وہ چہرہ نازل ہوتا گیا اور ایک خوبصورت قالب میں آ گیا۔ اب دسم ایک گھر سے نکلتا

کے لئے انہوں نے مکمل انتظامات کر کے تھے اس سب کے باوجود انہیں اور پورا ہاؤس کے علاوہ کھانے پینے کے کامل سامان ان کے اپنے ایک الگ بیک میں تھا اور ایک جیب جنوں نے جنگل کی سیر کرنے کے لئے کرائے پر لی تھی۔

”واٹ دیش.....! تم ہاڑس سے خوفزدہ ہو؟ ہمیں ہر حال میں آج ہی جنگل میں جانا ہے چاہے کچھ بھی ہو ہم اپنا پروگرام بہرگز تبدیل نہیں کریں گے۔“

جونی کو گھورتے ہوئے جی نے کہا۔
”وہ جیسے جیسے غلط تو نہیں کہہ رہا۔ ہمیں واقعی اپنا پروگرام بدلنا چاہیے اگر ہاڑس کوئی تو ہم راستہ بیک بھی کھینچے ہیں۔ اور کم جانتے ہو یاں کہ جنگلات کس قدر گہرے اور وحشت انگیز ہیں اور قسم قسم کے درخت بھی ہیں گے جو ہمیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“ یہ جیک تھا۔ چاروں دوستوں میں سب سے زیادہ خوبصورت اور بہادر لیکن وہ دور اندیش بھی تھا انہیں بذکرہ کام کرنے سے پہلے سو بار سوچنا اور اچھی طرح جائزہ لینا تھا اور اس کے بعد عمل کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس کی بات کو سمجھنا نہیں جانتا تھا اور اس بات پر سب سے زیادہ اعتراض راہبر نے کیا تھا۔ اس نے اپنی بھاری اور پیا پیا پر پورا بھروسہ تھا وہ سمجھتا تھا کہ اس میں جنگل میں آسانی سے شکار کر کے کھا اور اگر کسی درخت سے اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو وہ اس کے بھی اچھی طرح نمٹ لے گا۔

لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ جب سر پر آتی ہے تو سب دھڑکے گا اور وہ جاتا ہے جونی اور جیک کے سمجھانے کے باوجود وہ دونوں نے اسے تو بخیر انہیں بھی ان دونوں کا ساتھ دینا پڑا۔

”وہ لوگ جس وقت ہوئے تھے اس وقت دن کے دن بنگ رہے تھے۔ آسمان بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ کالے کالے ابدلیں ابدلیں سے وہاں اڑتے پھرتے تھے۔ غنڈی وہاں بہت کھلی ٹھوس ہو رہی تھی۔ لیکن یہ تمام روکشی ہاڑس سے پہلے تک کی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ہاڑس کے دوران اور بعد میں جنگلات میں کسی مشکلات کا سامنا کرنا

پڑتا ہے اور اس وقت آسمان کو دیکھ کر یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ میس پڑنے کو بے تاب ہو۔ کالے بالوں کی وجہ سے دن میں بھی اس کا سامنا تھا اور جنگل میں درختوں کی بہتائی کی وجہ سے اور کئی غیر محسوس ہاڑس ہوا تھا۔ بہر حال ان کے پاس یاد رکھنا تھا ہر چہ موجود تھیں اور ہر خطرے سے نمٹنے کے لئے ممکنہ حد تک سامان بھی تھا۔

اس لئے انہیں ان چیزوں کی کوئی فکر نہیں تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے سر کے بعد وہ جنگل کی حدود میں داخل ہو گئے۔ جنگل بہت خوبصورت نقش و نما پر ہوا تھا اور چھوٹے چھوٹے خوبصورت جانور اور کچھ بہت ہی بڑے کچھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے سر سے اس کی تصویریں بنانی شروع کر دیں۔ جوں جوں ان کی جیب آگے بڑھتی جاتی تھی جنگل گہرا ہوتا جا رہا تھا اور ساتھ ہی اندھیرے کی وجہ سے انہیں گاڑی کی ہیل لائٹ روشن کرنا پڑی۔

وہ سب دھکی سب سے آگے پاس کے مناظر دیکھ رہے تھے۔ اندھیرا تو تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ وہ کچھ دیکھ نہ پاتے۔ اچانک ابدل اچھے زور سے گزرا گئے کے جیب ڈیڑھ گھنٹہ گزرتے ہوئے جونی کے ہاتھ ایک لمحہ کے لئے جیب سے اچھے راستے سے اتر کر کچھ درختوں کی طرف دوڑ پڑی تھی۔ جونی نے خود کو سنبھالا اور دوڑنی مشکل سے بریک لگائے ورنہ وہ چپ درخت سے گرا جاتی اور ان کو بہت نقصان پہنچتا۔

”بھول کر جونی..... کیا تم بالوں کے گر جانے سے ڈر گئے؟“ جی نے ان کے تھوڑی بھاری کی۔ ”راہبر نے فطرے پر ہوا آواز سن کر کہا تو جونی کو غصہ آ گیا اور وہ غصے سے بولا۔

”تم اپنی زبان کو قابو میں رکھو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“
”ہیک! تم دونوں لڑو تو موت۔“ جونی تمہیں کہہ کر جب کچھ کو آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف لے جاؤ، میں نیچے اتر کر نہیں تھکتا۔“ یہ جیک کی آواز تھی۔

جونی نے اٹھاتے میں سر ہلایا تو جیک جیب سے ہچم اتر آ رہا اور جونی کو ہدایت دینے لگا۔ جونی نے آہستہ آہستہ ڈیڑھ گھنٹہ گزرتے ہوئے جیک کی ہدایات پر عمل کیا تو ٹھوڑی دیر بعد وہ اسی راستے پر تھے لیکن آگے بڑھنے کے بجائے وہ جیں تک گیا اور گھٹن سناڑاں میں بولا۔

”میرا خیال ہے میرے آگے بڑھنا مجارے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔ ایسا کرنے میں اب وہاں ملے ہیں اور موسم جب ٹھیک ہوا تو دوبارہ آئیں گے۔“ اس کی بات سن کر جیک نے اس کی پاس میں ہاں ملائی لیکن جی نے اور راہبر متھے سے کھڑکے۔

”ہرگز نہیں! ہم اب بالکل وہاں نہیں جائیں گے جو ہوگا۔“ کہتے گئے۔ یہاں ہمیں ہوئی میں آرام کرنے نہیں بلکہ ہر طرح کے خطرے سے بچنا ہے۔ جیک کی سر کے آگے میں آئے اور دوسرا ہم نے جنگل میں جھانک کر کھانے پانے کو بچھ کر کے آگے سے خطرناک کے مقابلہ شروع کر دیں پورا ایک دن کھانا بن کر کھا کھا۔

مزید بحث کی بجائے جی نے اس کے دونوں بھی چپ ہو گئے کہ ”اب اس کی سر میں بڑھنا تو مومن سے کیا ناسا۔“
بالوں کے گر جانے میں شدت آگئی تھی اور بجلی بھی بار بار چمک رہی تھی جس کا اعلازہ انہیں درختوں کے درمیان سے آنے والی دھندلے کی روشنی سے ہوا۔
جی کی جیب آہستہ آہستہ کے بعد دھری میں کچھ راستے پر مہارت سے جیب چلائی پڑتی ہے تاکہ سرنگ کے اوپر درختوں سے ٹکرانے سے بچا جائے۔

اچانک انہیں محسوس ہوا کہ جیسے جیب کی چمٹ پر کوئی وزن کی شری ہو اگلی وہ اس بار سے میں ٹھوس کر رہے تھے کہ پھر تو جیسے چمٹ پر وزن چیزوں کی ہاڑس شروع ہو گئی۔ انہیں کچھ بھی نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟

جیک ابھی باہر نکلے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی نظر ٹھٹھے سے باہر درخت پر پڑی۔ اس نے دیکھا کہ جس درخت کے چمچان کی جیب کھڑی ہے اس درخت سے

سائپوں کی ہاڑس ہو رہی ہے۔ درخت سے سانپ بہت بڑی اندویش میں گر رہے تھے اور بہت انگیز بات تو یہی کہ وہ بہت زیادہ قدوں میں ہونے کے باوجود صرف جیب پر ہی گر رہے تھے۔ سائپوں کے منہ سے نکلنے والی پھنکار میں دل دہلائے دے رہی تھیں۔

وہ سب بہت پریشان تھے۔ ابھی وہ کچھ سوچ بھی نہ پائے تھے کہ اچانک ایک سانپ کے ساتھ اوپر سے ایک شاخ ٹوٹ کر گر کر اور شیشو ٹوٹ گیا تو وہ سانپ اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے لگا اب تو وہ بہت بڑھاواں ہو گئے۔

جی نے جج کر جونی کو جیب چلانے کا کہا اور راہبر نے اپنا بیک ٹھٹھے کے ساتھ لگا دیا تاکہ سانپ اندر داخل نہ ہو پائے۔

جونی نے بدحواسی میں جیب اسٹارٹ کی اور چلاری سے وہاں سے جیب نکال لے گا۔ وہ دیکھ بہت تنگ کی تھی اور جب کوہاں سے نکلے گا تو مشکل تھا لیکن جونی بہت مہارت سے جیب کو وہاں سے آگے لے جانے لگا۔

اچانک دوسری طرف کا شیشہ بھی ٹوٹنے کی آواز آئی۔ جیک نے بھی راہبر کی تقلید میں اپنا بیک ٹھٹھے سے ڈھکا دیا اور جونی کو جیب بھگانے کا کہا۔ جونی نے جیب کی رفتار میں اضافہ کر کے راستے پر جیب کو بہت جھٹکے لگے کہ رہے تھے اور ان جھٹکوں کی وجہ سے وہ سانپ نیچے گئے۔ بارے پڑتے یہ راہبر کی کہ وہ چاروں بھی گمان جھگوس سے بدحال ہو رہے تھے۔

جیب بہت آگے آچکی تھی اور ٹھٹھے پر کوئی سانپ نظر نہیں آ رہا تھا اس لئے جونی نے جیب کی رفتار بڑھ کر لی۔ جیک اور راہبر نے بھی اپنے پیچھے شیشوں سے ہٹائے۔ سائپوں کے جان چھوٹنے پر انہوں نے شکر ادا کیا اور اپنی اپنی آہستہ بہت بھگت کر بیٹھ گئے۔

ابوالباب مسئلہ حل کر رہے تھے۔ کچھ راستے پر کچھ کی وجہ سے انہیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا اور اب انہیں درختوں سے ڈھکے گا اور یہ بھی تھا

اس خدشے کے پیش نظر انہوں نے اپنی راکٹیں اپنے ہاتھ میں لیں۔ ایک ایک جھکے سے جب تک کہ انہوں نے سوائیلنٹوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بھران کی نظر سامنے راستے پر پڑی۔ اور جو کہ انہوں نے دیکھا اس نے انہیں سہکت کر دیا۔

انہوں نے دیکھا کہ دو شیر اسی راستے پر کھڑے ہیں جہاں سے وہ گزرنے والے تھے۔ ان شیروں کی نظریں ان کی جب پر نہیں۔ اور وہ یوں انکر کھڑے تھے جیسے اس جیب اور اس میں ہونے والوں کی انہیں کوئی پرواہ نہ ہو۔ اور یہ حقیقت بھی شیروں نے بہت پہلے ہی انسانی ہوش سمجھ لی تھی۔ وہ جاریہ پرنسپل ان تو ہو گئے تھے لیکن یہ سوچ کر انہیں اطمینان تھا کہ ان کے پاس جدید راکٹیں تھیں اور وہ اس سے پہلے انہیں دیکھ گئے۔ ابھی وہ اس جیب میں تھے کہ وہ دونوں شیریں دور سے عازن سے ان کی جیب بھٹکا کھا کر وہ ان کے دل اتنے زور سے ہڑک رہے تھے جیسے ابھی پھلیاں تو ذکر بابر لگ آئیں گے کی شیر سے سامنا کیا کہ کاپ پھلانچ رہا۔ وہ سب دل میں خوف وہ تو تھے لیکن ایک دوسرے پر غارت نہیں کر رہے تھے۔ پھر ایک ان شیروں نے اس جیب پر چھلانگ لگادی۔ ایک شیر جیب کی پیٹ پر چڑھ گیا اور دوسرا چھلانگ مار مار کر شیشوں کو توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ جیب اتنے زور سے اٹل رہی کہ یوں لگتا تھا کہ کڑی کرہٹ ہے۔ اس کی دقت، جیسے کہ تمام کارکن کی جیب گر جاتی یا وہ شیر اس کے شیشے توڑنے میں کامیاب ہو جاتا تو ان کا چپکا کس صورت میں ممکن نہیں تھا۔

”مارٹن جلد ہی سے اپنی راکٹیں لوڈ اور شیر پر قاز کر دے۔“ جیک نے بیچ کر مارٹن کو ہدایت دی تو مارٹن نے فوراً اپنی ہندوق اضافی اور ٹوٹے ہوئے شیشے میں اس کی نال لگادی۔ اب اسے شیر کا انتظار تھا کہ وہ اس طرف آتا ہے۔ جیب کے پٹنے کی وجہ سے وہ توازن قائم نہیں رکھ پارہے۔ جیسے کہ سب پر ادھر ہو جائے اور جی ادھر۔ شیر اب اس طرف بڑھتا تھا جہاں مارٹن نے راکٹس سے اسی کا نشانہ بنایا تھا۔

مارٹن فوراً سیدھا ہو گیا لیکن شیر کو بھی خطرے کی بو آگئی تھی وہ زور سے غریبا اور چھلانگ مار کر شیشے پر چھاپا جہاں مارٹن نے داخل ہوئی تھی اور شیر کے پٹے جھانسنے لگا جاتے تو شیشہ ایک جھٹکے سے ٹوٹ جاتا۔ اس نے جیسے ہی شیر نے چھلانگ لگائی مارٹن نے فوراً ایک بعد دوسرے قاز کر دیئے اور شیر ایک بے یار و آزاد گال کر دیں پھر ہو گیا۔

دوسرا شیر بھی اپنے ساتھی کی حالت دیکھ کر چھلانگ مار کر سامنے آیا۔ وہ جھٹکے بھی نہ پایا تھا کہ مارٹن نے اس پر قاز کر کے اسے بھی لہا لہا دیا۔

دونوں شیر بے حس و حرکت پڑے تھے اور وہ شکرانہ کر رہے تھے کہ انہوں نے دوسرا دھڑک کر سر کر لیا تھا۔ جونی نے جیب اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی وہ چاروں خاموش تھے لیکن انہوں نے ان نظروں سے دیکھ کر وہ ایک ایک انہیں اور دوشنی ہی محسوس ہوئی اور ان کی آواز بھی سنائی دینے لگی وہ چوہے ہو گئے۔ درخت آہستہ آہستہ کم ہو رہے تھے۔ اور وہ نسبتاً ایک لمبی جگہ پر آگئے تھے۔ انہیں ایک رہا تھا جیسے وہ کسی قید خانے سے رہائی لانے کے بعد ایک کھلے آسمان سے آگئے ہوں۔ لیکن اب یہ مشکل کی کہ بارش کی وجہ سے کچا راستہ بچھڑا اور وہ چھلانگ مار کر چھلانگ سے بڑی مشکل ہو رہی تھی۔ جونی بہت ابھی ڈرائیو تک کر لیتا تھا کہ وہ ایک تھک وہ کی کچھ پھینٹے ہوئے اور ان کا نشانہ بننا مشکل ہوتا، جونی اب جیب کو بہت آہستہ آہستہ اور احتیاط سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

وہاں آکر اس نے مارچ کی مدد سے اس گڑیا کو ابھی طرح دیکھا وہ دوش کی کٹی ہوئی چھوٹی سی لیکن بہت سخت لڑا بھی، بظاہر اس میں اس کی کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن دوش کی کامیابی تک جو حیرت میں جتا کر باہاساں نے بہت سوچا لیکن اسے کوئی بات سمجھ نہیں آئی۔ اس نے دونوں کی طرف دیکھا وہ سب بے مدد پڑے تھے۔ وہ بھی سوچنے کے لیے لیٹ گیا۔ گڑیا نے اسے نہیں دیکھ کر بجائے اپنی مٹی میں بند کر دیا۔ آٹھ گھنٹوں کے بعد اسے دو خوشوں کے جن کے نیچے خشکی تھی۔ ایک ابھی دو خوش انہوں نے ختب کیا اور اپنا سامان اس کے ساتھ لے کر دو اور خوشی بیٹھ گئے۔ وہاں شوہن تھی۔ پر دونوں کی گڑیاں اور ہر قسم کے جامدوں کی آوازوں نے ایک ایک ماساں پیدا کر دیا تھا۔ ان کے پاس چاروں تھیں جو انہوں نے دیکھ کر لی گئیں۔ ان کو بھوک بھی تھی مٹی کے انہوں نے کھانے کے ڈبے لگائے اور کھانا شروع کر دیا۔ کھانے کے بعد وہ سونے کے لیے لیٹ گئے۔ رات کے کسی پہر جب کہ ایک کھانے لگی۔ آٹھ گھنٹے کی بجائے کچھ نہیں آئی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اور دیکھ رہا تھا، اب ایک اس کی نظر ایک جگہ جا کر رک گئی۔ وہاں ایک دوشی کا دائرہ تھا۔ جو ایک ہی جگہ تھا اور کوئی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ جبکہ بہت محسوس ہوا۔ اس نے تاج اضافی اور دوشنی کی جانب جیب پر اندر سے دست بے خبر سونے ہوئے۔ وہ جلد ہی اس دوشنی تک پہنچ گیا اور اس نے جو کچھ دیکھا وہ اسے حیران کر دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی گڑیا تھی جو زمین پر پڑی ہوئی تھی اور دیکھ کر جبکہ اس طرف آیا تھا۔ اسی گڑیا نے دوشی بھونڈی دی تھی۔ وہ بہت حیران ہوا اور جیسے جگہ کر گڑیا کا تھا۔

حیرت انگیز طور پر جیسے ہی اس نے گڑیا کو ہاتھ میں لیا وہ دوشی جو اس کے بدن سے پھوٹ رہی سی ٹیخت ثابت ہوئی وہ گڑیا اتنی چھوٹی تھی کہ آسانی سے ہاتھوں میں چپ جاسکتے۔ جبکہ اسے ہاتھ میں لیا اور دیکھ کر اپنا جگہ پر آگیا۔

وہاں آکر اس نے مارچ کی مدد سے اس گڑیا کو ابھی طرح دیکھا وہ دوش کی کٹی ہوئی چھوٹی سی لیکن بہت سخت لڑا بھی، بظاہر اس میں اس کی کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن دوش کی کامیابی تک جو حیرت میں جتا کر باہاساں نے بہت سوچا لیکن اسے کوئی بات سمجھ نہیں آئی۔ اس نے دونوں کی طرف دیکھا وہ سب بے مدد پڑے تھے۔ وہ بھی سوچنے کے لیے لیٹ گیا۔ گڑیا نے اسے نہیں دیکھ کر بجائے اپنی مٹی میں بند کر دیا۔ آٹھ گھنٹوں کے بعد اسے دو خوشوں کے جن کے نیچے خشکی تھی۔ ایک ابھی دو خوش انہوں نے ختب کیا اور اپنا سامان اس کے ساتھ لے کر دو اور خوشی بیٹھ گئے۔ وہاں شوہن تھی۔ پر دونوں کی گڑیاں اور ہر قسم کے جامدوں کی آوازوں نے ایک ایک ماساں پیدا کر دیا تھا۔ ان کے پاس چاروں تھیں جو انہوں نے دیکھ کر لی گئیں۔ ان کو بھوک بھی تھی مٹی کے انہوں نے کھانے کے ڈبے لگائے اور کھانا شروع کر دیا۔ کھانے کے بعد وہ سونے کے لیے لیٹ گئے۔ رات کے کسی پہر جب کہ ایک کھانے لگی۔ آٹھ گھنٹے کی بجائے کچھ نہیں آئی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اور دیکھ رہا تھا، اب ایک اس کی نظر ایک جگہ جا کر رک گئی۔ وہاں ایک دوشی کا دائرہ تھا۔ جو ایک ہی جگہ تھا اور کوئی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ جبکہ بہت محسوس ہوا۔ اس نے تاج اضافی اور دوشنی کی جانب جیب پر اندر سے دست بے خبر سونے ہوئے۔ وہ جلد ہی اس دوشنی تک پہنچ گیا اور اس نے جو کچھ دیکھا وہ اسے حیران کر دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی گڑیا تھی جو زمین پر پڑی ہوئی تھی اور دیکھ کر جبکہ اس طرف آیا تھا۔ اسی گڑیا نے دوشی بھونڈی دی تھی۔ وہ بہت حیران ہوا اور جیسے جگہ کر گڑیا کا تھا۔

حیرت انگیز طور پر جیسے ہی اس نے گڑیا کو ہاتھ میں لیا وہ دوشی جو اس کے بدن سے پھوٹ رہی سی ٹیخت ثابت ہوئی وہ گڑیا اتنی چھوٹی تھی کہ آسانی سے ہاتھوں میں چپ جاسکتے۔ جبکہ اسے ہاتھ میں لیا اور دیکھ کر اپنا جگہ پر آگیا۔

وہاں آکر اس نے مارچ کی مدد سے اس گڑیا کو ابھی طرح دیکھا وہ دوش کی کٹی ہوئی چھوٹی سی لیکن بہت سخت لڑا بھی، بظاہر اس میں اس کی کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن دوش کی کامیابی تک جو حیرت میں جتا کر باہاساں نے بہت سوچا لیکن اسے کوئی بات سمجھ نہیں آئی۔ اس نے دونوں کی طرف دیکھا وہ سب بے مدد پڑے تھے۔ وہ بھی سوچنے کے لیے لیٹ گیا۔ گڑیا نے اسے نہیں دیکھ کر بجائے اپنی مٹی میں بند کر دیا۔ آٹھ گھنٹوں کے بعد اسے دو خوشوں کے جن کے نیچے خشکی تھی۔ ایک ابھی دو خوش انہوں نے ختب کیا اور اپنا سامان اس کے ساتھ لے کر دو اور خوشی بیٹھ گئے۔ وہاں شوہن تھی۔ پر دونوں کی گڑیاں اور ہر قسم کے جامدوں کی آوازوں نے ایک ایک ماساں پیدا کر دیا تھا۔ ان کے پاس چاروں تھیں جو انہوں نے دیکھ کر لی گئیں۔ ان کو بھوک بھی تھی مٹی کے انہوں نے کھانے کے ڈبے لگائے اور کھانا شروع کر دیا۔ کھانے کے بعد وہ سونے کے لیے لیٹ گئے۔ رات کے کسی پہر جب کہ ایک کھانے لگی۔ آٹھ گھنٹے کی بجائے کچھ نہیں آئی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اور دیکھ رہا تھا، اب ایک اس کی نظر ایک جگہ جا کر رک گئی۔ وہاں ایک دوشی کا دائرہ تھا۔ جو ایک ہی جگہ تھا اور کوئی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ جبکہ بہت محسوس ہوا۔ اس نے تاج اضافی اور دوشنی کی جانب جیب پر اندر سے دست بے خبر سونے ہوئے۔ وہ جلد ہی اس دوشنی تک پہنچ گیا اور اس نے جو کچھ دیکھا وہ اسے حیران کر دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی گڑیا تھی جو زمین پر پڑی ہوئی تھی اور دیکھ کر جبکہ اس طرف آیا تھا۔ اسی گڑیا نے دوشی بھونڈی دی تھی۔ وہ بہت حیران ہوا اور جیسے جگہ کر گڑیا کا تھا۔

حیرت انگیز طور پر جیسے ہی اس نے گڑیا کو ہاتھ میں لیا وہ دوشی جو اس کے بدن سے پھوٹ رہی سی ٹیخت ثابت ہوئی وہ گڑیا اتنی چھوٹی تھی کہ آسانی سے ہاتھوں میں چپ جاسکتے۔ جبکہ اسے ہاتھ میں لیا اور دیکھ کر اپنا جگہ پر آگیا۔

وہاں آکر اس نے مارچ کی مدد سے اس گڑیا کو ابھی طرح دیکھا وہ دوش کی کٹی ہوئی چھوٹی سی لیکن بہت سخت لڑا بھی، بظاہر اس میں اس کی کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن دوش کی کامیابی تک جو حیرت میں جتا کر باہاساں نے بہت سوچا لیکن اسے کوئی بات سمجھ نہیں آئی۔ اس نے دونوں کی طرف دیکھا وہ سب بے مدد پڑے تھے۔ وہ بھی سوچنے کے لیے لیٹ گیا۔ گڑیا نے اسے نہیں دیکھ کر بجائے اپنی مٹی میں بند کر دیا۔ آٹھ گھنٹوں کے بعد اسے دو خوشوں کے جن کے نیچے خشکی تھی۔ ایک ابھی دو خوش انہوں نے ختب کیا اور اپنا سامان اس کے ساتھ لے کر دو اور خوشی بیٹھ گئے۔ وہاں شوہن تھی۔ پر دونوں کی گڑیاں اور ہر قسم کے جامدوں کی آوازوں نے ایک ایک ماساں پیدا کر دیا تھا۔ ان کے پاس چاروں تھیں جو انہوں نے دیکھ کر لی گئیں۔ ان کو بھوک بھی تھی مٹی کے انہوں نے کھانے کے ڈبے لگائے اور کھانا شروع کر دیا۔ کھانے کے بعد وہ سونے کے لیے لیٹ گئے۔ رات کے کسی پہر جب کہ ایک کھانے لگی۔ آٹھ گھنٹے کی بجائے کچھ نہیں آئی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اور دیکھ رہا تھا، اب ایک اس کی نظر ایک جگہ جا کر رک گئی۔ وہاں ایک دوشی کا دائرہ تھا۔ جو ایک ہی جگہ تھا اور کوئی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ جبکہ بہت محسوس ہوا۔ اس نے تاج اضافی اور دوشنی کی جانب جیب پر اندر سے دست بے خبر سونے ہوئے۔ وہ جلد ہی اس دوشنی تک پہنچ گیا اور اس نے جو کچھ دیکھا وہ اسے حیران کر دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی گڑیا تھی جو زمین پر پڑی ہوئی تھی اور دیکھ کر جبکہ اس طرف آیا تھا۔ اسی گڑیا نے دوشی بھونڈی دی تھی۔ وہ بہت حیران ہوا اور جیسے جگہ کر گڑیا کا تھا۔

وہاں آکر اس نے مارچ کی مدد سے اس گڑیا کو ابھی طرح دیکھا وہ دوش کی کٹی ہوئی چھوٹی سی لیکن بہت سخت لڑا بھی، بظاہر اس میں اس کی کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن دوش کی کامیابی تک جو حیرت میں جتا کر باہاساں نے بہت سوچا لیکن اسے کوئی بات سمجھ نہیں آئی۔ اس نے دونوں کی طرف دیکھا وہ سب بے مدد پڑے تھے۔ وہ بھی سوچنے کے لیے لیٹ گیا۔ گڑیا نے اسے نہیں دیکھ کر بجائے اپنی مٹی میں بند کر دیا۔ آٹھ گھنٹوں کے بعد اسے دو خوشوں کے جن کے نیچے خشکی تھی۔ ایک ابھی دو خوش انہوں نے ختب کیا اور اپنا سامان اس کے ساتھ لے کر دو اور خوشی بیٹھ گئے۔ وہاں شوہن تھی۔ پر دونوں کی گڑیاں اور ہر قسم کے جامدوں کی آوازوں نے ایک ایک ماساں پیدا کر دیا تھا۔ ان کے پاس چاروں تھیں جو انہوں نے دیکھ کر لی گئیں۔ ان کو بھوک بھی تھی مٹی کے انہوں نے کھانے کے ڈبے لگائے اور کھانا شروع کر دیا۔ کھانے کے بعد وہ سونے کے لیے لیٹ گئے۔ رات کے کسی پہر جب کہ ایک کھانے لگی۔ آٹھ گھنٹے کی بجائے کچھ نہیں آئی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اور دیکھ رہا تھا، اب ایک اس کی نظر ایک جگہ جا کر رک گئی۔ وہاں ایک دوشی کا دائرہ تھا۔ جو ایک ہی جگہ تھا اور کوئی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ جبکہ بہت محسوس ہوا۔ اس نے تاج اضافی اور دوشنی کی جانب جیب پر اندر سے دست بے خبر سونے ہوئے۔ وہ جلد ہی اس دوشنی تک پہنچ گیا اور اس نے جو کچھ دیکھا وہ اسے حیران کر دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی گڑیا تھی جو زمین پر پڑی ہوئی تھی اور دیکھ کر جبکہ اس طرف آیا تھا۔ اسی گڑیا نے دوشی بھونڈی دی تھی۔ وہ بہت حیران ہوا اور جیسے جگہ کر گڑیا کا تھا۔

”بھلو! میں تمہارا درویش نہیں جو یوں تم لوگ آرام سے سو کر بادل چلائے دروازوں کے دھڑکنے کی طرح مسلسل ڈرا کر رہو۔“ جونی کی بات سن کر وہ ہنس پڑے۔ ”جی ہولہ۔“ ”یاد میں تو پیہ پی نہیں چلا کب آگھ گی۔“ دینے میرا خیال سب کھانا کھا کر باقی کا سفر شروع کریں گے۔“ اس کی بات پر سب نے انہات میں ملایا اور کھانا کھا کر سفر شروع کر دیا۔

وہ چاروں حیران و پریشان آس پاس دیکھ رہے تھے انہیں جینٹیل آرہا تھا کہ سب کیا ہے بہت سارے جنگلی اچانک کہیں سے آگئے تھے اور ان کی چپ کے چاروں طرف دائرہ کش کی صورت میں کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کے اقبوں میں نیزے، بھالے اور گولاریں تھیں اور وہ کسی باندھان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ بائیں چاروں نے جنگلوں کے دو ٹکڑوں کے بارے میں کہی تھیں۔ ایک ایک کر کے ان کے ذہن میں آ رہی تھیں کہ یہ قبیلے کتنی دشتی ہوتے ہیں اور جنگل میں بھگنے والے انسانوں کو اپنے قبیلے میں لے جا کر آگ پریموں کر کھاتے ہیں۔ بظاہر تو وہ بھی انسان ہوتے ہیں لیکن انسانیت سے قطعاً آگشتہ۔!

یہ بائیں انہیں سہانے دے رہی تھیں اور وہ آتے والے وقتوں سے لڑ رہے تھے۔ ان کے پاس اسلحہ ضرور تھا لیکن اس کے استعمال کا موقع نہیں تھا کیونکہ وہ دشتی اپنے زیادہ دتے نہ کر رہے تھے کہ وہ گولاریں دیتے تو بانی بچنے والے انہیں وقت سے پہلے مار دیتے اور وہ اس سے قریب پہنچ سکتے تھے کہ اگر وہ اسلحہ استعمال کرنے کی کوشش میں ہی ان کے نیزوں یا بھالوں کا شکار ہو سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے خود کو حالات کے نرم کریم پر چھوڑ دیا تھا۔ جبکہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گولاریں اور بھالوں اعزاز میں پینٹ کی جبب میں ڈال لیا تھا۔ نہ جانے اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ لیکن اسے یوں لگا تھا جیسے کسی نے اسے مجبور کیا ہوا ایسا کرنے سے لے۔

وہ دشتی انہیں آواز آنے کا اشارہ کرنے لگے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور چاروں چار

منچھڑا آئے۔ ان کے آترے ہی ان دشتیوں نے انہیں گھبرے میں لے لیا اور ایک ایسی آواز میں کہہ کر بولے ہوئے ایک طرف لے جانے لگے۔ شاید وہ انسانوں کو پکڑنے کی خوشی میں کچھ کہہ رہے تھے۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ اچانک ایک ایک ایک جگہ آگئے جہاں سامنے پانی نظر آ رہے تھے اور پانی بچنے کی آواز کی سنائی دے رہی تھی۔ وہ حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے کہ جنگل میں اچانک پھر کہاں سے آگئے؟ انہوں نے اس بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ دشتی انہیں لے کر ان کی جگہ آگئے جہاں بہت سی جموئیڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ ان دشتیوں کی بعضی قسم کی اور ان سے گولاریں اور ایک نئی بہرہ رسی تھی۔ ان دشتیوں کی آواز سن کر ان جموئیڑیوں نے بہت سے لوگ نکل آئے جو بیٹھ بڑھتے تھے ان میں بچے، بوڑھے اور عورتیں بھی شامل تھیں۔ انہوں نے چاروں طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں میں ایک دھندلہ چمک نمودار ہوئی۔ شاید وہ اپنے شکار کے شہر سے اور اسے دیکھتے ہی ان کے منہ سے پانی بہنے لگا تھا۔

وہ دشتی انہیں گھبرے میں لے ایک ایسی جموئیڑی کی طرف بڑھے جہاں سب جموئیڑیوں سے بڑی اور کسی قدر خوبصورت تھی۔ شاید وہ ان کے سرداری جموئیڑی تھی۔ وہ دشتی انہیں لے کر جموئیڑی کے باہر کھڑے ہوئے اور دروازے سے عجیب آواز میں بولے کہ ان دروازوں کو کھولنے کی ایک آوی ہمارا ایک ہاتھ دینا۔ گناہ اور ان کی طرف ایک جگہ میں بیٹھیں تو اس کے سر پر پردوں کے پردوں کا رخ تھا اور گنے گنے اس کے منکوں کا پار پہنا ہوا تھا۔ جیسے وہ اپنی جموئیڑی سے باہر آیا وہ جنگلی اسے دیکھ کر کھجور کے سے اعلیٰ میں جھک گئے۔ اس سردار نے ان کی طرف درزیدہ نظروں سے دیکھا اور اناتوں کی آواز میں کہہ بولے کہ جس کے جو اب میں اسے پکڑنے والوں نے بھی کچھ بتایا۔

یقیناً وہ اسے بتا رہے ہوں گے کہ انہوں نے انہیں کیسے اور کہاں سے پکڑا۔ اس کے بعد سردار نے انہیں کچھ کہا جسے سن کر وہ جنگلی انہیں ایک ایک طرف لے

جانے لگے۔ ان کا رخ بھڑیاؤں کی طرف تھا وہ پراستی کے بالکل اوپر واقع تھے ٹھوڑی جڑ چلنے کے بعد وہ ایسی جگہ پہنچے جہاں سامنے ایک عمارت کا ڈھانچہ نظر آ رہا تھا۔ کچھ گئے کاب انہیں یہاں قید کیا جائے گا۔ اچانک انہیں ہادل کے گرجنے کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا تو شمال کی جانب کالی گٹھا اٹھ رہی تھی، بادلوں کو دیکھ کر کھجور کا پار ہاتھ دینا بہت شدید ہو گیا۔ وہ جنگلی انہیں لے اس عمارت میں داخل ہو گئے۔ عمارت سے بہت کٹھا دور اور اس میں روشنی کا بھی خاطر خواہ انتظام نہیں کیا گیا۔ کھجور کا پار ہاتھ دینا وہ یہاں ضرورت کے تحت قیام کی کرتے ہیں۔ ان پھڑپھڑ میں اور بھی بہت سے عمارت تھیں۔

ان جنگلیوں نے ان لوگوں کو عمارت میں چھوڑا اور واپس جانے کے لئے کھڑے ٹھوڑی جڑ بعد وہ سب داخل جانے لگے۔ کچھ کے عمارت سے کچھ جگہاں گناہ پورے آسمان پر پھیل گئی تھی اور بار بار بادل بھی گرج رہے تھے اور بجلی چمک رہی تھی۔ ہستی کے پاس جوڑی کٹی ہوئی گز شینوں کی بادش کی وجہ سے زور و شور سے بہہ رہی تھی اگر آج بھاری طرح بارش ہوتی تو غرض تھا کہ اس کا پانی کناروں سے نکل کر پڑی کٹی ہوئی لپٹ میں لے سکتا تھا۔ شاید یہی خطرے کے پیش نظر ان جنگلیوں نے عمارت میں بھی اپنا قیام کر رکھا ہوا تھا۔

سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ انہوں نے عمارت کے دہانے پر کسی قسم کا پتھر نہیں لگایا تھا۔ شاید انہیں یقین تھا کہ دروازوں کھین فراموش ہو سکتے ہیں اور یہ حقیقت تھی کہ کچھ ایک طرف تو پہاڑ تھے اور سامنے ان جنگلیوں کی ہستی۔ ایک طرف عمارت تھی جسے بغیر کسی کے پائپن کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی ان ہستی والوں کی نظر سے کچھ کفر فرما سکتا تھا۔ اس لئے انہوں نے یہہہ لگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

جبکہ نے اپنی رشت و اق کی طرف دیکھا شام 5 بج رہے تھے لیکن گہرے بادلوں کی وجہ سے کھام شام کی رات کا سماں لگ رہا تھا۔ ہر جموئیڑی میں دینے روشن

ہو چکے تھے۔ اچانک بجلی بہت زور سے کڑکی اور اس کی چمک آسمان کے ایک کسے سے دوسرے سے تک بجلی کٹی اور اس کے ساتھ ہی زوردار بارش شروع ہوئی۔ بارش اپنی تیز تھی کہ ایسا لگ رہا تھا کہ آسمان کا منہ کھل گیا۔ وہ سب ایک بے درد دشتوں کے پاس واپس آ گیا تھا۔ وہ سب ناش ویران تھے۔ جبکہ نے اپنی جیب سے وہ گڑیا نکالی اور اسے اچھٹھ میں لے لیا۔ ابھی تک کچھ ایسا کھا رہیں ہوا تھا بچے دیکھ کر کہ اس گڑیا کو چاؤ دینے لگے۔

جبکہ نے گڑیا کو دیوار کے پاس رکھ دیا اور خود بھی چمچر لی دیوار سے لٹک کر کھینڈ گیا۔ ہر جھرت کھینڈ پر وہی ہوا جو پہلے جنگل میں ہو چکا تھا۔ اس گڑیا کو زمین پر رکھتے ہی وہی بوٹنی کا بازو اس کے گرد بن گیا۔

وہ دیکھتے دیکھتے ان کے نزدیک آئے اور غور سے دیکھنے لگے۔ انہوں نے دیکھا کہ اس گڑیا کی آنکھیں بالکل زندہ انسانوں جیسی ہو گئی تھیں اور ان سے شاعیں نکل کر ان سب دشتوں کی آنکھوں پر پڑیں۔ ایک لمبے کوڑا انہیں نظر آنا بالکل بند ہو گیا اور دوسرے ہی لمحے وہ پہلی سیٹھ بادل حالت میں تھے وہ جہاں تھے کہ یہ کیا ہوا۔ اچانک گڑیا کے کباب بے اور جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ کھڑکڑی ہو گئی۔ وہ سارے نظروں سے اس گڑیا کی طرف دیکھ رہے تھے۔

دشتوں پر پشیمان تھے وہ سن تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گی بلکہ تم لوگوں کی مدد کرو گی۔ چونکہ تم لوگ مجھے جنگل سے بے گناہت اپنے ساتھ لائے ہو اس لئے میں بھی تم لوگوں کی حفاظت کروں گی۔ یہ قبیلہ ”جن“ کی قید میں ہوا ہے بہت دشتی ہیں یہ آدم خور ہیں اور جو بد نصیب بھی مجھ سے بھولے بھگتے سے اصرار نکلتا ہے اسے جا پانی خوراک پانیاتے ہیں۔ اسے آگ پر بھون کر کھاتے ہیں۔ اور تم لوگ بھی انہی بد نصیبوں میں سے ہو جاؤ گے اگر میرا ساتھ تم لوگوں کو میسر نہ ہوتا۔ ان کا ایک جادوگر ہے جو ان دشتیوں کو اپنے اشاروں پر چلتا ہے۔ اس قبیلے کے جس قسم کے قیدی ہیں وہی جادوگر نے مجھے قید کر کے اس گڑیا میں بند کر دیا۔

وہ بہت بڑا مادوگر ہے اس نے ایک گھاناؤٹس سے مجھے اپنا غلام بنایا اور مجھ سے طرح طرح کے گھسیا کام لینے لگا۔ پھر جب میں نے انکار کیا مجھے ہمیشہ کے لئے تھوکر کے اس جھگل میں چھپک دیا تاکہ کوئی انسان مجھ نہ چھو سکے۔ کیونکہ جیسے ہی کوئی انسان مجھ سے ملتا تھا وہ قید سے رہا جاتا اور اس کے خلاف جو چاہے کرتی۔

جھگل کا وہ ایسا حصہ تھا جہاں شاید ہی کوئی بھی انسان گیا ہو۔ پھر جادوؤں کے آنے جانے سے میں ان کے بیروں کی ٹھوکروں کی وجہ سے اس جگہ گئی۔

جہاں سے ہم لوگوں نے مجھے اٹھایا اور مجھے آزادی بخش فوٹ مل گئی۔ اب میں اپنا اپنا غلام ضرور کروں گی اور تم لوگوں کو بخشتا تھا میری منزل تک پہنچانوں گی ورنہ اگر میرا ساتھ تم لوگوں کو نہ ملتا تو کل دن ہوتے ہی تم لوگوں کو زندہ جلایا جاتا اور پھر پورا اٹھاتا تھا۔

گوشت سے لطف اٹھاتا۔ اس گڑیا کے منہ سے نکلنے والی آواز نے انہیں سنا دیا اور آخری بات پر وہ سب جھرجھری لے کر رہ گئے۔

”کیا تم جنتا کے قہیلے سے تعلق رکھتی ہو؟“ ”جی ہاں“ ”پوچھا تو جوابا ملتی۔“ ”ایسی ہی تھو۔“

ان دنیا میں انسانوں اور جنتا کے علاوہ اور بھی بہت سی مخلوقات ہیں، میرا تعلق بھی انہی سے ہے۔

”میں سمجھ نہیں آ رہی کہ جب آپ آزاد ہوئیں تو آپ ان آسمانوں سے کب نہیں کلن کر مہاری آسمانوں میں آئیں جس اور کچھ دیر میں ہم کھانسی لگائیں نہیں دیتا۔ کیا آپ نہیں بتا سکتی ہیں کہ وہ کیا تھا؟“ ”راہت کا لہجہ ایسے اندر مکمل احترام سے ہونے لگا۔“

”کیا تم لوگ غور نہیں کر رہے کہ ایک انجینی زبان تم لوگ کتنی آسانی سے بول رہے تھے؟“ ”ہاں میں نے وہ سب اس وجہ سے کیا تھا کہ تم لوگوں کو آسانی سے ابھی دبا میں سمجھ سکتا تھا۔ جب تم لوگ ان جھگیوں سے لوٹے تو ان زبان ان آسانی سے تم لوگوں کی سمجھ میں آ جانے کی اور تم خود بھی ان جیسا بول سکتے۔“ ”گھڑیا نے انہیں ساری تفصیل سے آگاہ کیا۔ اور یہ واقعی حیرانگی کی بات تھی کہ وہ

جادوئی گڑیا ایک انجینی زبان میں بول رہی تھی لیکن وہ سب اسے آسانی سے سمجھ رہے تھے۔ پھر اس جادوئی گڑیا نے انہیں آسان کرنے کے لئے کہا اور خود بھی یہ جان ہوئی۔

اب سب نے حیرانگی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور وہ سونے کے لئے لیٹ گئے۔

دوسری گڑیا نے آگاہ کیا کہ وہ اپنی آوازوں سے مکمل گئی بہت سے جھگی ان کے لوہے جیسے ہوئے انہیں اٹھانے میں لگے ہوئے تھے جب وہ مکمل طور پر بیدار ہو گئے تو انہیں لے اس کشتی کی طرف بڑھ گئے۔

انہوں نے ایک نظری کی طرف دیکھا جو پورے جوش و خروش سے بہہ رہی تھی۔ رات ہونے والی بارش نے پانی کی سطح پر خطرناک حد تک اضافہ کر دیا تھا۔

پاول ابھی وہاں موجود تھے اور موسم بہت خوشگوار تھا۔

جب وہ کشتی میں داخل ہوئے تو سب جھگی ایک جگہ جمع تھیں۔ کشتی ان کے چہروں پر بے چاروں کی طرح لگتا تھا کہ بہت عرصے بعد انہیں انسانی دنیا میں آکر ملے۔

وہ بھی چارے چارے کئے لو جانوں کا۔ جب وہ کشتی میں داخل ہوئے تو ان آدم خوروں نے اوچی اوچی آواز میں نعرے لگانے شروع کر دیے۔ ان کا سردار اور وہ جادوگر جس نے قیدی گڑیا کو جھگل میں چھپکا تھا وہاں موجود تھے۔ ایک طرف آگ کا بڑا سارا لاڈ لہو تھا۔

جوشیا اب جادوؤں کو کھونٹے کے لئے تیار کیا تھا۔

اس آگ کو دیکھ کر ان میں خوف کی گہرہ دھڑکی۔ انہیں اپنی موت بہت قریب محسوس ہو رہی تھی۔ ان کے ذہن سے اس گڑیا کا خیال نکل گیا تھا۔

ایک ایک سردار نے ان کو ایک مخصوص اشارہ کیا جس کے نتیجے میں کچھ آدم خور ان کی طرف بڑے شاید انہیں آگ میں پھینکنے کے لئے۔

ابھی وہ کچھ دیر چلے ہی تھے کہ پانی کا ہیمائیک شور مٹا دیا۔ جسے سننے ہی ایک بلی کو ہر طرف خاموشی چھا کر اور دوسرے ہی لمحے ان میں بھگدڑ مچ گئی۔

”کی ٹوٹ گئی۔“ ”کی ٹوٹ گئی۔“

ایک ایک جادوؤں جادوؤں کو اس گڑیا کی آواز سنائی دی

..... ”تم لوگ فوراً یہاں کی طرف بھاگو اور اسی عمارت میں چلے جاؤ جہاں تم لوگوں کو تیار کیا تھا۔ جلدی کرو۔“

اس گڑیا کی آواز سننے ہی وہ چاروں بھاگ کر اس عمارت کی طرف بڑھے اور جلد ہی وہ سب اس عمارت میں تھے۔ یہاں پہنچنے پر کھڑے ہوئے انہوں نے دیکھا کہ ندی کا پانی چٹکاتا ہوا پتھری کی کٹ پٹی لیٹ میں لے چکا تھا ان جھگیوں کو بدحواسی میں وہ پہاڑی عمارت بھی یاد نہیں رہے تھے جہاں وہ سیلاب کے پانی سے بچنے کے لئے بنائے گئے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں پوری کشتی پانی میں ڈوب گئی اور اس کا کہیں بھی نام و نشان نہ رہا۔ وہ چاروں خوفزدہ غمخواروں سے اس پانی کی کڑکھڑاتے ہوئے کشتی کو دیکھنے میں بے حد پر سکون ہو چکا تھا اور ندی کی تہائی والی حالت میں بہہ رہی تھی وہ حیران تھے کہ اس طرح پانی ایک جگہ آیا اور کشتی کو تباہ کر دینے کے بعد اس کی وہاں چلا گیا۔ اگلے میں اسی گڑیا کی آواز سنائی دی۔

”دوستو! تم لوگوں کو اب کس قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم لوگ بالکل محفوظ ہو۔ میں نے اپنا بدلہ لے لیا اور تم لوگوں کو بچایا۔“ چونکہ تم لوگوں کی وجہ سے مجھے قید سے رہائی ملی ہے، اس لئے میں تم لوگوں کو کچھ دینا چاہتا ہوں۔ تم لوگ اسی عمارت میں آگے بڑھتے جاؤ۔ وہ چہرے نہیں مل جائے گی۔ گڑیا کی بات کی تردید نہ کر رہے تھے۔

غارت بہت لمبا تھا آخر کار وہ اس جگہ پہنچے جہاں اس گڑیا نے انہیں کہا تھا۔ وہاں کچھ کران کی آنکھیں چکا چوند ہوئیں۔ بات یہی کچھ انہیں تھی۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ خزانے کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ سونا، چاندی، ہیرے، جواہرات، دھیر کی صورت میں پڑے تھے۔

وہ چاروں آنکھیں پھاڑے اس خزانے کو دیکھ رہے تھے۔ ایک ایک جادوئی گڑیا کی آواز گونجی۔ ”تمہارے پیچھے بنائی ہوئی موجود ہیں جتنا چاہو خزانے کو لیکن ہمیں لائی نہیں کرنا۔ کیونکہ یہ لالچ آدم زادوں کا ایک دوسرے کی پچھان بھلا دیتا ہے۔“

انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو واقعی ایک موجود تھے۔ انہوں نے وہ ایک اٹھائے اور اسے خزانے سے بھرنا شروع کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ گڑیا کی حیات کے مطابق عمارت سے باہر آ گئے۔ ان کا رنج جھگل کی طرف تھا۔ جب وہ جھگل سے گزر رہے تھے تو کوئی جادوگر بھی ان کے قریب آنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ ان چاروں کو دیکھتے ہی وہ وہاں سے دور بھاگ جاتے تھے۔

وہ حیران تو تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ یہ اس گڑیا کا کمال ہے اس طرح پہنچے ہوئے وہ اپنی جیب تک پہنچ گئے۔ ان کی خوشی کا اظہار نہ رہی وہ جلدی سے جیب میں بیٹھ گئے اور اسے اسٹارٹ کر کے وہاں سے چل پڑے۔

وہ دن کا سفر انہوں نے ایک دن میں طے کر لیا۔ راستے میں بھی انہیں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔

شام سے کچھ پہلے وہ جھگل سے باہر تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس گڑیا کی آواز سنائی دی۔

”دوستو! اب میرے جانے کا وقت آ گیا ہے تم لوگوں کو میں نے جو حفاظت پہنچایا ہے۔ تم لوگ اپنا خیال رکھنا تم لوگوں کا احسان میں بھی نہیں بھولوں گی۔ اب میں جا رہی ہوں۔“ انہوں نے دیکھا کہ جیب سے تھوڑے فاصلے پر ایک چھوٹا سا ہوا پتھر آہستہ آہستہ ٹھوکی میں اتر رہا تھا۔

جب وہ دیکھ کر مکمل ہوا تو انہوں نے دیکھا کہ وہ بہت ہی حسین تھی۔ اتنی زیادہ کہ اس پر سے نظریں نہیں ہٹ رہی تھیں۔ پھر وہ پری کی سیسک کرنا کاتھا ہلانے لگی اور آہستہ آہستہ اس کا دھڑول ہونے لگا آخر کار وہ مکمل طور پر غائب ہو گئی۔

وہ چاروں ساکت نظروں سے اس طرف دیکھ رہے تھے۔ جب وہ غائب ہوئی تو جیسے انہیں ہوش آیا۔ جونی نے غلطی سے اس کی پھری اور جیب سے بھاگوا دی۔



خراسان خراسان اور سبک رفتاری سے دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی صدیوں پر محیط اپنی نوعیت کی اچھوتی انوکھی دلکش دلغریب ایک طویل عرصہ تک دماغ سے محو نہ ہونے والی حقیقت سے قریب تر، سوچ کے افق پر جھلمل کرتی ناقابل فراموش کہانی۔

شاہکار کہانیوں کے سماجی لوگوں کے لئے عجیبے میں ذاتی حیرت انگیز اور تیز نگیز کہانی

ہیری داستان کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے۔ جب میری عمر سترہ سال تھی۔ یہ عمر خود ناشناس کی نہیں ہوتی۔ یہ اور بات ہے کہ نازم میں پرورش پانے والی امیر زاپاں اسے بچپن کہ لیں۔ اور لوساں جیسے بچوں کی حرکتیں کریں میں لکھی نہیں تھی۔ میں تو اس سے بہت پہلے بروہار ہو چکی تھی۔ آٹھ سال کی تھی جب والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ ہم خوشحال تھے۔ شہر سے دور ایک زرخیز علاقے میں باغ اور بہت سی زمینیں تھیں۔ جن پر زراعت ہوتی تھی۔

یہ سب خاندانی ورثہ تھا۔ اور اس کی دیکھ بھال کرنے والے لوگ میری پرورش میں ہی ملے تھے۔ اس قدر اچھے اور فادار تھے کہ کسی کوئی مشکل ہی پیش نہیں آتی۔ چنانچہ والد صاحب سبھی ہارون دانش نے اپنی مرضی کی زندگی گزار دی۔ کسی شے سے باقاعدہ شک ہونے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی۔ اگر کیا بھی ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ اور اپنے اس شوق کی تکمیل میں وہ کمال کی کوشش کرتے تھے۔ انہوں نے دنیا کی کئی زبانیں سیکھیں۔ خاص طور پر قدیم زمانے کی تحقیق پر انہیں عبور حاصل تھا۔ جگہ آ جا قدیم یمن کی بارائیں بڑے بڑے عہدوں کی پیش کش کی تھی۔ لیکن انہوں نے معذرت کر

لی۔ دنیا کے بڑے بڑے ممالک میں ان کی دانش و حوسم کی قدیم معلومات اور پراسرار تحریروں کی عقدہ کشائی کے لئے انہیں بہت مستر سمجھا جاتا تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ ان سے ملنے کے لئے آتے تھے۔ والدہ کی موت کے وقت میں بہت مصوم نہیں تھی۔ آٹھ سال کی عمر پاگل تاج کی عمر نہیں ہوتی۔ مجھے ماں سے جدا ہونے کا بہت غم تھا۔ لیکن اس غم کو ظاہر کرنے کے لئے پاپائے مجھے اپنے وجود کا ایک حصہ بنالیا۔ حالانکہ وہ بہت معصوم انسان تھے۔ لیکن انہوں نے مجھے اپنی معصومیتوں میں شامل کر لیا۔ اور آٹھ سال کی عمر سے ہی میں پاپا کی وجہ سے قدیم زبانوں اور انسان کے ماضی سے دل چسپی لے لگی۔

زمانہ قدیم کے دلچپ راز مجھ پر شکف ہوئے لگے۔ خاص طور سے مجھے مصرات سے بہت لگاؤ تھا۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں بھی زمانہ قدیم کی مصر کی کوئی روم ہوں۔ مصر سے متعلق تاریخ پڑھتے ہوئے مجھے تاریخ کے وہ واقعات اپنی داستان فرسوں ہوتے تھے۔ اور میری روم فرعون کے دور میں سکے لگی تھی۔ سترہ سال کی عمر تک میں بہت کچھ حاصل کر چکی تھی۔ اس دوران بے شمار متعلقہ افراد سے میری ملاقات

”کیوں؟“ میں نے سوال کیا۔
 ”جیسں صلیوں پرانی آسٹوآنی تہذیب خلاص
 کرتی ہے۔ میں نے اس تہذیب کے بارے میں ایک
 مضمون لکھا تھا۔ جس کا دوا میں شاعرانہ قدرم
 کیا تھا۔ میں نے اس تہذیب کے مرکز کی شناخت بھی کی
 تھی اور اس اس تہذیب کو انکشافات بھی کیے تھے۔
 جس میں جی جتاہا ہوں آسٹوآنی تہذیب کے یہ پرآمر
 انکشافات مجھ پر خواب میں ہوتے تھے۔ جب کہ پرآمر
 کرداروں نے مجھ پر انکشافات کیے تھے۔ اور میں

تینوں جانے کے تیاریاں ہونے لگیں۔ میں نے چونکہ آج تک باپ کے ہر کام میں دل جمعی لے لی تھی، اور یہ سب کچھ میری دلچسپی کا باعث بن چکا تھا۔ چنانچہ مجھے بھی تینوں جانے کی خوشی تھی۔ میں آشاہنی تہذیب کے بارے میں خود بھی جانتا جانتی تھی۔ تینوں کا حاتمہ قریب

بہت ہی سستی خیر سہا۔ مار چوک کے ایک
خصوص میں سے ہماری کمپننگ ہوئی اور اس کے بعد
اس جگہ کی نشاندہی کی گئی۔ جہاں حدودوں کو کھدائی
کرتی تھی۔ تقریباً چودہ دن تک شدید شہقت کی گئی۔
میری تحقیقات یہاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔
پہاڑی علاقہ تھا، البتہ، جب بھی موقع ملتا میں پاپا کے
ساتھ بیٹھ کر ان کی باتوں کو یاد کرتا تھا۔

میرے چہرے کا ایک ایک نقش میرے بالوں کا
رنگ، میری ہر چیز اس لاش میں موجود تھی، وہ لاش دیکھ کر
پاپا بھی دنگ رہ گئے تھے۔ باقی لوگ بھی حیران تھے۔

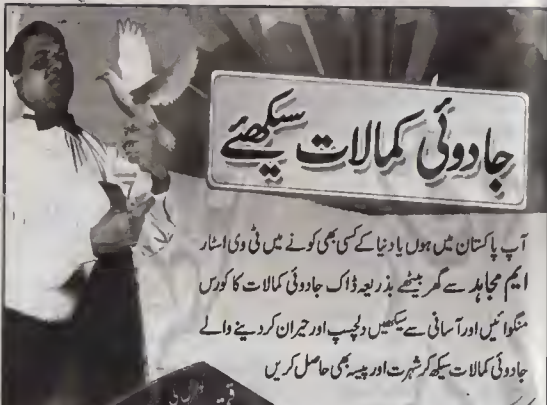
میں نے جو کہہ رکھا تھا، مجھے خود بے پناہ پشیمانی
اور میری بہن کو بھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں بے
کھائی رہا، گا کے سب سے بڑے چھاپڑی کو سناؤں
چھاپڑی نے میری بے کھائی کی اور دنگ دیا۔ اس نے کہا
کہ جو کہہ میں نے کہا ہے۔ وہی جاب ہے، اور مجھے اپنی
شہرت کی قسم کھائی کہ اس کی جگہ ہاں میں ہاں ملے گی
بڑی عقیدت سے دھڑا اور سنا جانے لگا کہ میری بے کھائی
مصر میں کے عوام کی عقیدت کا باعث بنی ہوئی تھی، اور
اس کھائی کے باعث دیوتاؤں کے بارے میں صدیوں
سے چلتے آئے والے عقائد کی جزل ہو گئے تھے۔ پھر
سولہ سال کی عمر میں میری شادی ہوئی۔ اس دوران میری
شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ بڑے بڑے ادبی
دورسے لوگ میری کبریائی دیکھنے کے لیے تھے۔ یہی
عقائد ہیں جو اب بھی بڑے بڑے لوگوں میں جڑے

بہر حال میں، اپنی بہن، باپ اور بڑے بچاری
کی دعائیں لے کر قاصد کے ساتھ ولی عہد کی خدمت
میں جانے کے لئے روانہ ہو گیا۔ میری حد سے زیادہ
پذیرائی کی گئی۔ اور ولی عہد نے مجھ سے کہا۔ کہ اس نے

”اسے کیوں مار رہے ہو؟“ شہزادے نے ایک جانب کھڑے ہوئے سپاہی سے پوچھا۔

”کام چور عمرانی ہے پورا کام نہیں کرتا۔“

چیخ کے ساتھ ہی اس کے منہ سے خون کا فوارہ



جادوئی کمالات سیکھئے

آپ پاکستان میں ہوں یا دنیا کے کسی بھی کونے میں ٹی وی اشارہ ایم جی جہاد سے مگر بیٹھے بذریعہ ڈاک جادوئی کمالات کا کورس منگوائیں اور آسانی سے سیکھیں دلچسپ اور حیران کر دینے والے جادوئی کمالات سیکھ کر شہرت اور پیسہ بھی حاصل کریں

فیض میں 50% -

ایم جی جہاد کے ہزاروں کمالات میں سے چند کمالات
تھروں سے گلاس ٹوٹنا، کاغذ کا کرنٹ بنانا، لڑکی کے بیک سے رومال
ٹٹکانا، دور سے دودھ کا گلاس چٹا کاغذ کا کپڑا بنانا، ڈبے سے خرگوش ٹٹکانا،
رومال سے کپڑا بنانا، زبان سے تار گزانا، اڑنے سے چڑھنا، جسم کی
حرارت سے بلب جلانا، پھول سے شعلہ پیدا کرنا، گیس ہوائی کتاب سادہ کرنا
بکسی ہوائی کتاب سادہ کرنا، ہاتھ کے تمام پیر ہاتھ بنانا، ہاتھ سے نوٹ
عاب کرنا، کوئی چیز عاب کرنا، ان کے علاوہ بے شمار کمالات سیکھنے کے
لئے آج رابطہ کریں۔

کمالات کی روشنی کی دہلیز

- پیکل نمبر 1 - 1,500/-
- پیکل نمبر 2 - 2,000/-
- پیکل نمبر 3 - 3,000/-
- پیکل نمبر 4 - 4,000/-
- کل قیمت 10,800/-

تمام کورسز ایک ساتھ منگوانے پر خصوصی رعایتی قیمت - 5,000/-

ایسٹبل کورس آرڈر کیلئے ایسی ان نمبر پر کال کریں
0300-9214642
0333-3254309 قیمت 30,000 روپے

انم جی مینک ڈسٹری بیوٹرز
201 نمبر 11، فرسٹ ٹورنٹون اسکوئر
021-5214012, 5215482
0300-9214642, 0333-3254309
بالتا ایل ایئر ٹیس مارکیٹ میڈرکائی

جاری ہو گیا۔ اور چند ہی لمحوں کے بعد ہمارے سامنے بڑے عمرانی کے محلے ہوئے منہ اور پچھلی پہلی آنکھوں والی لاش پڑی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں خود ہی اس منظر اور اس خون خوار اس کے منہ سے زرا اٹھا تھا۔ شہزاد سید کے چہرے سے شدید ناگواری کا احساس جاری ہو رہا تھا۔ حالانکہ وہ سوچ رہا تھا کہ انفر کوس کے جرم کی سزا خود اسے یا فرعون مصر کی سزا ادا تھ چکا تھا۔

اسی وقت شانے کو چیرتی ہوئی نسوانی آہ و بکا کی ایک آواز سنا دی۔ ہم سب نے گھور کر دیکھا تو ایک انتہائی حسین و جمیل لڑکی روٹی اور دین کرتی ہوئی آئی تھی۔ اور ہائے باہکتی ہوئی لاش سے چٹ گئی۔ لیکن پھر بچانے کیا ہوا، وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس وقت اس کا سن دھلا مصر کی سب سے بڑی دیوی کے سن و جمال کو شرا بہ تھا۔

”بدلو! کو؟“ اس نے مجمع سے مخاطب ہو کر کہا۔
”ایک بڑے اور بے بس انسان کو مل ہوئے دیکھتے رہے اور تم میں سے کسی کو اتنی جرأت نہ ہوئی کہ گوار چمن کر ظالم کے ہاتھوں کو کاٹ کر پینک دے۔۔۔“

”لڑکی؟“ افر کر جا۔۔۔“ اپنے ناچھہ پاپ کا مشرکہ بھیگے۔ اب بھی میری بات مان لے۔ ورنہ تیری لاش بھی اسی طرح بے گھر وطن پڑی ہوئی ہوگی۔“ لڑکی نے نیک لگا بھر کر بڑے پاپ کی لاش کو دیکھا۔ پھر افسر کی طرف مندر کے قوتی ہوئی بولی۔

”میں ٹھوکتی ہوں۔۔۔ تجھ پر اور تیرے، جنہی چہرے پر۔“ افر کا ہاتھ بے ساختہ گوار کی طرف گیا۔ تو اسی وقت سید چلا اٹھا۔

”ظہور۔۔۔ اس کی آواز میں اتنا رعب اور دبدبہ تھا کہ افسر سر سے پاؤں تک زلزا لڑ گیا۔ کچھ کچھ اور اپنے اوپر قابو پا کر دوا کے بے ہوش

”تو کون ہے کتے کے بیچ؟“ اس نے شہزادے کے چہرے پر اٹھا ہاتھ رسید کرتے ہوئے

”جہیں اور کسی جگہ کہتا ہے۔“

”نہیں۔ مجھے جو کچھ کہا تھا۔ کہہ چکی“ اس نے

منہ ہٹا کر کہا۔

”میں یہ تو براہ راست کر سکتی ہوں کہ میرا ہونے والا شوہر کسی لڑکی کے پاس آکر غلطی کر بیٹھے۔ لیکن یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتی کہ جان بوجھ کر اس سے غلطی سے

اس سے ایسا کوئی کام نہ ہو جس سے خدا سے معذوران کی کوئی عظیم قوم کی ہلاکت کا کوئی پہلو نکلا ہو اور جو تو یہ ہے کہ میں اب بھی یہی سمجھتی ہوں۔ کہ اگر میرا بی لڑکی

درمیان میں نہ ہو تو تم ہرگز ہرگز نہیں اسکر کرو اسے موت نہ دیتے۔

”مجھے ایک بات کا شکوہ کی؟“

”چھو۔“

”آخر میری زندگی سے ایسا کون سا قصور کیا ہے۔ جس کی یاد میں خدا سے معذوران نہیں عقیدہ رکھتا

ہے۔“ اگر واقعی اس نے کوئی خضرہ لائق ہے تو انہیں معذوران سے روک رکھنے سے کیا فائدہ جب کہ وہ خود وعدہ

کرے ہیں کہ وہ اپنے نسل کو پار کر کے کسی دوسرے علاقے میں چلے جائیں گے اور وہ بارہ بھری عمر میں

آئے گا تو نہیں کریں گے۔“

”تمہاری بات کا جواب بعد میں دوں گی۔ پہلے

تم میرے اس سوال کا جواب دو کہ فرعون مصر اپنے باپ کو

تم خدا کیسے ہو یا نہیں۔“

”ہاں۔“ شاید۔ میں انہیں خدا کیسے پر مجبور

ہوں۔“

”شاید مجبور۔ بڑے اعلیٰ الفاظ استعمال

کر رہے ہو۔۔۔ خدا سے معذوران کے لئے۔۔۔ اس نے سچ

لہجے میں کہا۔ ”تاہم اگر تم انہیں اپنا خدا تسلیم کرتے ہو تو

نظر نہیں آتی کہ تو یہ کیسا ہوں۔ کہ ان کی ساری خدائی

سب کچھ نہیں جس کا ہاں اور شاہی جادو گرد اور جادوں

کے بل بوتے پر قائم ہے۔“

”تو یہ کہ سمجھو مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں یہ

شیطان خدائی تمہارے ایمان اور عقائد کو محض لڑ

کر دیں۔“

”تمہیں یقین ہے کہ فرعون مصر، تمہارا باپ

حقیقت میں خدا ہے۔“

”شہزادے نے پوچھا۔

”ہاں مجھے اس بات پر اتنی یقین ہے۔ جتنا

اپنے وجود پر بلکہ اس سے بھی زیادہ۔“

”پھر تو تم یہ بھی مانتی ہو کہ خدا ہونے کی

حیثیت سے فرعون مصر کے لئے کوئی بھی کام ایسا نہیں جو

وہ انجام نہیں دے سکتے۔“

”یہ عقیدہ میرے ایمان کا جزو ہے۔“

”وہ دن یاد کرو۔ جب میری زندگی کے بیشتر دن بار

میں داخل ہوئے تھے اور انہوں نے فرعون مصر کو اپنا ذاتی

قبول کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اور فرعون مصر کے اشارے

پر وہ بار کے جادو گردوں نے جادو کے زور سے ساتیل کو

اور اہست سے کاپ رہا ہے۔ کیا تم نے کاتبوں،

جادو گردوں اور چارپائی کی یہ سرگوشیاں نہیں سنی ہیں کہ وہ

میرے انہوں کے بیشتر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔؟ میں پوچھتا

ہوں۔ کہ فرعون مصر اگر واقعی خدا ہیں تو وہ عاجز اور

پست انسان کیوں ہو گئے تھے۔؟ انہوں نے میری زندگی کے

بیشمار کو اپنے غضب کی آگ میں جلا کر کھم کیوں نہیں

کر دیا۔؟ انہوں نے میری زندگی کے بیشتر سے یہ

جادو گزار درخواست کیوں کی کہ وہ مجھ کو اپنے کی ہلاکت

دیں۔؟“

”شہزادی فرطانہ نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ”میری طرح تم

مجھے بھی بالکل نادودہ۔ لیکن یہ بات خوب اچھی طرح

لے لے چکا ہو کہ میں ایک لمحے کے لئے بھی اپنے سامنے کوئی نہیں

ہوں کہ خدا سے معذوران کوئی کام صحت کے خلاف ہو سکتا

ہے۔ میں تو آج بھی یہی سمجھتی ہوں کہ انہوں نے مجھ

کے تمام کرنے کی غرض سے میری زندگی کے بیشتر کو کھوئی سی

لڑائی میں روٹی دی ہے۔ اگر وہ واقعی خوف زدہ ہوئے تو

میرے انہوں کو آزاد کر کے دریائے نیل کے پار جانے کی

اجازت دے دیتے ہوتے۔“

ولی عہد جانا۔ ”اس بات کو یوں بھی تو کہا

”خیر فرطانہ۔“

”جونی شہزادی کرے سے باہر مگی ولی عہد نے

مجھ سے پوچھا۔۔۔“

”ناطق قاسم نے کسی غلط بیانی سے تو کام

نہیں لیا؟“

”میں نے دیکھی آواز میں کہا۔ ”آپ نے میرے

دل کو اچھ کر دکھا دیا ہے۔ آپ کے دلائل سن کر مجھ نے

کیوں میں سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ میری زندگی کے

بیشمار ہیں اور ان کا دین ہر حق ہے۔ نجات اسی کی

ہوگی، جو ان کے دین پر ایمان لائے گا۔ آئیے جتنی

جلدی ہو سکے ہم یہاں سے نکل جائیں اور میری زندگی کے

بیشمار کے سارے معاملات میں چلے جائیں۔“

”جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ مجھے پورے

طور پر میری زندگی کے دین کو سمجھ لیتا ہوں۔ میرے دین

میں کسی کی شکوک و شبہات ہیں۔ اس نے کہا۔ ”اور اب تم

مجھ کو روٹی کھانی کھانی شادی جو میرے سینے کی

دکھائی ہوئی آگ کبہ کر دے۔“

”میں نے فرما دیا ایک ایک کڑی لے جس کا میر

شہزادہ سوجھا تھا اور میری زندگی میں اس کی

طرح جو میں نے ذریعہ احرام کے پاس کی تھی۔ کھانی کا

اجتماع طریقہ تھا۔ میں نے ساری کھانیاں دوڑ کے کھ رہی

تھیں۔ دین کی شادی کرادی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میری اس

کھانی سے ولی عہد کو کچھ تسکین ملے گی۔ لیکن کھانی ختم

ہوئے پر پوچھا کہ میری زندگی کے بجائے آگ کچھ اور میری

زیادہ دلچسپی چل جائے۔“

ولی عہد جھٹکا دینے والے گہری گہری آہیں

بھرے لگا کچھ بڑا ابھی رہا تھا۔ میں نے کان لگا کر غور

سے سنا۔۔۔ ”وہ دوبارہ ہوا سنا لیا۔۔۔“

”میرے انہوں کے پانچ بھائی نام کیا ہے۔؟“

میرا خیال تھا کہ فرعون مصر ولی عہد کو اپنے وہ بار

میں بلا کر اور اسات میں سے معلوم کرے گا کہ اس نے

میرا بی لڑکی کا خاطر مصر کے پولیس اسٹیشن کیوں کیا۔ لیکن

میرا خیال بالکل غلط ثابت ہوا۔ ولی عہد سے نہ کوئی

کرو کھا۔ ”شب بخیر سو۔۔۔“

شہزادی فرطانہ نے ولی عہد کو گھور

کر دیکھا۔

کر دیکھا۔

کر دیکھا۔

126 June 2012

بزرگ کا نورانی چہرہ گلاب کی طرح گل اٹھا۔

مصری نوجوان ہے مگر کرتیں کرنے میں باہر ہوئے ہیں۔ بہر حال مجھے خوشی ہے کہ تہذیبی مذہب کا ذمہ دار رہا کرتے نماز کے ساتھ شادی کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ البتہ یہ بات میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آتی کہ تم اس عمل میں کیوں نہیں لاتے۔ کس کے خوف نے تمہیں ایسا کرنے سے باز رکھا۔“

”اگر میں کہوں کہ سب سے بڑا خوف تمہارا تھا۔ تو کیا تم یقین کر لو گی؟“

”ہیش۔۔۔۔۔“ وہ فحشی۔۔۔۔۔ ہر فرعون کے حرم میں سوڈیٹھ سو بیاباں رہی ہیں۔ میں ان تمام غمگینوں کی طرح نہیں جواہر بن چکی ہوں۔ یہ جلا کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم کتنی ہی شادیوں کر لو۔ خاندانی حسب ذہب کے اعتبار سے تمہاری ساری بیویوں پر مجھے ذہنی تسلط حاصل رہے گی اور وقت آنے پر صرف بھجری نکلے گا۔ اور صرف میری اور تمہاری اولاد ہی وارث بنتی ہو سکتی گی۔“

”دین مسوی میں کتنے بہن بھائی شادی نہیں کر سکتے۔“ شہزادے نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”اور تمہیں پہلے ہی اس بات کا علم ہو چکا ہے کہ میں نے پورے ہوش و حواس اور رضا و رغبت سے اس دین کو قبول کیا ہے۔“

دوسرے الفاظ میں اسی بات کو یوں کہہ کر دین شرافت و نجاست کا دشمن ہے۔ بھائی بہن کی شادی نہیں ہو سکے گی تو اولاد کی رگوں میں خالص خون کس طرح دوڑے گا۔ پھر کوئی بھی یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گا کہ وہ نریت مال باپ کی اولاد ہے۔“

اس نے مذاق بناتے ہوئے کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ تم اس اصول پر کاربند نہ رہو گے۔ بہت جلد تمہیں احساس ہو جائے گا کہ بہن بھائی کی مشترکہ اولاد۔۔۔۔۔“

”شہزادی۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“ شہزادے نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”دین مسوی کے کسی اصول کو توڑنے سے پہلے میں ہر ماہ پرندہ کر دوں گا۔“



ناگ نقش

سجاد حسین نوی۔ پنڈراؤ خان

اچانک نوجوان کی انگلی اپنی بہن کے بالوں میں پڑی تو وہ اچنبھے میں پڑ گیا کیونکہ ایک چھوٹا سا مسنپ گدی میں چپکا تھا۔ نوجوان نے مسنپ کو نیچے پھینکا مگر مسنپ کی آنکھوں سے نکلتی روشنی نے اسے مہوٹ کر کے رکھ دیا۔

بارہائی ملک کے وجود سے انکساری لوگوں کے لئے حقیقت پر مبنی ایک عجیب شاخسانہ

وہ رات بہت طویل تھی، ہنر مند نوجوانوں کے ہاتھ نازک تھیں کوہادر سے ادھر ہاتھ کر زور کر رہے تھے۔ جابجا بچے بھرے ہوئے تھے۔ جانوروں اور پرندوں کی ڈوری بھی آوازیں فضا میں خوفناک تاثر پیدا کر رہی تھیں۔ سبیل سبیل کو تیز سے دوڑتے تھے جا رہا تھا۔ مگر قاصد تھا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ آج اسے اپنے گھر چھوٹی بہن ساسی کی دوا لے کر جا لے گا۔

”نہیں بھائی آئے ہی دلا ہو گا بیٹا۔“ میں ذرا دروازے تک دیکھ کر آتی ہوں۔ ”سردھ سے بڑھال ساسی کو چھوڑ کر لائیں آج میں تھا ہے، جتنے ہواؤں کا مقابلہ کرتے اس کی ملا ساسی کو دروازے تک آئی۔ گاؤں بھر کے بچوں کو پڑھانے کی وجہ سے سب لوگ اسے ماسٹر کی کے نام سے ہی پکارتے تھے دروازے سے باہر

پڑی تھی۔ اندھیرے میں ڈھونڈ رہی تھی۔

مٹی کے کچے کھانوں میں سر دوسرے بے نیاز لوگ، رعنائیوں میں دیکھے خواب خرگوش کے حوسے لے رہے تھے۔

ماسٹر بھی ایک عقائد سے آتی ساسٹی کی سر درد سے غمگین آؤہ اولوں پر ڈاؤن ہو گئی لاشیں کی دم روشنی میں تاریک گلی میں کچھ بیکھری کی کام کو شش کرتی۔ سردی کے مارے ہاتھ پاؤں تن ہوئے جارہے تھے۔ دانت رنجے دانت رنجے تھے۔ مگر یہ غلط چودہ سالہ ساسٹی کی فکر سے بڑھ کر نہیں تھی۔ بے بارہ سال کی عمر سے ہی کمرے پر اس پروردہ نے بکڑا رکھا تھا۔ جب دروازے پر دوڑتا تو ساسٹی کی کھینچ کر اٹھتا تھا۔

مناشی کی دل میں اس نے اپنے بچے کی شکل کے جلدی آنے کی بار بار تکرار کی تھی کہ اس کی نظر کی کوٹنے پر موجود ہر جگہ کے قدیم درخت پر پڑی جو تکرار پائے اپنی جوانی سے وہیں دیکھ رہی تھیں۔

”ایسا کہ وہاں کچھ ہے۔“ لاشیں کی نامہ پڑتی دم روشنی میں جو ماسٹر نے درخت کی جانب دیکھا تو ان کا اچھل کر قتل میں آ گیا۔

ہر جگہ کی شاخوں پر کئی ہیں بائیں سالہ لڑکی بھی تھی۔ جس کے انتہائی بے باک لاشوں پر کھڑے بڑے تھے اور کپڑے میں ہی طرے اٹھتے ہوئے تھے۔ اس لڑکی کی ساجھنوں پر قریب آدھے ماٹھے کی پٹلی ہوئی تھیں۔ اس کی پیڑی کی آنکھیں انگارہ برادری تھیں۔ اور پھر یہ اس کی آنکھوں سے چنگار میں لگی کر ارد گرد پھیل گئیں۔

مزید ماسٹر ساسٹی سے نہ دیکھا گیا۔ انہوں نے آکھیں بند کی، بیگوان، بیگوان کرتے ہوئے اندر آ گئی۔ کثیر بھری کی بیچ سے ان پر خوف غالب نہ آ سکا۔

وہ جاتی تھیں، موسمی کی لکڑی شدتوں میں یہ قوتوں اکڑاؤ پڑتی تھیں۔ بے اندر آ کر دیکھا تو ساسٹی کی آنکھوں کی چمکی چمکی کرکٹ ابھی اس کے چہرے پر واضح تھا۔ درد کی جیسے سے اس کا چہرہ بیلا پڑا ہوا تھا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ

جا کر کھولا تو ڈر حال ساسٹی دواؤں کا شاپرہ سے اندر داخل ہوا۔

ساسٹی کیسی سے ہاں اڑا رہی تھیں وہاں سے اپنی محسن سے بے نیاز اسے بہن کی بدوا ہوئی۔

اسی نے تو کہا تھا کہ بہنوں کا سانس ان کیچے ہیں۔ ”کوئی ہے بیٹا۔“ پتہ نہیں پیر کا کھنوں در و درک اس کی جان چھوڑے تھے۔ ”ماں نے تیل کو گرم کر مچائے پکڑا دے ہوئے کہا۔

جانے کی چکی بھرتے ہوئے سسٹل بار بار اپنے سے باغ سال چھوٹی بہن کی جانب دیکھ کر باجوں سے مدد پڑی تھی۔ کتنی ہی بار اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ بھی اسیر لوگوں کی طرح اپنی بہن کو شہر کے کسی بڑے اسپتال لیجائے اور اس کا مکمل علاج کروائے۔ کتنی ہی بار اس کا دل اس خوف سے تیز تیز دھڑکا تھا کہ اس کی مصمصی میں کہن۔ ”کوئی بڑی بیماری نہ ہو۔“

”سسٹل بیٹا، اچھ۔“ دیکھ! دن چڑھ گیا ہے۔ اور اسکول کا وقت بھی ہو گیا ہے۔“ ماں کے بچنے کے پردہ پھتری سے اٹھ بیٹھا۔ ماں ہاتھ دھوئے ہاتھوں میں لکھی کی ناشتہ کیا اور بہت سا کر کے چاہا وہ جا۔

اسکول کی طرف جانے والا راستہ بہت دیران تھا۔ آدھا ہی ہے تو خدا ہٹ کر اسکول تھا۔ راستے کے دونوں اطراف میں کتنی چھاڑیاں پڑی تھیں۔

ایک دن سسٹل کو ماسٹر نے کسی کام پر لگائے رکھا۔ کام کے ختم ہونے پر چلا کر بھٹی ہوئے پندرہ میں منٹ ہو گئے ہیں۔

”سسٹل! تم تو بہت لیٹ ہو چکے ہو۔ چلو اتار کر تے ہیں میں تمہیں گھر چھوڑ دیتا ہوں۔“ ماسٹر نے کہا۔ ”بھئی ماسٹر، میں چلا جاؤں گا۔ آپ فگر نہ کریں۔“ تاہم وہ بچوں کی طرح سسٹل نے ماسٹر کو ہٹ دینا مناسب نہیں سمجھا اور اکیلے ہی راہ پر ہو گیا۔ وہیں ساسٹل ختم ہونے میں کچھ منٹ ہی دروہ تھیں۔ ماسٹر کا کھرکس آئے تھے والا تھا کہ اس کی نظر رُک کے دائیں طرف جیسے ایک سنیا کی لپا پڑی۔ اس کے گلے میں

بڑے بڑے موتیوں کی لالچیں تھیں۔ ہاتھوں میں رنگ بھرتے کڑے بھی بہن رکھتے تھے۔ اس نے اپنی لال انگارہ آنکھیں سسٹل پر مرکوز کر رکھی تھیں۔

”اچھر! اب جگر، بھری بات نہ کر جانا۔“ سسٹل پاس سے گزرنے لگا تو سنیا کی لپا نے اس سے اونچی آواز میں کہا۔

”مٹی لپائی، کوئی کام ہے آپ کو؟“ سسٹل بیک سمیت دوڑیں بیٹھ گیا۔

”یہ کیا ہے؟“ سنیا کی لپا نے سسٹل کے ہاتھ پر سامنے کی طرف بڑے ایک چھیدے کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ!.....“ سسٹل نے ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایک بار میں اپنے دوستوں کے ساتھ شہر گیا تھا بابائی، بس وہیں سے یہ تصویر ہوئی تھی۔“ سسٹل نے وضاحت کی۔

”مجھے دوسری تصویریں بھی نہیں ہے۔“ سنیا کی لپا کی انگارہ فرما پائی آنکھیں ابھی بھی سسٹل کے ہاتھ پر مرکوز تھیں۔

”مجھے سامنے سے مشتق ہے بابا۔ بہت اچھے لگتے ہیں مجھے۔ اس لیے ان کی پیش بخوایا ہے۔“ سسٹل وضاحت پر وضاحت دیتے چلا رہا تھا۔

”پہ باک شاید تو نہیں جانتا۔ یہ نقش جو تیرے ہاتھ پر بنا ہے کسی عام سارپ کا نہیں ہے۔ یہ جہان سارپ دینا کا نقش ہے۔“ سسٹل کی کھٹی آنکھوں میں اچانک عود کر آئے والی طیلے رنگ کی آئینہ شہر کو شہر کے سنیا کی لپا نے تیزی سے اپنی نگاہیں سسٹل کی آنکھوں سے جٹائیں اور جھٹ سے بولا۔ ”بابا! ابھی تو چلا جا۔“

کندے اچانک سے ہوئے سسٹل نے کڑے ہو کر گھر کی راہ لی۔

”ماں کہاں ہے ساسٹی؟“ اپنے کو ایک جانب رکھ کر ہاتھ منہ دھوئے سسٹل نے پوچھا۔ ”ماں! کنگا نے مجھ کو روک دیا ہے۔“ وہیں گئیں۔ مٹا گئی ہے کھانا نہ کر

آگے رکھا۔

”تو نے کھانا کھایا؟“ سسٹل تو لیرہ سے ہاتھ صاف کر کے چارباہی کی آگے بیٹھا۔

”بھئی بھائی، میں خندہ رہی ہے۔ سو کے اٹھ کر کھاؤں گی۔“ بہن کے جانے کے بعد سسٹل حوسے سے کھانا کھانے میں مشغول نہ ہو گیا۔ آج اس کی پندہ یہ بڑی تھی تھی۔ دسک ہوئے پر دروازہ کھولا تو سامنے ہمارے کا بچہ کڑا تھا۔

”سسٹل بھائی، ماسٹر کی مٹی کھلایا ہے کہ وہ رات کو وہاں آئیں گی۔ وہاں سے انہوں نے کھانا کھانے کے گھر جانا ہے۔ آپ پریشان نہ ہونا۔“ بچے کا پیغام سن کر سسٹل نے ہانسا کر بلا دیا۔

شام کے کھینچنے کا ٹائم ہو چلا تھا۔ گاؤں کے بچے، بڑے سردی کے مارے ابھی سے کمرہوں میں دسک لگے تھے۔

ساسٹی ابھی تک سے خبر سوئی پڑی تھی۔ سسٹل نے ایک نظر ساسٹی پر ڈالی اور دل میں شکر ادا کیا کہ ابھی تک اس کی طبیعت خراب نہیں ہوئی تھی۔

اپنے کمرے میں بیٹھا وہ صاحب کے سوالوں کی مشق کر رہا تھا۔ آخر کڑے دوین جماعت کے امتحان دینا تھے۔ کس سے ساسٹی کے کمرے سے طرحوں جی کی آواز آ کرے۔ کالانی دین بیچک کر، انجیر چلے سنوہ دھاسی کے کمرے کی طرف بیٹھا ہوا۔ ساسٹی کھلے ہاتھوں، دونوں ہاتھوں سے بچک سے ہانسا پڑے سسٹل اونچی آواز میں چلائے جاری تھی اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔

کمرے میں آئے تھے اس نے تیزی سے الماری کی طرف دوڑ لگا دی۔ جہاں اس کی دواؤں تھیں۔

”کھرکے.....“ سسٹل ہونچا کر رہ گیا۔

دواؤں کی قطعی ختم ہو گئی تھی۔ اسے اب یاد آیا۔ تیزی سے اس نے پانی کا گلاس ہمارا دواؤں کی طرف بھاگا۔ مگر ساسٹی نے ہاتھ کے پھٹکے سے گلاس پر سے پھینک دیا۔ یادہ بڑی طرح چلائے جاری تھی۔

ساسٹی..... میری بہن، دو کھینچو ماسٹر اپنی پانی لے،

دور تیری طبیعت اور بگڑاؤ کی۔ ”سینل روپا ہوا۔
 ساسٹی بیٹے میں بری طرح جھک چکی تھی۔ بیش
 کی طرح ایک بار پھر اس کی سانس اکٹرنے لگی۔ سر
 میں اٹھنے والی درد کی شبیوں سے بے حال ہو کر وہ بار بار
 اصرار کر رہی تھی۔ ”بیٹے میں اس کے ہاں اس کے
 ماتھے اور گالوں پر چمک رہے تھے۔ شدت درد سے وہ
 ٹھٹھا ہوئے جا رہی تھی۔

”ساسٹی!.....! سنیاں خروکو“ آنکھوں میں نمی
 لئے، اما بگڑاؤ کی کیفیت میں اس نے ہاتھ بڑھا کر ساسٹی
 کے پیٹے میں چپکے چپکے پرے پر آئے ہاں پیچھے کے کوس کا
 ہاتھ وہیں گرک دیا۔ جیسے اس کے ہاتھ کو کزنٹ مالگا۔

”اوہ کھنگھسا گیا۔“
 وہ ساسٹی کے بالوں میں سر کے پھیلنے سے اس
 کی چڑ کا گھانا ہوا تھا۔ اس کی انگلیاں اس کے بالوں میں
 موجود کی وجہ سے گر گئی تھیں۔ بلند ہاتھ تو وہ شروع سے
 ہی تھا۔ فوراً اٹھا اور ساسٹی کے سر سے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔
 ساسٹی کی آواز بیٹھ گئی۔ اب وہ سر ڈھلکا گئے
 گھٹی گھٹی چھین ٹھل رہی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے
 ساسٹی کے ہاں ہاتھ تو اسے زمین آستان گھومتے ہوئے
 محسوس ہونے لگے۔ اپنی نظروں پر یقین نہ آیا۔

کالا اور چاندنی کی طرح جھلکنا ایک بالشت کا
 ایک سانپ ساسٹی کے لیے بالوں میں ڈھکا ہوا، انا منہ
 اس کے سر کی کچھلی جلد پر لگنے خون جو سے میں گن تھا۔
 جیسے ہی سینل کو ہوش آیا، اس نے پاس میں پڑی
 لکڑی اٹھائی، اس نے جھنگے سے سانپ کو کچھ پیچک کر
 مارا چاٹا تھا۔ درد دوسری صورت میں ساسٹی کو چوٹ
 لگنے کا خدشہ تھا۔ اس نے لکڑی مضبوطی سے اپنے ہاتھ
 میں پکڑ لی۔

جو بھی سینل کے ہاتھ میں موجود لکڑی سے سانپ
 کوس لگا۔ سانپ نے فوراً انا منہ اٹھا کر سینل کی طرف
 دیکھا، اس کی گول گول چلتی آنکھیں مسلسل سینل کو
 گھورے جا رہی تھیں۔

”سینل کی آنکھوں میں سانپ کا جھانکا تھا کہ

سینل کی آنکھوں میں بھر سے وہی نیلے رنگ کی آئینہ
 ہونے لگی۔ لکڑی اس کے ہاتھ سے کب کی گر چکی تھی اور وہ
 وہیں اپنی جگہ پر جامہ دے کر بیٹھا تھا۔
 ”دوبارہ وہاں سے اپنی دوشانہ ساسٹی کے سر کے
 کچھلی سائیز پر انا منہ راتو ساسٹی کی بلند چلتی بھی سینل کو
 ہوش میں واپس نہ لاسکی۔ سانپ نے اپنا کام مکمل کر کے
 ریت نکالا ہوا ہر ایک جانب چل دیا۔ جب سینل کو ہوش آیا اس
 کے گھر کا پورا کمران سفید چادروں سے ڈھکا ہوا تھا۔ گتے
 کے مرد و خواتین گردن جھکائے خاموش بیٹھے تھے اور
 ماسٹر ماسٹری کی آنکھیں درد و سرخ ہو چکی تھیں۔

”کیا اسے عرصہ تک جیسا سانپ میری بہن کی
 زندگی بچا رہا۔ ہاں تو اس کا کیا میری نظر کی اس پر نہ
 پڑی۔ اور نظر پڑی بھی تو کب، جب وہ میری بہن کی
 زندگی کی آخری سانس ہی پھوڑ چکا تھا۔ اور میں کچھ بھی نہ
 کر سکا۔“ سخن میں سخنوں کے ساتھ کھڑا سینل کب سے
 اپنی ہی سوچوں میں گن رہا تھا۔

”تجھے تو بڑے اچھے گتے ہیں ناں سانپ۔ اس
 منٹوں کی تصویر ہاتھ پر بزنار کی ہے۔ اب دیکھ، اسی سانپ
 نے تیری بہن کو چتا پر پہنچا دیا، ارے میں تو جتنی دیر
 میری جی کو کور کا رو ہے۔ میری نظر کیوں نہ پڑی اس خالم
 منٹوں سانپ پر، جو میری جی کے لیے بالوں میں جگہ بنا
 کر بیٹھا جاتا تھا۔“ اسٹری ماسٹی ایسا کہہ پڑے تھیں۔ اور پھر
 اس دن ماسٹی کو چٹا کے خواہے کروا دیا گیا۔

☆ ☆ ☆
 دن معمول پر آنے لگے تو سینل نے بھی اسکول
 جانا دوبارہ شروع کیا۔ اور بڑے ہی گھر میں اس کا دل
 بالکل دھلکا تھا۔ ساسٹی جو بھینس کی ماں بہر دت سر پر پٹی
 باندھے کھڑی رہتی تھی۔

آج اسکول سے واپس آتے ہوئے اسے پھر وہی
 سنیاں بلایا تھا۔ سینل کو دیکھتے ہی سنیاں بلایا کی آنکھوں
 میں خوف سا اتر آ گیا۔

”نہاں بھالاجی۔“ سینل وہیں بیٹھ گیا۔
 ”ہاں بالک نہ مالگا سے میرا اندازہ درست نکلا۔“

سینل کے چہرے پر پچھلی پریشانی کو دیکھ کر سنیاں بلایا نے
 ”شین گولی کی۔“
 ”کیا اندازہ دیا بھالاجی؟“ سینل نے جھکے جھکے انداز
 میں روپا اٹھایا۔
 ”تجھے اپنے جنم دن کی تاریخ دے؟“ سنیاں بلایا
 نے سوال دیا۔
 ”3 جنوری 1990ء۔“ سینل نے حیرت زدہ سا
 اہو کر جواب دیا۔

”سال کا اگر پورا خانہ بناؤ۔ جنم کنڈلی کو دیکھو اور
 تمہارے رجسٹر کا ٹکڑا۔ سب سب بتا رہا ہے کہ تو یہ وہ
 ہے جس کی اسے برسوں سے تلاش تھی۔“ سنیاں بلایا کافی
 دیر حساب لگانے کے بعد بولا۔

”سینل سے حقیقت دریافت کرنے پر سنیاں بلایا
 نے اسے اتنا شاموش کیا۔“
 ”دیکھ بالک، جس طرح ہر جگہ ایک عکراں ہوتا
 ہے۔ جس کا کسم کسم کو انا بتا رہا ہے۔ اسی طرح سائینڈ
 کا بھی ایک مہمان دیتا ہے۔ جو ایک بہت پرانا گھوٹا
 ہے۔ زمین پر بیٹے والے اگر تمام بالوں کی جسامت کو
 اکٹھا کر دو ایک مہمان ناگ دیتا تھا ہے جس کا کل حجام
 سائینڈ پر چلتا ہے۔ ہر سال بعد ایک ناگ کو گولی کی
 ضرورت ہوتی ہے۔ مگر اس کی شرط یہ ہے کہ گولی جس
 آدمی کی دی جائے۔ اس کا جنم دن اور مہمان دیتا ناگ
 کا جنم دن ایک ہونا چاہیے۔ نیز اپنے جسم کے کسی بھی
 حصے پر ناگ کا نقش کٹا کر دانا چاہئے۔ پھر گولی کے
 نقائصے پورے ہوں گے۔“

سوال محل تو لوگ اس طرح کے عجیب و غریب
 شوق رکھتے تھے مگر اب کی صدف میں لوگوں کا شوق بدل
 گیا ہے۔ وہ نقشے تو اپنے جسم پر بناتے ہیں مگر اپنے نہیں۔
 مگر جو نقش تو اپنے ہاتھ پر بناتے ہیں وہ سر پر ناگ
 دیتا کا نقش ہے۔ تیری بلی وہ اس نے تو نہیں کرے گا
 کیونکہ تو اس کی مخلوق، اس کی رعایا یعنی سائینڈ سے بہت
 محبت کرتا ہے۔ وہ تجھے بہت اچھے گتے ہیں۔

لہذا اس صورت میں اسے، تیرے بچانے دو

ایسے انسانوں کی بلی چاہئے۔ جو تیری کو پورا کر سکے،
 جن کی رگوں میں تیری آواز کی دھڑن دھڑن ہو اور وہ دوا انسان
 ہیں۔ تیری بہن، جس کی بلی کی جانچ ہے اور اگلا نشانہ
 ہو گا تیری ماں۔“

”مگر بھالاجی، میرا دوست آکا ش بھی تو اسی تاریخ
 کو پیدا ہوا ہے۔ کیا اسے بھی کوئی خیرہ ہے؟“ سینل گھویا
 کھویا ہوا۔

”نہیں بالک، اس تاریخ کو بڑے جنم ہوتے
 ہوں گے مگر مہمان دیتا کی ساری شرائط کی کڑی تھ سے ملتی
 ہے۔ حساب کے مطابق ناگ اس کی بلی سیارات کو پیدا
 ہوا تھا۔ اور پھر نقش میں صرف تیرے ہاتھ پر کندہ ہے۔
 میرے پاس ایک بہت طاقتور سانپ کا منگا ہے۔ میں اگر
 وہ تجھے دے دوں تو پھر تو اس سے سانی سے نمٹ۔“
 سنیاں بلایا کے الفاظ غافل میں ہی ایک گئے۔ سینل کیلک
 کر گئی آٹھ گھنٹے پہلے ہوئی گئی تھیں۔

دھاتے ہی سینل کے منہ سے دشاخ زنگی نکل ا اور
 سنیاں بلایا کے ماتھے پر حملہ کر دیا۔ سنیاں بلایا پہلے ہی گنگ
 سا بیٹھا تھا۔

مہمان ناگ دیتا کے زہر کی پہلی بوتل نے ہی
 سنیاں بلایا کی زندگی کا خاتمہ کر دیا تھا۔
 میکا کی انداز میں سینل اٹھا اور گری کا جانب تھا۔
 دیکھ گئے کہ بہت پرستار کو لوں کا بچھو تھا۔

اس کا آخری چارہ چارہ پانی پر سفید چادروں سے ساکت
 پڑی تھی۔ اور گرد و پیش کی بھی تین کر رہی تھیں۔

چھتری ہوئی نظروں سے سینل ماں کو کتنے جا رہا تھا
 جس کے ماتھے پر دو چھوٹے چھوٹے سورن تھے، ماں کا
 چہرہ نیلا کاج جیسا ہوا جا رہا تھا۔ سورن میں سے لپکا لپکا
 خون ابھی کسی رس جا رہا تھا۔

یعنی شاید میں کے مطابق انہوں نے گھر سے اس
 کے ماں کے شوہر کی آواز میں ڈنڈا دے کر اور دیکھا تو
 ایک کالا سانپ تجزی سے بھاگا جا رہا تھا۔ اور اس کی ماں
 ماتھے پر ہاتھ رکھے چلائے جا رہی تھی۔ بہت ڈھونڈا کر



خوف

عمر عثمان علی میاں چٹوٹ

منظر اتنا خوفناک اور دہشت ناک تھا کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، ایک شخص زمین پر پڑا تھا اور لاکھوں کی تعداد میں خونی مکڑیاں اس شخص کے پوروے وجود پر چمٹ کر رہ گئی تھیں۔

دہشت دہشت سے لبریز خوفی واقعہ دیکھ کر لوگ ہچکچاتے ہوئے بھاگ رہے تھے

استائبرن نے نگرہٹ کے پتھر پر کڑی کو اپنے جوتے سے چل ڈالا، کڑی نے نیچے کی بے حد کوشش کی مگر بے سود وہ ایک لمحے سے بھی کم وقتے میں استائبرن کے جوتے کے نیچے گئی۔۔۔۔۔ ایک ٹھانے سے بھی کم وقتے تک کڑی اس کے وجود کے چرواہوں میں جیسے بوجھ تلے رہی۔ چی۔ چی۔ کی نہایت دھیمی آواز۔۔۔۔۔ مذہم سرسراہٹ۔۔۔۔۔ سے وہ کڑی کو

میدہ من گئی۔ اس کی انگلیاں آدھا منچ سے بھی کم سزا کی تھیں۔ اور استائبرن کا قد پانچ فٹ تین انچ تھا۔ اس نے ہاتھ کڑی پر سے اٹھا کر پتھر کی جگہ پر گڑا، پھر اسے ٹھاسا پر مگھسانے لگا اور آخر میں دروازے کے پائیدان سے جوتے کا ٹکڑا گڑ کر صاف کیا۔ پھر دو آگے بڑھتے ہوئے پڑا ہوا پتھر سے انداز میں بولا۔

”معلوم نہیں، گاؤں نے ان کڑیوں کو کیوں پیدا کیا

اس نے مانگ دریا میں سے نکال کر اپنی نئی کالج آکھوں میں بہت سارا سا رنگ اٹھایا ہوا تھا جو کہ مل کا گمان دے رہا تھا۔ سفید دودھ جیسے ہاتھوں گھونڈے کی ہاتھیں تھام رہی تھیں۔

گھر کے سرکاری رنگ کا گھوڑا مین سٹبل کے پار آ کر رک گیا۔

جب سٹبل کو پتہ چلا کہ اس گھوڑا سوار کے پیچھے ایک تیس بائیس سال کی عورت بھی بیٹھی تھی جس کے ہاتھ لیے پال تھے۔ اور جس کی ہاتھوں آگے آتے تھے پھیل ہوئی تھیں۔

ان سے طو، یہ ہماری جتنی ہیں۔ ”شارتری“ اس گھوڑا سوار نے اپنے گلابی ہونٹ گھولے اور پیچھے بیٹھی عورت کی جانب اشارہ کیا۔ نئی کالج جیسی آکھوں۔۔۔۔۔ سٹبل نے اس عورت کی جانب دیکھ کر سر ہلایا۔ جو اب قبیلہ جوڑا اپنے بیٹھی عورت نے اپنا سر بائیں کندھے پر جھکا دیا جس سے اس کے ساجا ہل سرک کر اس کے چہرے پر پھیل گئے۔ جس سے اس کا آدھا چہرہ چھپ گیا۔

”دکرا“ تم نے نہیں دیکھا کیا۔ اس کے اوسرا ہمت سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ انسانوں کے اس سنار میں تمہارا دل نہیں لگے گا۔ اسی کارن ہم تمہیں یہاں سے لینے آئے ہیں۔ تم نے سٹبل میں ناجیون دیا۔ اب تمہارا اسی کارن بنا ہے کہ ہم تمہیں شانتی پر ہوں۔ چلو ہمارے ساتھ۔ ہمارے سنار میں۔

”ناگ مہان دیتا ہے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔“ سٹبل کے ہاتھ پر پڑنے ناگ سے قہقہے میں سے سفید رنگ کی شامیں نکلتی تھیں اور سٹبل کی نئی کالج آکھوں میں جذب ہوئے تھیں۔

ذلتا ہی سٹبل نے اپنا ہاتھ اوپر کیا اور مہان ناگ دیتا کے ہاتھ پر رکھ کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ سرخی کھوڑا تیز دوڑتا ہوا اداکس کے اندر حیروں میں گم ہو گیا۔

اس کا کم دریا سوچوں کے انبار تلے دبا ہوا تھا۔ سنہا سی پانی کی بائیں ایک کر کے اس کے ذہن میں گھوم رہی تھیں۔

لوگوں کی بابت اسے پتہ تھا کہ سنہا سی پانی کو کسی ذریعے ناگ نے فٹن لیا ہے اور وہ بھی اس دنیا سے جا چکے ہیں کیسے انتقال کر گئے۔ اس سے سٹبل عمل طور پر لاعلم تھا۔

”سنہا سی پانی تو رہے نہیں، اب میری مدد کرنا کرے گا؟“ یہ سوچ سوچ کر سٹبل کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔

”پر اب مجھے مدد کی ضرورت ہے یہ کب؟“

سب کچھ تو سٹبل کو پتا تھا۔ میرے پاس کھونے کے لئے اب ہے ہی کیا؟“ اب اس دنیا میں میرے جینے کو کوئی آسرا نہیں ہے۔“ تنہا سٹبل میں لیے سٹبل کی بند آکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

”چاہا کہ اس کی آکھیں صحت سے کھلیں۔ ایک بار پھر اس کی آکھوں کا رنگ بدلتے گا۔ کیا کئی انداز میں اس نے ان گلیاں چار پائی سے اتار دیں اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

رات کے دن دن رہے تھے۔ گاؤں کی فضاء میں ہوا کا عالم ہلاری تھا۔

روایت کی طرح چٹا ہوا سٹبل پر مکہ کے پانے چڑھتے آ کر کھڑا ہو گیا۔ پر گویا شامیں پر بیٹھا اویڑی سے جموں لے گا اور آوازیں نکالے گا۔ اتنے میں دور کہیں سے گھوڑے کی چابوٹی کی آواز آنے لگی۔

نئی کالج جیسی پتھر آکھوں کو سٹبل نے گھوڑے کی ٹاپوں کی ست موڑا۔

دوسری رنگ کا بہت صحت مند گھوڑا تھا۔ گھوڑا سوار کے کندھوں تک آئے پال ہوا میں لہرا رہے تھے۔



”کنہ نہیں رہا جا ہے۔“.....سے نے خود نکلا
کی۔ ”میں مگر سے کہاں ہیں۔ اور عمال کریوں اپنا
طرف چھٹی ہیں“
☆ ☆ ☆
حب محمول انہوں نے ایک سستے سے ہوئی
دیا۔

[illegible]

Dar Digest **139** June 2012 Courtesy ww

آدم آئینہ ہو جوتا۔ وہ اس جانب ہو گیا۔ تہ آدم آئینے کے سامنے پہنچ کر وہ اسے سر پرے کا ہاتھ لےنے لگا۔ نظر بھر کر دیکھنے لگا۔ وہ خود کو یاد رکھا جانتا تھا کہ اس کے سامنے ایک 36 سالہ گرے ہوئے بالوں، گتھی ہوئی مونچھوں اور ڈیلے بدن کا "اکا ڈعنت" نہیں..... بلکہ ایک دلاز تدر کی جسم کا ایک مکڑیوں اور جان کر مڑا ہے۔ اس نے سیاہ رنگ کی ڈرنس پیٹ شرت کے اوپر سیاہ رنگ کا ہی اوڈرکٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کے سر پر ہلکے سیاہ رنگ کی ہی فلیٹ ہیپ ہو جوتھی۔ اسے دوزان اسے بیسی کوڈن کرنے کا خیال ہو جا۔

ifbooksfree.pk Dar Digest 138 June 2012

Dar Digest 141 June 2012

کرے گا۔ اسے دھڑھلائی کا سحر لازمی چمکانے کا۔ خواہ اس کے لئے عدالت میں ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ یہاں کر سنے کے کپڑے تبدیل کئے اور پھر اپنے خوشن کی سرزم پٹی وغیرہ کی۔۔۔۔۔

”اس مایک کو میں نہیں چھوڑ دوں گا۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور ریسرور اٹھاتے ہوئے مایک کا نمبر ملایا۔

فون پر بڑا مایک مل گیا۔ لگتا تھا کہ وہ بیضا شراب نوشی کر رہا ہے۔ اس نے غبار آلود آواز میں بولا۔ ”ہیلو۔۔۔۔۔“

”تم اسی وقت اور ابھی میرے گھر پہنچو۔“

اسٹارن نے ٹھکانا بدلنے میں کہا۔ وہ کڑیاں میرے گھر کے درخانے میں ہیں۔۔۔۔۔ ٹھکانوں بلکہ خبروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ خوف ناک شکل کی ہیں۔ کالی کالی اور بہت ناک کالیاں۔۔۔۔۔

”کیا۔۔۔۔۔ کون بول رہا ہے؟“ مسٹر اسٹارن نے۔۔۔۔۔ مایک نے چمک کر سوال میرے اعزاز میں کیا۔ ”ناب کیا براہم ہے؟ اس وقت آپ مجھے کیوں تنگ کر رہے ہیں؟“

”وقت ضائع مت کرو اور فوراً سے جیٹر میرے گھر آ جاؤ۔“ اسٹارن نے کہا۔ ”کڑیاں کا پورا سلسلہ رہ اور تم پہاڑ میں گرے ہو۔“

دوسری طرف سے شراب کی غنائف طلق سے اترنے کی آواز سنائی دی اور بھرپور سے شعل پر رکنے کی آواز گونجی اور مایک نے اسٹارن کو چڑانے کے سے اعزاز میں کہا۔ ”آپ شاید مجھ سے بھی گھلن زیادہ پہتے ہیں۔ آرام سے سڑ پر لیٹ جائیے۔“

”کیوں مت کرو۔“ اسٹارن کر گیا۔ میں کہہ رہا ہوں فوراً آ جاؤ۔ اپنا جانچو۔ ان گھنوں سے دیکھو اور نہیں قسم کرو۔“

”سنئے سنئے اسٹارن۔ میں تم جیڈی کے کہہ رہا ہوں کہ آپ کو ہم سے ہو گیا ہے۔ آپ کے ہاں کوئی کڑی کوئی زہری نہیں ہے۔“

”ان کی پوری کالونی بلکہ ملک آ بار ہے کہ ہے۔“

تمہاری دھڑی اور دو اداں تک نہیں پہنچ رہی ہے۔ وہ فون کے ابلر ہیں۔“ اسٹارن نے غصے سے لرزتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم نہ آؤ تو گاڑ پاس میں تم پر دھوا کر دوں گا۔ تمہاری کتھی کا سارا کارڈ پاس جس کڑوں کا ہے۔“

”کوہ، تم تو دماغ ہو گئے۔ اچھا اچھا کسی آ رہا ہوں۔ جیٹ فار پوڈ، ایک نے فوراً حاصل کر کر دوسرے بیڑی سے کہا۔ اور کسی زبان میں بڑبڑاتے ہوئے فون بند کر دیا۔

بڑے مایک کو آنے میں پورا ایک گھنٹہ لگ گیا۔ اس دوران اسٹارن کڑوں کے چند جوڑے اور ضروری اشیا سوٹ میں شل رکھ جانے کے لئے دروازے پر تیار کھڑا تھا۔

”کہاں ہیں۔۔۔۔۔ بڑے مایک نے سازو سامان کے ساتھ شرار میں سے اتر کر اسٹارن کی طرف بڑھتے ہوئے بکڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

”آم کر دکھانا ہوں۔“ اسٹارن نے فٹ بگاز کر بولے ہوئے کہا۔

”کیاں کی کڑی کا کوئی وجوہ نہیں ہے۔“ بڑا مایک بڑبڑاتا ہوا اس کے پیچھے مکان میں داخل ہوا۔

اسٹارن نے درخانے میں سے کیا۔ اور وہ فلیش لائٹ چادر میں سرخ ہونے لگا۔

”کہاں ہیں؟ کیا یہی تو نہیں ہے؟“ بڑا مایک کہتا جا رہا تھا۔ اس وقت اسٹارن چیخا۔ ”وہ۔۔۔۔۔ وہ دیکھو۔۔۔۔۔ اے ہو۔۔۔۔۔“

پولس اہل کے مارے اس کے ہاتھ سے فلیش لائٹ چھوٹ گئی۔ درخانے میں گھپ اندر اٹھ گیا۔ پھر ایک عجیب عجیب اور کسی بوجھ کے دھڑام سے گرنے کی آواز سنائی دی۔ اسٹارن نے فونل کر فلیش لائٹ اٹھائی اور اسے دوبارہ on کرتے ہوئے چلایا تو اس کی جینیں ٹھل گئیں۔ ستر اتر خوف ناک اور دشت ناک سے پر ہل تھا کہ کڑی اسٹارن کے بدن کے روٹھنے کھڑے ہو گئے۔ بڑا مایک زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اور اس کے پورے چہرے، سینے، ہاتھوں پر شکر سیاہ چادر جیسی جاری

تھی۔ اس کے جسم کے چاروں اطراف کڑیاں ہی کڑیاں کھڑی ہوئیں تھیں۔ جو کہریک رہی تھیں۔ بھاگ دوڑ رہی تھیں۔ دھڑکی ہوئی تو وہ سب اسٹارن کی طرف بڑھیں اور وہ فلیش لائٹ چمک کر بھاگ کھڑا ہوا۔

وہ بھاگتا ہوا درخانے سے نکل کر گھر میں اتر ہوا، سوٹ کیس اٹھایا اور وہی دروازے کے بائیں سرٹ بھاگا۔ پورچ میں سے اس نے کارڈ نکالی اور ایکسی لیٹر پر پاؤں پوری قوت سے رکھتے ہوئے اس کی سرک کی حدود میں سے کالی دور نکلیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ نیک سٹینوں کی پروا کے بغیر سوٹ پر کارڈ دروازے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شہ پر خوف پھرا ہوا تھا۔ بلکہ رہا تھا۔

جب وہ گھر کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تو اس کے ہوش کچھ کھٹکانے آئے۔ اور وہ سوچنے لگا کہ کیا کر رہا ہے؟ کیا کہا جا رہا ہے؟ کیا کچھ نہ کر رہا تھا۔ اس نے ایک پلگ دھری کچھ پر کارڈ کی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے ریسرور کو پڑل پر اٹھایا۔ اس کے ہاتھ تیزی کے ساتھ عقب خبروں کو پھینک کر تے جا رہے تھے۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ کون؟“ رابطہ قائم ہوتے ہی میسنی کی غونڈی کھڑی آواز سنائی دی۔

”میسنی۔۔۔۔۔ میں ہوں۔ اسٹارن۔“ اس نے جمبیر آواز میں بولے ہوئے کہا۔

”اسٹارن۔۔۔۔۔ اس نے جمبیر سے جگانے کی ضرورت کیل چیش آئی؟“ میسنی نے اس کے بارے سے پوچھا۔

”میں۔۔۔۔۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“ اسٹارن نے تقریباً روبا کی آواز میں کہا۔ ”مجھے رہنے کے لئے جگہ چاہیے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔“ میسنی نے تھوڑے لہجے میں کہا۔ وہ اب پوری طرح جاگ مٹی تھی۔ اس وقت۔۔۔۔۔ تو پاگل نہیں۔

”but“ میسنی۔۔۔۔۔ میں ایک مصیبت میں نہیں کیا ہوں۔“ اسٹارن نے عاجزی سے کہا۔

”کیسی مصیبت۔۔۔۔۔“ میسنی نے اسی طرح تجلی سے پوچھا۔

اسٹارن نے اپنے ہونٹ پر دم کا نشان چنایا۔

”فون پر اسے سب کے سب بتاؤں؟“ اس نے دل میں دل میں سوچا اور ملامت سے بولا۔ ”میں۔۔۔۔۔ فون پر بتا نہیں سکتا۔ فون فلیش لائٹ میں۔۔۔۔۔“

جواب میسنی نے کچھ نہایت آہستہ سے کہا جسے اسٹارن سن نہ سکا اس کے بجائے اسے پس منظر میں ایک مہمان آواز سنائی۔ اسٹارن اس آواز کو ڈرا کر بیان کیا۔ یہ آواز بڑے مایک کے بیٹے چھوٹے مایک کی تھی۔ وہ کچھ کیا کہا اس وقت میسنی کے روم میں چھوٹا مایک موجود ہے جس نے شاید اس کی جگہ لے لی ہے۔

”کیا ہو رہا ہے؟ کون ہے تمہارے ساتھ۔۔۔۔۔“ اسٹارن نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

دوسری طرف کچھ کھوکھوں کے لئے خاموشی چھائی رہی۔ پھر میسنی کی لرزتی ہوئی کھڑکی کی طرح سنائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”کہاں کیا ہو رہا ہے؟ کوئی بھی تو نہیں ہے۔۔۔۔۔“

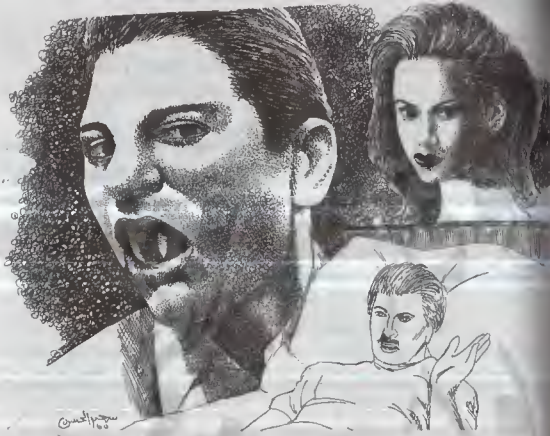
اسٹارن نے کچھ کہنے کے بجائے پھکارتے ہوئے اعزاز میں ریسرور کھڑکیا۔ وہ کار کی جانب بڑھا تو اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ خیالات گنڈہ ہوتے تھے۔

”کڑیاں بولنا کھینچتی ہوئی چھوٹا مایک۔“

اس نے کار اسٹارن کی اور اسے آگے بڑھایا۔ اس نے رات بسر کیلئے کے لئے ایک سستے ہوئی کا انتخاب کیا اور ایک کڑی کر دیا۔ اندر جا کر اس نے سوٹ میں کھول کر اور ٹول اور کپڑے نکال کر کچھ روم کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے سوچا کہ اندر کچھ ناہم وہ ملتا چاہیے۔

”جہانے کے بعد پولیس کو کال کر کے بڑے مایک کے بارے میں انفارم کراؤں گا۔“ اس نے خودکھائی کرتے ہوئے کہا۔

پھر اس نے دروازہ بند کیا۔ جلدی ڈنگ کے ساتھ لٹکا یا اور شاد کھولا۔ پانی کی خشکی اور باریک کر سونی



سچی بات

پیاسی دوستی

ایس حبیب خان - کراچی

نوجوان کے سینے میں صلیب ہیوست تھی اور پھر اچانک کھڑکی کا پردہ ہٹتے ہی مسود کی روشنی جب نوجوان پر پڑی تو چشم زدن میں نوجوان کے جسم میں شعلے بھڑک اٹھے اور نوجوان کا جسم دھڑا دھڑ جلنے لگا۔

خوف و ہراس کے لبادے میں لٹی ہوئی ایک لڑخا حیرت انگیز قرعہ گزیر ہو کر گزرتی گئی

کہتا تھا، یوں دُور، دُور، دُور، دُور، سارہ بیٹی کی لیزور تھی، اس کے علاوہ وہ لٹاری بھی لے کر گئی تھی۔ اس نے جینفر کے ساتھ مل کر دو، تین ساگ کیڑی بھٹی کئے تھے۔ جینفر آج کل ساگ کے لئے شاعری کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

”جینفر یاد رکھتا ہوں کہ لگا لگا ساگ لکھنے میں؟ ایک ہی ساگ تیار نہیں ہوا، اب کم کیا تاکہ ریلیز کر سکیں

تھتھوں سے پورا کئے کوئی ہاتھ تھا۔ کافی ختم کرنے کے بعد وہ پانچوں باہر آئے کہ ان کی مہنتیں ختم نہیں ہوئیں۔ سارہ، برائن، جینفر، کیون اور مکمل، یہ فریڈز کا گروپ تھا اور اس طرح کی مہنتیں ان کا معمول تھیں۔ ان کی دوستی کا ختم ہونے کے بعد بھی قائم تھی۔ میڈوک ان سب کی کمروری تھی اور انہوں نے مل کر ایک ”ٹراک بیٹ“ بھی بنایا تھا۔ برائن کے کارٹے

پہلو اس کے بدن پر پڑنے لگی۔ اس نے سستے ہوئے کے کٹیا صاف سے خوب مل کر نہایا۔ پھر ہال سے بدن خشک کیا اور دوسرے کپڑے پہنتے لگا۔ تو وہ بے اختیار رک گیا۔

کوئی چیز کپڑے اور اس کی جلد کے درمیان سرسرا رہی تھی۔ اس نے ہاتھ تھوڑا نیچے کیا تو وہ تقرراً کرہ کیادہ ایک بیڑی کی کالی کڑی تھی۔ اس نے کپڑے اتارنے کے بجائے انکس و دین چھوڑا اور چلنے کے ٹاول جسم پر لپیٹ کر دھائی تھیں پر سے عین اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو ایک کالی کڑی اپک کر اس کے بازو پر آ گئی۔ اس نے جھکے سے اسے بازو پر سے جھماڑ اور عین اٹھانے لگا تو وہ کڑی کے بالے میں پھنسی ہوئی تھی۔ جس میں درجنوں کے حباب سے کڑیاں اندر باہر چل رہی تھیں۔ ریک رہی تھیں۔ اس کے بازو سے ہونے ہاتھ رک گئے۔ وہ عین دین چھوڑ کر بھاگ بھاگ کمرے میں گیا۔ دوسرے کپڑے لٹانے کے لئے سوٹ کس اس نے جوں ہی گھولا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

سوٹ کس میں بے شمار کڑیاں ریک رہی تھیں۔ وہ تیزی کے ساتھ ابل ابل کر..... اچھا! اچھا! کر باہر آ شروع ہو گئیں۔ شاہین تیزی کے ساتھ لڑکھارتے ہوئے پیچھے ہٹا اور بھاگ کر دروازے پر پہنچا۔ اس نے دروازہ کھولنے کے لئے پھنڈل کی جانب ہاتھ بڑھایا تو وہ خوف و ہراس سے لبریز چیخ مارے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔ پھنڈل کی جگہ بیش کا ایک سیاہ رنگ کا بال ball نظر آ رہا تھا۔

چھوٹی چھوٹی کڑیوں کے درمیان ایک بیڑی کی کڑی بیٹھی ہوئی تھی۔ جس کی انگلیں کہ اسے کچھ چانچ لگی تھیں۔

”تم..... تم کیا چاہتی ہو؟..... میں تمہارا نشانہ کیوں..... کیوں بن گیا ہوں؟ میں نے تم سب کا آخر کیا لگاڑا ہے؟ اس نے..... سکیاں لیتے ہوئے بڑے روہائی انداز میں کہا۔ عینک سے بغیر اسے اب اور بھی کم



گئے ہم؟" سارہ نے کہا۔

"ہو جائے گی الیم بھی ریلیز اور ساگ بھی تیار....." جینٹر نے فس کر آکھ مارتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ مذاق کرتے رہو، میں خود کو شش کرتی ہوں۔" گھر آکر وہ اپنے بستر پر اونٹنی گرتی۔ کافی دیر تک ایسے پردے رہنے کے بعد اس کے بستر پر بڑا ہوا

ریوٹ اٹھایا اور بی دی آن کر دیا۔ ادھر ادھر چیل بدلنے کے بعد اس نے ایک میڈک چیکل پر ریوٹ روک لیا۔ اسکرین پر اس کے فیوٹ راک بیڈ کا

کنٹرول آ رہا تھا، کوئی اور وقت ہوتا تو سب چوڑھا ڈاکڑ بیٹھ جاتی مگر اس وقت اس کی نظر میں اسکرین پر نہیں مگر

ذہن نہیں اور پھر کافی دیر بعد اس نے بی دی آف کر دیا اور اس کی بجائے پرا کر سناٹے کی کوشش کرنے لگی۔

جب کچھ نہیں سمجھا تو اس نے جین ڈور سے تھیل پر پٹ پٹایا اور ہاتھوں کی انگلیاں ہالوں میں ڈال کر سر جھکا لیا۔

اگلے روز سارہ دوست پریش کرنے بیٹھے مگر ان کے پاس زیادہ کچھ تھا ہی نہیں جس کی وہ پریش کرتے۔

"یار! ایسے کیسے کام چلے گا؟" کین نے جھنجھلا کر کہا۔ وہ لوگ سارہ کے گھر کے انٹر کمارڈ میں پریش کرتے تھے۔

رات کا کھانا کھا کر سارہ گاڑی لے کر یوں ہی باہر نکل آئی۔ ڈرائیو کرتے ہوئے بھی وہ ساٹک کے بارے میں سوچ رہی تھی اور اسے یہ پوری نہیں چلا

کر وہ بھی سائڈ سٹریٹ سے اس کے ایک بے لگائی اور کافی دیر اسٹرٹ پر سر کھانچ رہی تھی پھر اس نے مابری

سیٹ پر رکھا کھانا اٹھا لیا اور چلتی ہوئی پھرد پر آ کر بیٹھ گئی۔ وہاں زیادہ لوگ نہیں تھے اور اندر میرا بھی

تھا۔ پھر سارہ کی انگلیاں گتار پر حرکت کرنے لگیں۔ وہ آہستہ بند کئے تھے وہ اپنی کپڑی کی ہوئی جن

نے غلطی کر لی اور جب وہ تھک گئی تو اس کی انگلیاں رک گئیں مگر انھیں یہ ستور بند نہیں۔ اچانک تیلوں کی

آواز پر اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ تو اس کی نظریں اپنے سے تھوڑے فاصلے پر جا کر گئیں۔ تھوڑے

فاصلے پر ایک نوجوان پتھر پر بیٹھا ہوا تالیاں بجا کر اسے داد دے رہا تھا۔ پھر نوجوان اٹھ کر اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

"ہائے! آئی اےم ڈاکٹر۔" اس نوجوان نے سر کو ہلکا سا جھکا کر کہا۔

نوجوان کے قریب آنے پر سارہ کے پورے جسم میں سسٹناٹ ہوئے گی۔ وہ نوجوان غیر معمولی حد تک لاپرواہت مند لگ رہا تھا، ڈاکٹر براؤن بڑے

بڑے سے تالیاں اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی رگت بہت سفید اور آنکھوں میں عجیب سی

چمک سفید رنگ کی الگ سی نظر آ رہی تھی، سرخ بوٹ اپنے سے چھپے بھی خون چمک پڑے گا۔

سارہ فیکر بھی آئی، ایک جھٹکے سے اٹھی اور تیز تیز قدم اٹھاتی آ کر بڑے کی اور پھر دو چلتے چلتے جیسے

بھاگنے لگی، جانے کیوں اس خوف شص ہوا تھا۔ وہ جلدی سے اپنی گاڑی میں بیٹھی اور جھٹکے سے کار آگے

بڑھا دی۔ کافی اگلے نکل کر اس کو خود اپنی حرکت پر کسی آنے گی۔ ادھر نوجوان نے وہ گتار ہاتھ میں اٹھالیا جو

سارہ کو کھات میں چھوڑ گئی تھی۔ تنگ کی آواز نوجوان کی اچھی سمیٹنے پر تیار کی اسٹرٹ سے آئی تھی۔ اس

نے سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے کہا۔ "سارہ!" سارہ اگلے گھر روز اپنے فریڈز کے ساتھ ایک

بوٹ میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھی، ہاتھوں نے کھانا کھایا۔ ہل پیل کرنے کے بعد گاڑی میں بیٹھ کر اس کو تنگ کرتے

ہوئے ادھر ادھر گاڑی دوڑاتے رہے، کار کے شیشہ بند تھے گاڑی میں کافی حواں پھر چٹا۔ اب وہ گاڑی

میں سارہ کے گھر کے قریب پہنچ گئے تھے انہوں نے سارہ کو گھر کے قریب اتار دیا۔ سارہ نے اپنے پرے سے

چائی ٹال کر کیٹ میں گتالے میں لگا دی کاسے کسی نے پیچھے سے آواز دی۔ "سارہ!" اس نے ادھر ادھر

دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ "دیکھو یہاں!" آواز گھر سے دو قدم دور

گئے بہت ہی اونچے درخت پر سے آ رہی تھی۔ سارہ نے

بتایا۔

"اودا رنک! میرا بھی بیڈ ہے مگر میں اسٹریم میں نہیں آیا ابھی۔ آپ میرے بیڈ نمبرز سے ضرور

ملیں۔" سارہ نے ایکسٹینڈ ہوتے ہوئے کہا۔ "لوکے! مگر صرف رات میں۔" وکٹر کی

آنکھوں میں جانے چلا۔ ابھی ایک اور پھر دہانے کہہ کر وہاں سے جانے لگا۔ سارہ بھی اپنے کیٹ پر آگئی

پھر اس نے پلٹ کر کچھ کہا چاہا۔ "وکٹر!" مگر وہاں سنسن سڑک کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ سارہ کچھ دیر

دیکھتی رہی پھر کندھے سے اچانک کمر کے اندر دھال ہو گئی اور پھر اس نے اپنے فریڈز کو کال کر کے وکٹر کے بارے

میں بتایا۔ دو لوگ بھی خوش ہوئے۔ دوسرے روز رات ہوئی تو سب لوگ سارہ کے

گھر پہنچے اور وکٹر ان انتظار کرتے گئے سب سے زیادہ بے چین سارہ کی تھی۔ تین بیٹے ہی وہ دین میں پڑے چاہر

جیسے ہی اس نے گٹ کھانا تو دھک سے گیت کی کھنک دہاں وکٹر کھڑا تھا۔ سبھی گلی اور بولی! "چلیز کیا؟"

وکٹر نے جیسے ہی گھر کے اندر قدم رکھا تو بچہ سے بندھا کتا زور سے بھونکنے لگا اور اپنی ذہنی کرکشی جھٹکے دینے

لگا۔ سارہ کتے کو مخاطب کر کے بولی! "ٹانگہ کیا ہوا؟" مگر کتے کا تھا بھوک رہا تھا۔

وکٹر چٹا ہوا کتے کے قریب آیا اور جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ کتے سے ہونے کا

نیچے جھک گئے اور وہ میں پلنگ کر خاموش بیٹھ گیا۔ "وکٹر تو چادو گھر ہو گیا!" سارہ نے مذاق میں

کہا پھر دونوں مسکرائے ہوئے اندر چلے گئے۔ بیڈ کے قریب پہنچ گئے۔ سارہ نے وکٹر سے ملاقات کی اور اس سے بہت

جناڑ ہوئے۔ وکٹر کو راک میڈک کی کافی ناخوشی تھی۔ پھر سب نے وکٹر سے ضد کی کر وہ ان کی میڈک میں عد

کرے۔ اور پھر وکٹر ان کیا اور بولا "سارہ کے لئے کوئی میں کسی طرح کی اہلیط کے لئے تیار ہوں۔" سب

سے پہلے وکٹر نے ان کے بیڈ کا نام "ٹائٹ وارڈ" رکھا۔

جھپٹنے نے جب بچہ میں قدم رکھا تو وہاں
 حوائے برائے کوئی کبھی نہیں تھا۔ یہاں لوگ ابھی بچنے
 نہیں تھے اور سارہ فون پر بات کر رہی تھی..... جھپٹنے کو
 رانا سمجھا اور اس نے برائے کو بچنے سے ڈرانے کا ارادہ
 کیا۔ یہاں تکھا ہوا ہے لٹاری اسٹریٹ درست کر رہا
 تھا۔ جھپٹنے نے بڑی مشکل سے اپنی جھڑکی روکی اور بے
 مذہم برائے کی پشت پر آکر کھڑی ہوئی۔ اس سے
 پہلے کہ وہ اسے ڈرائے، اس کی نظیر میں اس کی گردن کی
 گڑھی ہوئی گردن پر کسی تو اس کی نظر پڑے۔ لٹاری اسٹریٹ
 کے کالوں میں خون کی آبرو کی آواز دوڑنے لگی۔ اس کا

انہی روز سے پریکٹس سیشن میں جینفر اور کیون
میں آ رہے تھے۔ ریکل نے سارہ کے گھر سے نکلتے

”تم یہاں کیوں آئے ہو؟“
 ”ایک منٹ“ کہہ کر کوئلے نے اسے پیٹھیا اور
 جب دو اہلن آ یا تو اس کے ہاتھ میں دو گلاس
 اس نے ایک گلاس کا دستہ پر رکھ دیا اور دوسرا
 کے ہاتھ میں تھا۔ دو اہلن اس میں سرخ رنگ کا
 شرب تھا۔ کیونکہ جیسے ہی اس کا ایک سپ
 سے زوردار آکاٹی آگئی۔ اس کے منہ میں خون کا
 واضح تھا۔ اس نے شربد تو کھنٹا چاہی تھا کہ
 نے اسے روک دیا۔ ”توبہ... توبہ...!!“ لانی فریضہ، یہ
 کی طرف سے ایک سازش کی پیمان ہے اور تم اس کی
 کر رہے ہو؟“
 ”مگر اس کا ذائقہ تو بالکل.....“

جائے۔ آپ نے اسے دیکھا ہے؟

اکیسراٹھ جنیفر مارہ کے گھر سے واپس جا رہی تھی کہ آدھے راستے میں پہنچ کر اس کی گاڑی بند ہو گئی۔ "شٹ! اس نے مجھلا کر کار کو دروازے سے ٹھوکا ماری اور کار سے نکل گیا کہ ہونٹوں میں گریٹ دبا کر اسے سلاتے ہوئے۔ رات کا بی ہونٹوں کی اور شیشی ہوری تھی، جب کافی دیر تک کسی نہیں آیا تو وہ مڑی "شٹ!" کی زوردار آواز دینے لگی کہ بیٹا پیٹھ پر نہائی دی۔ جنیفر مڑی مگر وہاں کسی نہیں تھا۔ اس نے سن سائیے سے بھر "شٹ!" کی آواز دی کہ اس نے سن سائیے میں دیکھا ہو گا۔ اس نے کچھ نہیں تھا۔ اسے خوف آنے لگا، اس نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور آکر اندر بیٹھ گئی اور دروازہ لاک کر لیا۔ اس نے نظر اٹھا کر تو شیشے میں اسے پیچھے سے دیکھ کر کھڑنچا۔ جنیفر نے کھم کھم کرتے ہوئے غائی تھی۔ وہ واپس سیم کی ہوئی تو دیکھا کہ اسے گھر کی طرف کھڑا تھا۔

کڑا۔

منہ لکھا اور کیلے دانت باہر آگئے وہ بے اختیار برائے کی گردن پر جھک گئی اور اپنے دانت اس کی گردن میں گاڑ کر اس کا خون چنے لگی۔ برائے اس کے لئے ہانکل تانائیں تھا وہ بچے لڑھک گیا مگر جینفر نے اس کی گردن کوئیں چھڑا۔ وہ برائے پر اندھ مگر مٹی ہوئی کسی اور برائے اس کے پیچھے بہ ربط ہاتھ چلا رہا تھا۔ مگر اس غنودگی ملاری ہوئی۔

اچانک کسی نے جینفر کے شانے پر ہاتھ رکھا تو اس نے فراتے ہوئے پیچھے دیکھا اس کے ہونٹ خون سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ دکنر کا ہاتھ تھا۔ اس نے سسکراتے ہوئے انگلی کوٹان کے اشارے میں ملایا اور برائے کی گردن کو صاف کر دیا۔ جینفر نے جلدی جلدی اپنا منہ صاف کیا اور برائے کو ہوش ملانے لگی۔

وہ تھکلی نے ڈنٹر ختم کر کے اپنی پلیٹ بچن میں رکھی اور ریکلی میں آکر کڑی ہوئی جا بہت اچھی ہوا چل رہی تھی۔ کیوں تاہم وہی اس کا رگنک پلے جاتے ہی سوچ کر اس نے جاگڑ پینے اور گھر سے نکل آئی۔ وہ اکثر ڈنر کے بعد نکل آتی تھی۔ اس کے ہلاک کے اور لوگ بھی ایسا کرتے تھے۔ مگر آج وہ لالچھی۔ بھراکھی دیکھنے کے بعد وہ تھک کر داپن آئے گی۔ یکدم اس کے ہاتھیں طرف سے کوئی کان چلی اڑتی ہوئی گزری

اس نے اس طرف دیکھا مگر وہاں صرف درخت ہی درخت تھے۔ وہ آگے بڑھنے لگی۔ پھر دکنر طرف کوئی چیز نہ گزری، آتی نہ گزری۔ وہ اس کے پورے بال اندر کر اس کے منہ پر آگئے۔ وہ خوفزدہ ہو کر بھاگنے لگی اور اپنے گھر میں داخل ہو کر دروازے سے لپک لگا کر گھر سے سانس لینے لگی۔ پھر جب وہ بہتر ہوئی تو اپنے گھر سے مل آکر بستر پر لیٹ گئی۔ خوف اب بھی اس کے اندر موجود تھا۔ اچانک اس کو چادر کے نیچے اپنے جسم پر بچھریٹکا ہوا سون سے ہوا اس نے ایک جھٹکے سے چادر ہٹا دی مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا، پھر وہ بستر میں دبکی کی اور کس کر تھیں بچھ گئیں۔ دکنر کڑی سے اندر داخل ہوا اور نکل کے بستر

پر آکر بیٹھ گیا۔ ریکل نے اس کے ہوج سے بستر دے کر حوش لے لیا اور آٹھیں کھول دیں مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے جیسے اپنے برابر میں دیکھا، دکنر اس کے بستر پر موجود تھا، اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہے دکنر نے اس کو کھلا کر بستر پر لٹا دیا اور اس کی گردن پر جھک گیا، ریکل نے دکنر کے ہولکا کر کے دھکیلتا چلا کر اسے اپنی گردن میں سویاں اترتی ہوئی محسوس ہوئی اور پھر وہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی اپنی گردن سے چپے ہوئے دکنر کو نہ ہٹا سکی جو بے تابی سے اس کا خون چس رہا تھا۔ پھر وہ ریکل کو بے ہوش چھوڑ کر کڑی سے چھٹا لگا کر غائب ہو گیا۔

پولیس کو بھی اس علاقے سے اس کی لاشیں ملی تھیں جن کے جسم سے خون غائب تھا اور گردن پر دو سوراخ موجود تھے۔ مگر پولیس کوئی بھی سراغ لگانے میں ناکام رہی۔

سارہ نے اپنی کچھ چیزیں لیں اور گھر کی طرف مڑ گئی۔ ابھی وہ جا رہی تھی کہ اسے ایک غریب عورت نظر آئی جو چھوٹی موٹی چیزیں بیچ رہی تھی۔ سارہ کو اس پر ترس آ گیا اور اس نے اس سے ایک لاک خرید لیا جس پر وہی سیلپ بنی ہوئی تھی۔ مگر آکر اس نے لاک دروازہ ڈال دیا۔

ڈور ٹیل بھی تو سارہ بکن میں بیٹھ پڑ بیٹاری تھی۔ اس نے اسے باہر جا کر کینٹ کھولا تو سب فریڈ ڈانگے تھے، اس نے انہیں اندر گرا ڈھ جانے کا اور خود کو بیٹھ پڑا کر اس کے گرد لگے گی، اسے خبر بھی نہیں ہوئی کہ کس برائے اس کے پیچھے آکر کھڑا ہوا تھا۔ برائے کی نظر سارہ کی گردن پر موجود پھولی ہوئی رگ پر پڑی۔

اس سے پہلے کہ وہ سارہ پر بچھپنا کسی کے تیز دھانے لے جیسے تائن اس کی گردن میں گھسنے لگے۔ برائے نے بڑی مشکل سے پیچھے ہٹ کر دیکھا تو وہاں دکنر کھڑا تھا جس کی آنکھیں شعلہ لگی رہی تھیں۔ اس نے ایک جھٹکے سے برائے کو پیچھے ہٹنے لیا۔ سارہ کو لگا اس کے پیچھے کی چیز اڑی ہے اس نے دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہیں

تھا۔ دکنر نے برائے کو ٹوٹن پر پھینک دیا اور دھاڑ کر بولا "اگر سارہ کو کوئی نقصان پہنچا تو وہ حشر کٹر کر دے گا!" "مگر کیوں دکنر؟" برائے کی پیچھے موجود جینفر نے سوال کیا۔

"فرق کیوں؟" ریکل بھی بولی۔ "سارہ؟" دکنر اتنا کہہ کر کک گیا۔ "سارہ کیوں دکنر؟" کیڈن نے پوچھا۔ "سارہ میری دوست ہے!" دکنر نے بوجھل اعزاز سے کہا۔

"دوست؟ لاہور! یہاں کوئی کسی کا دوست نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو تم جیسا بننے کے بعد۔" برائے نے اٹھ کر کھانسی سے کہا۔

"جو بھی ہو، میرے ہوتے ہوئے سارہ کے ساتھ کچھ نہیں ہوسکتا۔" دکنر نے دو ٹوک اعزاز سے کہا تو سب خاموش ہو گئے کیونکہ دکنر ان کا سر ہرما تھا اور کسی کی مثال نہیں کی کہ اس کی بات کی گئی کہ۔ اور پھر ایک ایک کر کے وہ لوگ وہاں سے چلے گئے صرف وہ دکنر گیا۔ سارہ آئی تو دکنر نے بھانہ کر کے اس کو کھ دیا کہ "آکھیں اس کام سے بچنا ہے۔"

دکنر نے دیکھا کہ ہوتے ہوئے بھی سارہ کو کچھ نہیں کیا۔ کیوں اس کا جواب خود دکنر کے پاس ہی نہیں تھا۔ اپنے آپ کو سارہ کے خون سے دور رکھا دکنر کے لئے بہت مشکل تھا جو کہ اس نے سارہ کی دوستی میں کر رکھا تھا۔

"سارہ اچھے ختم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" دکنر نے سارہ کو مخاطب کیا۔ "ہاں۔ ہلو دکنر۔"

سارہ نے بیٹھ بیچ ختم کرتے ہوئے کان کا سپ لیا اور بولی۔ "سارہ مجھے کچھ بتانا ہے جہیں مگر مجھے ڈر ہے کہ تم وہ جان کر مجھ سے دوستی ختم نہ کر لو!" دکنر نے سنجیدی سے کہا۔ "ایسا کیا ہے دکنر؟" سارہ نے چونکتے

ہوئے کہا۔

"سارہ! میں انسان نہیں دیکھا ہوں۔" دکنر نے سارہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

سارہ چند لمبے اسے خاموشی سے کھتی رہی پھر قہقہہ مارنے لگی اور بولی! "آج کوئی بے نہیں تو میں ہی ملی ہوں نہیں بے وقف بنانے کے لئے، نام نہان بیڑ کا نام نہان "کڑا کڑا کھانے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم "دیکھا؟"

"سارہ پلیز! آئی آپ کیمرہ نہیں۔" دکنر نے سخت لمبے میں کہا اس کو سارہ کا یوں مذاق کرنا پسند نہیں آیا۔ سارہ چپ ہو گئی مگر وہ اب بھی ہلکے ہلکے ہنس رہی تھی۔ "چھ! تو کیا سارہ؟ وہی شہوت دو۔" اس نے دکنر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

دکنر سارہ کے اور قریب آ گیا اور بولا! "یاد کرو میں تم سے ہمیشہ رات میں ملتا ہوں، غور کیا کیوں؟" "یہ تو کوئی شہوت نہیں ہے۔" سارہ نے پروائی سے ہنسنے ہوئی۔

"فیک ہے!" دکنر نے سانس بھر کر بولا اور اپنی آنکھیں بند کیں اور چھوٹوں بندھو کھلیں تو وہ خون بھری سرخ آنکھیں تھیں، اس کے تائن لمبے ہونے لگے اور اس کے دھانے سے اس کے سانس کے ٹوٹیلے دانت باہر آنے لگے۔

سارہ کی ہنسی کو یکدم بریک لگ گئے اور پیچھے ہٹنے لگی۔ دکنر نے منہ بچھا کر ڈھ پر اٹھایا تو وہ داہنی ٹانگیں حالت میں تھا۔

"سارہ جب سے ہماری پہلی ملاقات ہوئی ہے۔ میں نے تمہیں ہمیشہ دوست جانا ہے۔" یہ کہہ کر دکنر سارہ کے پاس آئے گا۔

"دوست جاؤ! خبر دو میرے قریب آنے کی کوشش کی۔" سارہ ڈر کر دروازے سے جاگئی۔ سارہ کی نظر اپنے برابر میں موجود دروازہ پر پڑی اسے یاد آیا کہ اس نے صلیب کا لاک اس میں ڈالا تھا۔

"سارہ پلیز! مجھ سے ڈرو تم میں تمہارا

دوست ہوں۔ ”وکنز نے پہلی سے کہا۔

”تم جانتے ہو یا.....“ کہہ کر سارہ نے صلیب نکال کر وکنز کی آنکھوں کے سامنے کر دی۔ وکنز نے جلدی سے اپنا ہاتھ آنکھوں کے آگے کیا اور لہجہ میں غائب ہو گیا۔ سارہ کا دماغ من ہو گیا تھا اور وہیں کرکے بے ہوش ہو گئی۔

اگلے روز اس کے فریئڈز آئے تو ان کا انداز سارہ کو عجیب سا لگا۔ روکھا اور دکھا سا..... سارہ نے بات کرنے میں پہل کی اور بولی: ”دوستو! وہ وکنز کا ہمارے پیئڈ سے کوئی تعلق نہیں ہے، پوچھو گے نہیں کیوں؟ میں بتاتی ہوں کیونکہ.....“

”وہ؟“ ”یہاں؟“ ”ہے۔“ ”کیون نے بے ہوش سے کہا۔ تو سارہ کو حیرت کا ایک زوردار جھٹکا لگا۔ ”تم! جانتے ہو؟“

”اے! پیئفیر! نہ کہا۔“ ”مگر کیسے؟“ سارہ حیران تھی کہ نہیں ڈر نہیں لگ رہا؟

”کیونکہ اس نے ہمیں بھی دیکھا تھا یا ہے۔“ ”نیکل نے بتایا اور پھر ایک ایک کر کے ان میں سے اپنا آپ اس پر ظاہر کر دیا۔ سارہ نے ہو کر دیکھی۔ لیکن پھر برائے بولا! ”سارہ! ہمارے فریئڈ اور پیئڈ لیزہ ہونے کے ناتے تو تمہیں بھی دیکھا تھا ہونا چاہیے کم ایڈ جوائن اٹ۔“

”دور دور سب مجھ سے۔“ یہ کہہ کر سارہ پیچھے ہٹنے لگی مگر اس کے پیچھے دو چارے وہ اس سے جا مل گئے۔ اس کے پاس بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا پھر کیون اور پیئفیر نے سارہ کو دونوں طرف سے چلا لیا۔ برائے آگے چل آیا اور سارہ کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

”ہیلز لیزہ!“ ”سارہ نے اس کی مگر برائے تو کچھ اور ہی ہو گیا تھا اس نے اپنے نوکیلے ناخنوں سے سارہ کے بال ہٹانے تو اس کی سفید گردن نظر آنے لگی۔ برائے سارہ کی گردن پر جھک گیا اور سارہ کو کوئی اپنی گردن میں اتارتی محسوس ہوئی۔ ”آہ! اس کے منہ سے آواز نکلتی

گئی۔ پھر برائے ایک جھگکے سے پیچھے ہوا اور ہوا میں اڑتا ہوا دور جا کر۔

سارہ کو اب سامنے وکنز نظر آ رہا تھا۔ برائے لٹ کر غریبا۔ ”وکنز! اوں اذنا ت فیر۔“ ہم سب پہلی غاموش ہو گئے تھے مگر بات نہیں۔

”کس میں ہمت ہے، وکنز کے نیلے کو پیٹنے کرنے کی؟“ ”وکنز نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سب کی جانب دیکھا۔ پھر اگلے لمحے اس کی شکل بدل گئی وہ بہت خوشنور ہوا تھا۔ وہ اڑتا ہوا برائے کے سر پر پہنچ گیا اور اپنے دانتوں سے اس کی گردن اڈویڑ دی، پھر برائے کو پیچھ کر وہ کیون کی طرف چلتا اور اپنے لمبے ہاتھ کیون کے سینے میں سیدھ کر اسے چرو ہا اور اس کا دل ٹھکی میں سے کچھ نکال دیا۔ پھر وکنز نے برائے کی شکل کی طرف کیا۔ ریکل خوفزدہ ہو کر بھاگنے کی فکر کرنے لگا۔ اسے موقع ہی نہیں دیا اس نے ریکل کو ایک ہاتھ سے گردن سے پکڑ کر ہوا میں اٹھالیا۔ ریکل اپنی ناگھیں چلا کر اپنا بچاؤ کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر وکنز کے ہاتھ اس کے زخروں میں محسوس چلے گئے۔

اگر سارہ نے اپنے حواسوں پر قابو پا لیا تھا تو وہ وکنز کی اور صلیب اپنی جگہ میں دبا کر ایک کونے میں چھپ گئی۔ وکنز نے پیئفیر کو پکڑنا چاہا مگر وہ بھاگنے کی اور قانون میں اٹھ کر پیئفیر کی گردن پیئفیر کے اوپر سوار ہو گیا اور گردن سے لے کر پیٹ کا اسے پیئفیر ڈالا، اب پیئفیر کا جسم گوشت کے ٹکڑوں کے گ رہا تھا..... پیئفیر کا کام تھا کہ اس کے بعد وکنز اور ادرہ نظر میں دوڑانے لگا، وہ کوئی خوشنور اور ادرہ معلوم ہو رہا تھا جن میں اسٹو ہوا تھا۔ پھر اس کی نظر کونے میں دبی ہوئی سارہ پر پڑی اور اسے دیکھنے ہی چند محو میں وکنز اپنی نازل حالت میں آگیا۔ پھر وہ اس کی طرف بڑھنے لگا، جوں جوں وکنز قریب آ رہا تھا۔ سارہ کو رتی جاری تھی۔ وکنز بالکل سارہ کے قریب آ گیا..... سارہ کی نظر گردن پر پڑی سورج کل چٹکا تھا کہ گردن کی پر پڑے پیروں کی وجہ سے کرے میں ادرہ اترتا۔

”سارہ! میرے ہوتے ہوئے کوئی تمہیں نہیں ڈرے گا، میں تم سے.....“ ”آئی ایم سوری وکنز! سارہ نے وکنز سے اتنا کہا اور پھر پوری طاقت سے اپنی ٹھکی میں دھکی ہوئی صلیب وکنز کے دل کے مقام پر ٹھوپ دی! اور وکنز کوڑکی کا پردہ ایک جھگکے سے ہٹا دیا۔ سورج کی روشنی سے پورا گردن ہوا گیا اور ”وکنز! تمہیں یاد رکھنے لگا، اس کی آنکھوں میں درد تھا اس دوست کے لیا کر نے سے، جس کے لئے اس نے اپنے اصلوں اور خون کی طلب دلوں کو کھلا دیا تھا۔“

”مجھے معاف کر دینا وکنز!“ سارہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر وکنز چلتے چلتے راکھ بن کر بکھرے لگے اور چندوں بعد وہاں پچھتیں جا بسوس راکھ بن کر پڑنے سے سارہ کے پیئڈ فیر بھی بل کر راکھ بن گئے تھے۔ سارہ نے وکنز پر پیئڈ گرد پاؤں مار مار کر دور دی تھی اس کی آنکھوں میں اس کے دوستوں کے چہرے ایک ایک کر کے محم رہے تھے اور وکنز! سارہ کے لئے وکنز نے کیا کچھ نہیں کیا؟ یہاں تک کہ وکنز بھاگنے ہونے کے باوجود اس نے سارہ کی حفاظت کی۔ ”کاش! اے! تم مجھ سے نہ ملے ہوتے وکنز!“ سارہ نے روتے ہوئے کہا۔ وہ رات سارہ کی زندگی کی بھینک ترین رات تھی۔

دوسرے دن سارہ نے اپنے کپڑے بیگ میں ڈالے اور نیو یارک اپنے مام، ڈیڈ کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا، وہ تو اسی میڈیا کو اپنے پیئڈ ہمز کے بارے میں جواب بھی دینا تھا کہ ”آخر وہ سب کہاں گئے؟“ ”سب سوچ کر اس کا دماغ باؤف ہو رہا تھا کہ وہ لوگوں سے کیا کہے گی؟ یہ جو کچھ بھی ہو، سارہ کی عقل اس کو تسلیم کرنے سے قاصر تھی۔ اس نے حفاظت کے بجائے ٹرین کا انتخاب کیا، کیونکہ اسے پیئفیر کوئی اتیر پورٹ پر لوکل کا بھرم کھانا چاہا اور دیکھ کر اس نے پکارا ٹرین میں داخل ہو کر کوئی سائلٹی اپنی اور پیئڈ تھی۔

اچانک اس کے کانوں میں عجیب سی آواز

آنے لگی اور اس کے کان غیر معمولی حد تک کھڑے ہو گئے۔ اسے ایسا لگا رہا تھا جیسے کسی باپ سے پورے پورے پھر سے کر رہا ہو، اس نے اپنے کانوں پر دونوں ہاتھ رکھ لئے۔ مگر آواز بند نہیں ہوئی۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا اور ایک تو جوان کر پر گھٹا لٹکا لے کر پیئڈ گیا۔ سارہ کے کانوں میں گونجنے والی آواز اور تیز ہو گئی، اس کی کپٹیاں ملنے لگیں، اس کے نچھے تیزی سے بھول چک رہے تھے، اور وہ کہہ رہے تھے سائلٹی، یہ ہی تھی، سارہ ہی اس کی آنکھیں بھی دیکھ رہی تھیں، ہاتھ خون کی خوشبو، اس کی ناک سے ہونی ہوئی اس کی جسم کے دوسرے روئیں میں سارہ کی، اس کی آنکھوں میں آ کر تھا وہ آواز لگے، جو اس کے من میں گرج رہی تھی کہ اس کے دوڑنے کی تھی، جو اس کے دور سے من لی تھی۔ اس کے اندر خون کی پیاس سرفاٹنے لگی اور بے ہوش سے وہ بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان دبھرتے لگی۔

ٹرین چلتی گئی تو اس کے لئے اپنا کٹار اٹار کر اسے بھاننا شروع کر دیا۔ کٹار کی آواز پر سارہ کا ذہن تھوڑا سا گیا۔ لڑکے کی آنکھیں بند تھیں اور دم آواز میں کٹار بجائے جا رہا تھا، وہ جب روکا تو سارہ نے تالیاں، بجائے ہوئے کہا۔ ”ٹریل پیئڈ!“

”ٹھیکس!“ ”ایسے دی وہاں بی ایم اے سائلٹی! لڑکے نے خوش اخلاقی سے ہاتھ بچاتے ہوئے کہا۔

”آئی ایم سارہ!“ اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”اوہ تو، آئی ڈونٹ بلیو اٹ! آپ! آپ! ”نہایت واکرڈ والی سارہ ہیں ناں؟ لڑکے نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا اور اس لمحے ہی اسی کا کٹار بچے کر گیا، لڑکا کٹار اٹھانے کے لئے جھکا ہوا تھا کہ سارہ نے اسے دبوچ لیا اور چھٹ کر اپنے نوکیلے دانت لڑکے کی گردن میں کاٹ ڈالیے.....



موت کا سفر

ذوالقرنین خان - کوئٹہ

گوشار نے آگ کا گولا اپنے سامنے نوجوان کی طرف پھینکا مگر گولے نے اپنا رخ تبدیل کرکے گوشار کی طرف ہلک گیا اور چشم زدن میں گوشار اس کی لپیٹ میں آکر تڑپنے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے جل کر راکھ بن گیا۔

ناوید قوت کے زخے میں پھنسے ہوئے نوجوانوں کی ایک لڑہ بر اندام کرتی خوفناک کہانی

شہر لاہور کا پای ساجد قریبی جس کا زندگی
میں صرف ایک ہی مقصد تھا۔ اونچے اونچے پریتوں کو
اپنے پاؤں تلے روند دینا۔ بلند و بالا پہاڑوں پر چڑھ کر
جب وہ آسمان سے ملنے کرتا.....

”میں ہوں سب سے بلند“ تو اس کے چاروں طرف اس کی آواز کی ہانڈٹ ہوتی تھی۔ فلک یوں مازوں کو سر کرنے کے بعد وہ چنی پھر کر اُور اپنے ہاتھ پھیلا کر ان خطری واذوں کو اپنے سینے میں بھرتا چلا جاتا جوشوں میں رہنے والے اور زمرہ کے کاروں میں رہنے کیوں کے فیصیح میں رہنے والے کے اندر میں ایسی روش تھی۔ جو اسے نہیں لینے پڑی تھی۔ دو دھن بھٹوں سے زیادہ وہ گھر میں نہیں تک سکتا تھا۔ گھر میں رہنے کی اس کے پاس کوئی خاص وجہ تھی نہیں اس کی تھوڑی سی اس بھری دنیا میں اکیلا تھا۔ اس بچپن میں موت آتی تھی۔ باپ کی گھر سے پہلے راعی ملک عدم ہو گیا۔ اچھے خدوں میں اس کے والد کی دکائیں، بنانے میں کاماب ہو گئے جن کے گریوں پر ساجد بہت اچھے طے تھے۔ گھر سے روبرو رہا تھا۔

دیوساکی کے بلند و بالا میدان سے ساجد کچھ دن پہلے ہی لوٹا تھا۔ چار ماہ کے تھکا دینے والے سفر کے بعد

اس نے سوچا۔ ”ایک دفعہ آرام کیا جائے۔“
 دن کے گیارہ بج رہے تھے وہ ابھی تک سو رہا
 تھا۔ اس کی ساعتوں سے ایک جاگوار اور ڈرگائی۔ اس
 کا فون بج رہا تھا۔ پہلے تو اس نے نظر انداز کر دیا مگر فون
 کرنے والا مسلسل غبر و کر رہا تھا۔ وہ کھلندی سے
 اٹھا، جا کر دیکھو اور اٹھا اور بہت بیزاری سے ”ہیلو“ کہا۔
 دوسری طرف سے اسے ایک قہقہہ بھائی دیا۔ قہقہہ
 سننے ہی بیزاری کی وجہ جا کر اس پر سے ڈراہٹ گئی۔
 اور چہرے سے اس کا رنگ بھرا ہوا ہوئی۔ دوسری
 طرف یعقوب تھا اس کا لنگھنیاں۔ پوری دنیا میں اگر
 وہ کسی کو اپنا بھائی سمجھتا تو وہ یعقوب تھا۔

”کوئے مرے درنا ہے تو کو مر دے ہو کہ آیا ہے۔“ یعقوب نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ”کب تک تجھے زحمت رہے گی؟ ایک مہینہ اور دیکھیں نہ آتا تو میں تیرا عانا بنداز جنازہ دے گا کہ کبھی کراچیا ہوتا۔“

”اسنی آسانی سے نہیں مرے گا خبیث، اور اگر کبھی ایسا ہوگا تو پروگرام ہوتا دونوں ساتھ جا میں گے۔ میرے بغیر تو کیا کرے گا اس دنیا میں۔“ ساجد نے غلیظان سے جواب دیا۔

”فٹے منہ اتیرے منہ میں مٹی کچھڑا! میں کیوں

جاؤں کا تیرے ساتھ۔ میری لنگے ماہ شادی ہے اور اپنی
 شریک حیات کے ساتھ میں کوئی نصف صدی گزارنے کا
 خواہش مند ہوں۔“ یعقوب نے پرستار کے پیش میں کہا،
 ”تو تیرے جیسے تیل کے لہجے کھوکھا میسر آ ہی
 گیا۔ ویسے وہ گول بدھ بھبھ ہیں جنہوں نے اپنی بیٹی تجھ
 جیسے کھامزخص کے حوالے کرنے کا رسک مول لیا
 ہے۔“ ساجد نے شرارت سے کہا۔
 نعل یعقوب کی چڑھی اور لفظ کھامزس کے یعقوب
 کے ذہن میں ان تمام کاموں کی پٹی پٹنے لگی ہوئی جو اس
 نے ساجد کی ہمراہی میں سرانجام دیئے تھے۔
 ”کواس بندرگ“ یعقوب نے اپنا مخصوص جملہ
 بولا۔ ”دوستوں نے میری شادی میں آگے ہو بلکہ تو ایسا
 کر آج ہی رخت سزا بھالے۔“
 ”ویسے بھی آوارہ گرد ہاڈوں کی طرح میں ہوں،
 ٹھہرا نہیں اس لیے میرا ستر تیار ہی رہتا ہے۔“
 ”آج تو ہمیں ایک دردن میں کوشش کرتا
 ہوں۔“ ساجد نے کچھ سوچے ہوئے کہا۔
 ”بس پرسوں تک میرے پاس بیچے جاہ در نہ تو
 جاتا ہے مجھے۔“ یعقوب نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔
 ”ٹھیک ہے ٹھیک ہے بیچے جاؤں گا۔“ ساجد نے
 جلدی سے کہا، کیونکہ وہ پیشہ کی دھمکیوں سے
 مرعوب ہو جاتا تھا۔
 یعقوب ایسٹ آباد میں رہائش پذیر تھا۔ ساجد نے
 لاہور سے ایسٹ آباد تک کا سفر میں طے کیا تھا۔
 یعقوب اور اس کے گھر والے ساجد سے مل کر بہت خوش
 ہوئے۔ کافی دن وہ سہیل کر پرائی ہائیں کرتے رہے جو کچھ
 میں سال وہ لاہور میں ایک دوسرے کے مہمان رہے
 تھے شادی کی تیاریاں مروجہ پر تھیں۔ یعقوب کی خوشی بھی
 دیدی تھی۔ شادی کی تاریخ کا قریب آ چکا تھی۔
 ساجد ایک دن جب یعقوب کے گھر سے کچھ
 فاصلے پر موجود بھاری سے واپس آیا تو یعقوب راستے
 میں کمر اٹھا کر پیسے وہ اس کا دستہ ہوا۔
 ”فرقنی! آج رات اپنے ہمارے کپڑے پہنا

اور دل کو مضبوط کر کے بیٹھک میں آؤ۔“ یعقوب نے
 مسخنی خیز خیلے میں کہا اور فوراً وہاں سے چل دیا۔
 یعقوب جب بھی ساجد کو کوئی کہتا تب ساجد کو بہت برا
 سر پر اڑاتا۔
 رات کو بیٹھا قدموں کے ساتھ ساجد بیٹھک میں
 داخل ہوا مگر سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ یعقوب کے
 تمام دوست احباب، مزن حسب معمول بیٹھک میں
 موجود تھے۔ کسی کا گایا پاتا اور کسی ایک دوسرے سے
 ہلکی ہلکی لوک بھونک کی جاتی۔ یہ سب دیکھ کر ساجد
 مطمئن ہو گیا۔ مگر اس کا یہ یقینان عارضی ثابت ہوا۔
 اچانک وہاں موجود چٹانوں نے اس پر بلا بلبل اور چٹوڑی
 دے دیں اس کے جسم پر بعض کی جگہ چٹخوڑے درہ گئے تھے۔
 چٹوڑی پر دیکھ کر ساجد نے دلہا کے ہاتھوں کا اور اوپر پھر
 دلہا بھی زدیں آگیا۔ یہ وہاں کی رسم تھی۔
 اس طرح ہٹنے مگر اسے شادی اہتمام کو پہنچ گئی۔
 بہت جلد وہاں سے اور اس یقین دہانی کے بعد کہ ساجد
 اب ان سے ملتا رہے گا۔ اس کی گلو غلامی ہوئی اور وہ
 واپسی کے لئے عاجز مقرر ہوا۔
 واپس تو وہ لاہور ہی جا رہا تھا مگر اپنے طریقے
 سے آتے ہوئے بھی وہ بہت پور ہوا تھا۔ اب اس کا
 ارادہ تھا کہ وہ ایسٹ آباد سے سیدھا حویلیاں جائے گا،
 وہاں سے اس سفر کو ایک سو گھنٹہ سا گاؤں تھا وہاں پہنچے
 گا۔ آگے کا سفر اس کے پیدل کرنا تھا۔ اور کچھ بچے
 بھانڈوں کو بار کے کیا لے۔ ہوتے ہوئے گولہ
 پہنچتا تھا اور پھر آگے کی منزل چھانک گئی تھی وہاں سے وہ
 مریخ پہنچ جاتا۔
 ساجد ہمیشہ ہر شخص کے لئے یہ کوئی مشکل بھی
 نہیں تھا۔ اس نے دنیا کی مشکل ترین چال K-2 تک
 پہنچ جانا تھا مگر اسے ساتھ مگر زد کو نہ کیا ہے ہوتے
 جو چڑاڑوں میں غصے ٹھیک مگر کھائی میں مگر نہ والا تھا،
 ساجد اپنی تانگہ کو ڈوبائیں۔ اور اپنے وہ میر خراب کو کھیل
 تک نہ پہنچا سکا۔
 وہ حویلیاں بازار میں اشیاء خورد و نوش اور کچھ

دری سامان لینے کے لئے کہ اور دوبارہ سفر شروع کر دیا
 گولہ کے خواہر گزار بھاری راستوں پر پیدل وہ آگے
 ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے اندازے کے باطل دیکھ بھار
 والی اونچے تھے۔ یہ بات اس کے لئے باعث مسرت
 تھی۔ یہاں رہتا بلکہ ہوتا ساجد کا چھوڑی جاتی اور منجالی پر
 ہزار گز راستے میں اسے چاہیاد خشتوں کے چھنڈ دکھائی
 دے رہے تھے۔ اتنے خوبصورت مناظر اس نے صرف
 سرائے میں ہی دیکھے تھے۔
 اسے ایسا لگا رہا تھا کہ وہ نارمان یا کائنات میں
 چل رہا ہے۔ انہیں مناظر میں گم وہ چلا جا رہا تھا۔
 اچانک چوک کے قریب کالے ناسک منہ پر
 چھانے سیاہ لباس میں لمبیں اسلحہ برداروں نے اسے
 گیر لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ رستہ کا اندازہ لگا سکا تاوان
 میں سے ایک نے اپنی کئی اس کی طرف سیڑھی کی اور دیگر
 دو اپنا اسے اپنی گردن میں شدید دھمکس ہوا۔ وہ تیرا
 کر کر اس کے ہوش حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔
 ساجد کی جب آنکھ مل گئی تو اسے آپ کرکشا اور
 آرام دہ چنگ پر لیٹا ہوا پاپا شہ خانی کا مخصوص لباس
 اس کے جسم پر موجود تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا، یہ ایک چھوٹا
 مگر خوبصورت کمرہ تھا۔ چنگ کے ایک طرف اس کا
 سامان پڑا تھا۔ وہ اٹھا اور دھنسنے کے سامنے جا کھڑا ہوا
 بہتر گردن کا حاکم کرنے پر کسی کی قسم کا کوئی نشان یا
 زخم اسے نہ مل سکا۔ وہ کچھ نہیں پارتا تھا کہ خبر یہ کیا سب
 ہے؟ اس نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر باہر چھا کھا کر باہر
 صرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ گھڑی پر گلاہ ڈالی تو رات
 کے تین بج رہے تھے۔ اسے بیاس محسوس ہوئی تھی وہ
 اٹھا اور سرائے میں چل کر سب سے بک سے بانی کمال کے جیسے
 ہی کھونٹ ہوا تو خالی حصے میں وہ ایک کھونٹ بہت
 گرا کر اسے رات کا سارا محسوس ہوا۔ اسے طبیعت پر
 چھائی پر مڑ کر کی ایک دیوہی کچھ نہ لگئی۔ اس کا حصہ خالی
 تھا۔ وہ ایک طرف کونے میں رکھے فرنیج کی طرف
 بیٹھا فرنیج میں بیٹھ ڈھوڑا اور پڑا ہوا چھوڑا۔ بیٹ بھر نے
 کے بعد اس نے دوبارہ کمرے کا جائزہ لیا۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کمرے میں دروازہ
 موجود نہیں تھا۔
 کمرے کی دیواروں کو ٹوٹا لاکر اسے کوئی سرائے
 ملا۔ کھٹک پار کو وہ بارہ ہستر پر دروازہ ہو گیا اور خود کو
 حالات کے درم جو کم پر چھوڑ دیا۔
 دوسری مرتبہ اس کی آنکھ لاکر سے کھلی۔ وہ اٹھ کر
 بیٹھا کچھ گزشتہ واقعات دیکھے۔ ایک ایک کر کے اس کے ذہن
 کے پورے پر موزاں ہو گئے۔
 اچانک اسے کچھوڑا انڈو آواز سنا دی۔ لب
 دلچیز انگریزی تھا۔
 ”ساجد فریقنی! آپ براہ مہربانی! ابراہم کچھ
 ہاں میں شریف لے آئیں۔“
 ساجد نے دیکھا سامنے پورے دروازے دروازہ ہو چکا
 تھا۔ وہ چیری سے اٹھا اور دروازے سے نکلت بیٹھا۔
 مگر اس کے اندازے کے برعکس وہ باہر جانے
 کے راستے کے بجائے جدید طرز کا کھنڈ روم تھا۔ حقیقت
 میں اسے اس وقت اس کی اشو ضرورت بھی تھی۔ وہ خود اس
 اندھیرا کھانسی غسل کرتے ہوئے اس نے یہ عجیب بات
 محسوس کی کہ سامنے اسی میز کا کھانسی وہ برسوں سے
 استعمال کر رہا تھا۔ کچھ کمرہ بھی دی تھی۔ غسل کر کے وہ
 ہٹا ہٹا بیٹھ گیا۔ باقہ روم سے باہر اس کے اسی
 طرح کا ایک اور دروازہ کھلا پاپا۔ وہاں چھا کھا تو وہاں
 ایک بہت قیمتی سیاہی ماری جیس سوٹ اور بہت خوبصورت
 پیش قیمت جوئے اس کے منتظر تھے۔ وہ جلدی سے تیار
 ہو کر باہر نکلا تو اس ایک اور دروازے کو کھلا دیکھا۔
 وہ کھلا اب یہ کیا ہے؟ وہ منہ میں
 بیڑیا آگے دیکھا مگر اس مرتبہ اسے سامنے ایک
 رجاوری دکھائی دی۔ راجداری کے دونوں اطراف
 دروازے دکھائی دے رہے تھے نرم کراٹ پر چلا ہوا وہ
 کچھ حیرانی اور کچھ پریشانی کے سے بوجھ با تھا۔ سامنے
 میز حیاں نظر آ رہی تھیں، وہ مضبوط قدموں سے ان
 میز میلوں پر چلنے پہنچے کچھ کچھ۔
 اب اس کے سامنے کالے شیشے کی دیوار تھی۔ وہ

اس دیواری طرف بڑھا۔ جیسے ہی وہ قریب پہنچا شکستے کی دیوار کا کچھ حصہ چل سچ سے خود کار طریقے سے ایک طرف سرک گیا۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔ ہال میں ایک خوبصورت گولی نیز موجود تھی اس کے گردوں کے قریب کرسیاں رکھی تھیں اور وہاں بلیک سوٹ میں چار لوگ موجود تھے۔ وہ آگے بڑھا اور ان چاروں سے باری باری مصافحہ کر کے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”مجھے یہاں کیوں بلایا گیا ہے اور یہ سب کیا ہے؟“ ساجد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ مگر وہ چاروں ہفتوں کی طرح اس کی طرف دیکھتے نہ تھے۔

ساجد نے غور کیا تو اس پر اپنی بیوقوفی عیاں ہو گئی وہ سب کے سب غیر ملکی لگ رہے تھے۔ اردو، ان کو خاک سمجھتی، انہی وہ اپنا سوال انگریزی میں دہراتے ہی والا تھا کہ اس کی سناٹوں سے ایک آواز گونجی۔

”آپ لوگ اس صورتحال سے جبران ہوں گے، تمہارا انتظار کیجئے آپ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔“ یہ بات اردو اور انگریزی میں کہی گئی۔ اس کے علاوہ چنگی اور عربی میں بھی کسی کچھ کہا گیا۔ ایک اور زبان بھی استعمال کی گئی مگر ساجد بے اعزاز نہیں لگا سکا کہ وہ کون سی زبان تھی۔ مگر اب یہ سب کون تھے اور ساجد کو اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ سب ایک ہی طرح یہاں لائے گئے ہیں۔ انہیں وہاں بیٹھے تھوڑی سی دیواری کی کئی

ہال میں ایک سیاہ چوڑے میں بیٹوں ایک شخص داخل ہوا، چوڑے کے ساتھ بڑی ٹوپی نے اس کے چہرے کو ڈھاپ رکھا تھا۔ قریب آنے پر ساجد کی نظر اس کی خردلی زرد نازک انگلیوں پر پڑی۔

”اچھا تو یہ وہ صاحب ہیں۔“ اس نے دل ہی دل میں سوچا وہ اس صمد رانی کرسی پر براجمان ہو گئی۔ ساتھ ہی اس نے ایک جگہ سے اپنی ٹوپی اتار دی۔ اس کے خیرہ کن حسن نے وہاں بیٹھے تمام لوگوں کو بھوت کر دیا۔ مگر حسن کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں بھیڑ بھری کی کیورنگ تھی۔ وہ مسکرائی اور سامنے کی بنی ٹرائے اپنے

کان میں ٹھونکی۔ اور سب کو اشارہ کیا، سب نے اس کے اپنے کانوں میں وہ سن کر مڑا کر لی۔

”خوبصورت! اب ہم ایک دوسرے سے کھلم کر سکتے ہیں۔“

”میں یہ جاننے کے لئے یہ جھگڑا ہوں، مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ اور آپ کون ہیں؟“ وہاں بیٹھا ایک شخص پہلو بدل کر بولا۔ تب ساجد کو ان بیٹوں کی افادیت کا معلوم ہوا، وہ ٹرائیڈل تھے، ایک زبان کا دوری زبان میں ترجمہ آسانی کر لیتے تھے۔

”ممنزلی کی شیخوف صرف آپ کو نہیں بلکہ سب کو یہ جاننے کی جلدی ہے، یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ آپ اطمینان رکھیے، آپ کو سب معلوم ہو جائے گا۔“ اس حینے نے نرم و نرم آواز میں کہا۔ ”پستلخارف ہو جائے۔“ یہ سن کر سب ساجد قریبی، اس دنیا کے بہترین کوہ پیادوں میں سے ایک، پہاڑوں سے انہیں مشتق ہے۔

”ممنزلی کی جان کا خون ہے، ان کا فرہ ہے۔“ میں ہوں سب سے بلند۔“ اور یہ پاکستان سے ہیں۔“

ساجد کو اپنے بارے میں یہ سب کچھ اس حینے کے منہ سے سن کر بہت اچھا لگا۔ مگر اپنے فخر سے بارے میں اس نے کردہ بوجھ نکال دیا۔

”یہ ہیں مسٹر انار، اس حینے نے ساجد کے ساتھ بیٹھے ایک عربی لٹا سے مجھ کو شخص کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”یہ دنیا کے بہترین نشانہ باز ہیں، انکھوں پر پٹی باندھ کر بھی یہ معمولی حرکت پر نشانہ لگ سکتے ہیں، اور نشانہ لگ سکتے ہیں۔ ان کا نقشہ امریکہ سے ہے۔“

”نئے شیخ احمد مسود ہیں۔“ حینے نے اپنے سامنے بیٹھے ایک بچے کے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ ”دنیا کے طاقتور انسانوں میں سے ایک۔“ وہ سمجھنے سے بہتے ہو کر لڑنا، ان کا شوق ہے۔“ وہاں موجود سب لوگوں نے اس خوفناک شخص کو حیرت سے دیکھا۔

ان کا تعلق کس سے ہے۔

یہ شیخوف ہیں، ان کا تعلق روس سے ہے اور یہ غنایات ہیں۔ ان کے پاس، ایک ایسا علم ہے جو دنیا میں کسی اور کی کے پاس ناہو۔ یہ ایک ہی وار سے لے کر پچاس چنان کوڑے کر سکتے ہیں۔“

یہ شیخوف ہیں، کین کر سکتے ہیں آگیا ہو۔ اس اناہا بہت بہت چھپا کر رکھا تھا۔ دوسری جہتی نہیں سکا لاکر کیوں کے علم میں آجائے گا۔

”اور آخر میں جی ان، وہ ان کا تعلق چین سے ہے بہت بہت مہارت نشوونو ہیں۔ یہ جس جگہ ایک امریکہ سے ساتھ کر گئیں۔ دس سال بعد کسی بہت آرام سے اس کا نقشہ بنائیں گے۔“

”یہ سب ڈرامہ بند کر سیدھی طرح مطلب کی بات پر آؤ۔“ احمد مسود نے انہیں سے کہا، اس کی آواز اس کی طرح جاندار تھی۔

”اب بہت جلد چلیں یہ چل جائے گا یہ کیا ڈرامہ ہے اور اس میں تمہارا کردار کیا ہے؟“ اس حینے نے سرد لہجے میں کہا۔

اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ ان سب کو جھوسوں میں عجیب سی مستی دوڑ گئی۔

”مجھے ڈراموں میں کام کرنے کا قطعاً شوق نہیں ملے میرا وقت برباد نہ کرو۔ روز میں تمہیں اور تمہاری ڈرامہ بند کر سیں جس کیوں گا۔“ احمد نے پچھلے ہوئے بچے میں کہا۔ وہ اس کے بیڑا پر آیا تھا۔

”خوب ہو کا ہو رکھو احمد میں چاہتی تم جیسا طاقت درمخس سے موت مارا جائے۔“

اس حینے نے غصے سے کہا۔ اور ایک منہ دوایا۔

خون کے دبے یخ فرس ایک طرف سے ٹھکنے لگا اور تیزی سے ان کے پیروں کے نیچے سے نکل گیا۔ حیرت انگیز طور پر وہ گرے نہیں۔ انہیں کچھ دیر بعد کچھ آگیا، وہ انتہائی شفاف ٹھٹھے پر موجود تھے۔ اگلا خطر ایسا تھا کہ احمد مسود جیسا ہمارا اور طاقتور انسان کی ٹانگی ہو کر رہ گیا۔ ان سے چھوٹ نیچے دو شادک چمپلیاں تر رہی تھیں۔ جیسے ہی فرس شفاف ہوا تھا وہ تیزی سے پتھر کی

ڈنگیں، اسے ہمایا یک دھاؤں کی فٹاس کرتے ہوئے مسلسل ان پر چڑھتیں، ان کا خوفناک منہ جیسے ہی قریب آتا ان سب پر لڑو غلامی ہو جاتا حالانکہ انہیں معلوم تھا کچھ میں مغبوطی کا فرش ہے۔

وہ اس شخص کو گھوٹے ہوئے تھے اسے کس حینے کی آواز گونجی۔ ”احمد میں اگر جاؤں تو سیکڑوں میں نہیں ان بھوکے شادک کے حوالے کر دوں۔ مگر میں اور میری تنظیم میں یہ جاتی ہے کہ تم سب ہمارے لئے ایک کام کرو۔ اس کے بدلے لڑائی میں جوم چاہو گے وہ ملے گا۔“

”اور اگر تم انکار کر دینا تو کیا ہوگا؟“ جی ان ہوا پنی نجف آواز میں بولا۔

”تو۔۔۔۔۔“ اس حینے نے تو پر زور دیا اور بولی۔

”ہمایا یک منہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ تمہارا یہ سب کچھ اس کی بات تھی۔“

”میں نے کہا کیا ہے؟ تم کام تباؤ۔“ مارٹن پانی کی بوتل کھولتے ہوئے بولا۔

”ہاں یہ سوال کام کا ہے۔“ جنہیں ایک صندوق حاصل کرنا ہے۔ مگر اس صندوق کی جگہ کسی کو نہیں معلوم صرف پینجیوں کے ذریعے تم لوگوں نے اندازہ لگنا ہے۔ اور صندوق ڈھونڈنا ہے۔ اس کی تفصیل کل تمہیں بتادی جائے گی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور ٹھٹھ کی اس کی کمر بٹ میں کچھ ایسا تھا جو آنے والے

خطر کی کڑی کڑی بات تھا۔

رات تک وہ اپنے کمر بٹ میں محسوس ہے۔ رات سونے کے بعد ساجد کی جوا کھٹکی۔ حیرت کا ایک جھٹکا اس کا شہر تھا۔ وہ صرف کئی دوں میدان میں پڑا تھا۔ اس کے منہ پر برٹانی لباس تھا۔ اسے ڈرامی ٹھٹھ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ صبح کا وقت تھا بلی ٹنگی روشنی ہو چکی تھی مگر سورج ابھی تک پہاڑوں کی اوٹ لئے ہوئے تھا۔ ساجد نے پیچھے دیکھا تو اس کے باقی ساتھی بھی موجود تھے۔ انہی ایک طرف رکھے بیٹوں کا گمان ہے کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سارے اٹھتے ہوئے۔

فرانسسٹر ڈیوڈ اس کی وجہ سے وہاں آسانی ایک دوسرے

کی بات سمجھ سکتے تھے۔

”حضرات!“ یہ موت کا سفر ہے۔“ اس وقت وہاں تک پہنچ نہیں بلکہ چھو ہو۔ چھٹی ”موت“ ہے جو تمہاری ہمسفر ہے۔ سادہ کرشن کی جیب میں وہ کاغذ ہے جو تینوں اس صندوق تک لے جا سکتا ہے۔ اب تم صرف اس صورت میں زندہ رہ سکتے ہو جب تم یہ کام پائے تکمیل تک پہنچا دو۔ دوسری کوئی صورت نہیں۔ تمہاری کامیابی کے لئے دعا گو۔“ اس کے ساتھ ہی اس کے کانوں میں گئے کہ اسٹیشنر میں خاموشی چھا گئی۔ وہ کانوں میں دیکھ کر اسے پکارتے رہے۔ مگر کچھ کوئی آواز سنائی نہیں دی۔

ساجد نے جلدی سے جیب سے کاغذ نکالا۔ اس کاغذ میں ان پانچوں کی زبانوں میں پہیلی لڑا مہارت تھی۔

فلک یوں پر بتوں کی شان
سفید کبیلوں کے درمیان
تیر جہاں پہننے سے ہو پار
تیر کی میں ہے اس کا نشان
وہ چاروں کاٹی کر دیئے ہیں اس سے کوئل کرتے
رہے مگر انہیں کچھ نہیں لگتا تھا۔

”یوں پیٹھ رہنے سے بہتر ہے کہ ہم آگے
ہویں۔ پہلے صبر سے میں پہاڑوں کا ذکر ہے ہمیں
پہاڑوں کی سمت چلنا چاہیے۔“ ان میں سب سے عمر
رہیدہ جی آن ہوئے کہا۔

اس کی یہ بات نہ کہ ساجد کے ذہن میں ایک
جھماکہ ہوا۔ ”فلک یوں پر بتوں کی شان“ اس صبر سے
لیکھ کر اس کے ذہن میں ہونے لگی۔ سامنے آسمان کو
چھوٹی ایک پہاڑی چوٹی پر اس کی نظر پڑی۔ اس کی
بلندی اس کی بنیادوں اور نوکیلے پن کو دیکھ کر ہی بہت
طاری ہو جاتی تھی۔ ”بلاشبہ جیک یوں پر بتوں کی
شان ہے۔“ اس نے جب اپنے اس خیال سے اپنے
سامنے لوگ آگیا تو وہ سب اچھل پڑے۔ اس کی اس
رانے سے سب متحش تھے۔

کھینچا ہونے کے ناطے ساجد ان کا لیڈر تھا
وہ سب ہیڈ میں رہی جوڑ کر ایک دوسرے سے منسلک
ہو گئے۔ اور اس پہاڑی کی طرف جانے لگے۔ سورج
طلوع ہو گیا تھا، اور اس کی کرنیں جب برف پر پڑ کر
منتسک ہوئیں تو آنکھوں کو چند سیادیتیں۔ سیاہ شیشوں
والی عینک اگر آنکھوں پر نہ ہوتی تو وہ ضرور اندھے
ہو جاتے۔

وہ کافی اوپر آچکے تھے، درج حرارت بہت غلیظ تھا۔
بلندی ناپنے والے آگے کو دیکھ کر انہیں بے چلا کر وہ
14 ہزار فٹ کی بلندی پر تھے اور وہ آہستہ آہستہ اوپر
جانے لگے۔ ایک مقام پر ساجد نے ان کو سرکڑیوں
میں طلوع کی ایک مٹی کی دیوار آواز ان کے لئے موت کا
سایہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اسی وقت وہ ایک بہت بڑی
برفانی قوس کے نیچے سے گزر رہے تھے۔ نہایت
خاموشی سے وہ آہستہ آہستہ اوپر چڑھ رہے تھے کہ انہیں
کچھ غرائش سنائی دیں۔ سر اوپر اٹھا کر دیکھا تو پہاڑوں
کا ایک غول ان کو دکھائی دیا۔ بھیڑیے اپنے خوفناک
جزیروں کی نمائش کرتے ہوئے غرار تھے۔ مارن نے
جزیروں سے اپنی کئی نکال لی۔ اس سے پہلے کہ وہ فاکز
ساجد نے جھپٹ کر اس سے ہم جن لی۔

”ہاں، بھگت ہوئے ہو کیا کر رہے ہو۔“ مارن نے
ساجد سے گھن لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
”میں ان کو گولی چل گئی تو یہ برفانی قوس ہمیں
بیش کے لئے محفوظی سے منادے گا۔ بھیڑیوں کے
مقابلے میں برفانی قوس زیادہ خطرناک ہے ہم سب
یہاں صرف خیر استعمال کریں گے۔“

”خیر کا سن کر اچھے اگر انھوں میں چپک لہرائی اور
یوں۔“ دوسرے بات کی چلا گئے ہو رہے ہیں۔“
جی آن ہواوری کی شوق کو پیچھے چھوڑ کر وہ آگے
بڑھنے لگے۔ بھیڑیوں کو کبھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کا
شکار بھانجے کے بجائے حملہ آور ہے۔
تھوڑی دیر بعد تینوں اوپر پہنچے جہاں دھل کے
لئے تھوڑی سی جگہ موجود تھی۔ ساجد کو ابھی وہ وحیانی

بات کا اندازہ ہوا۔ جب اس نے اچھو ایک بھیڑیے
اپنی جیبوں سے پکڑ کر چیرے دکھائے پھر اس نے
ایک اور بھیڑیے کو ہاتھوں سے پکڑا اور پوری طاقت
سے تھما کر کھائی میں پھینک دیا۔
اتنی دیر میں مارن، خیر پیک کر دو بھیڑیوں کو
اچھو کر چٹکا تھا۔

اچھو ایک بھیڑیے نے زخمی بھیڑیے اور ساجد کی
طرف آنے لگا۔ ساجد کو اور تو کچھ نہیں سوچا وہ گھٹنوں
کے مل بیٹھ گیا اور خیر والے ہاتھ کو بلند کر دیا۔ بھیڑیے اپنی
جوہک میں ساجد کے سر پر سے ہوتا ہوا آگے جا کر اس
کی انتہائی اس کے پیٹ سے پھر اڑ چکا تھا۔
اور کھول کر ہاتھ اٹھا گیا تھا۔ جسے بھیڑیے اس
پر حملہ کرتے وہ کمال مہارت سے ان کی ٹانگیں پکڑ لیتا۔
اور تھما کر نیچے ہزاروں فٹ گہرائی میں پھینک دیتا۔
تھوڑی دیر میں میدان صاف ہو گیا۔

جوش میں آکر ساجد نے ایک زوردار رخو لگایا۔ اور
وہی دھڑا دھڑا کر ساجد کو ڈر تھا۔ برف تیزی سے سرکے
لگی۔ ساجد نے اپنا نیک اٹھا یا اور جلدی سے ایک بڑی
چٹان کے نیچے ٹکڑا ہو گیا۔ احمد اور مارن نے بھی اس کی
بڑی وی کی۔ لی شوق بھی اوپر اچھو کا وہ مٹی تیزی سے
چٹان کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے وہ دو کانک پکڑا۔
برف کی سفید چادر نے سب کو ڈھانپ لیا۔

جب تک برف کی بڑی ری، انہیں سانس لینے میں کوئی
دشواری نہیں ہوئی۔ برف کے تختے ہی ساجد کو اپنے
بھیڑیوں سے پیٹنے ہوئے محسوس ہوئے۔

برف کی دیر تھہرے ہو کر راستہ بند کر دیا تھا۔
اس نے ہاتھ ہی چلائے مگر وہ نونوں برف تھے۔ اس
کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ ٹرنا
چلتا تھا۔ مگر برف نے اسے جکڑ رکھا تھا۔ اس کی روح
میں غصہ ہی بے لگتی ہی دلی غلیظ تھی کہ کسی نے اسے
برف سے کھینچ کر باہر نکال لیا۔ ساجد نے دھندلائی
آنکھوں میں دیکھا وہ احمد تھا۔ احمد نے مارن
اور لی شوق کو برف سے نکالا۔ جی آن ہوا کچھ پتہ

نہیں تھا وہ کہاں گیا۔ چاروں ٹی کر اسے تلاش کرتے
رہے۔ مگر وہ کہاں نہیں ملا۔ ان کے پاس صرف ایک
بیک رہ گیا اسلئے کہ نام پر صرف خیر اور مارن کے
پاس ایک مہل تھوڑی 12 گولیاں تھیں۔ بیک
اتھا کر وہ آگے بڑھنے لگے۔

رات انہوں نے خیر کا کمر کر، ایک آدی کے
لئے بنائے گئے نیچے میں جن دیک گئے اور چٹکا پار
پیر دیا۔ پار اگلا نہایت کھٹکا دینے والا تھا۔ سورج کی
روشنی نے برف کو نرم کر دیا تھا۔ کھٹکی تو چار فٹ ان کے
پاؤں برف میں گھس جاتے۔ شام تک وہ پہنچے رہے۔
رات کو انہوں نے خیر کا گایا تھوڑی دیر بعد ہوا چلے گئی۔
وہاں پہنچے ہوئے ہی شامی ہوئی کہ ان کا خیر خیر غمزد
میں تھپ لیا ہو گیا۔ بقی پوری رات وہ چاروں ایک
دوسرے کی طرف پشت کئے جڑ کر بیٹھے رہے۔ اتنی
خوفناک ہوا سے پہلے ہی ان کا دل اٹھنے پڑا تھا۔

صبح کے وقت ہوا کا زور ٹوٹا۔ تھکاوٹ کے باوجود
وہ آگے بڑھنے لگے۔ انہیں اس عمارت کی تلاش تھی جہاں وہ
آگ جلا سکیں۔ ان کی خوراک بھی ختم ہو گئی تھی۔ شام
تک وہ ایک کشادہ میدان میں پہنچ گئے۔ اب ان کا
سب کام بھاری ہو رہا تھا۔ 18 ہزار فٹ کی بلندی تک وہ
پہنچ چکے تھے۔ چاہتا چاہتا جنیں نظر آئی تھیں لی شوق
ایک چٹان پر چڑھا۔

اس کی نگاہ عامی حرکت بہت بھیگی پڑی۔ وہ
سفید چٹان نہیں بلکہ درجہ برف تھا۔ جو تین کے سرے
لینے کے لئے کچھ عرصہ پہلے ہی یہاں لپٹا تھا۔ اپنے اوپر
وزن محسوس کر کے وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ لی شوق دور
جا کر مارن نے جیب سے مہل نکالا اور پھرتی سے فائر
کیا کوئی دھچکے کے سر میں لگی، وہ دہن ڈھیر ہو گیا۔ اچھل
محسوس کر کے 15 رچھو اٹھ کھڑے ہوئے۔ احمد کی بد قسمتی
کہ وہ تینوں کے زخمی میں آ گیا۔

احمد نے دیکھ کر ان کی گردن اپنے بازوؤں میں ڈال
لی، دوسرے دیکھنے لپے ہوئے بڑے خوفناک نہایت
احمد کے کندھے میں پیوست کر دیئے۔ احمد نے پوری

وفا کا رشتہ

امریکی فوج کے دستوں کے ایک کیمپ میں سب دستوں نے اپنے اپنے صندوق پر گرل فریڈ کی تصویر چسکی ہوئی تھی جبکہ جونی نے صندوق پر اپنی موٹر سائیکل کی تصویر چسکی ہوئی تھی جو اسے بہت پسند تھی اور جسے وہ گھر چھوڑ آیا تھا۔ ایک دوسرے دستوں نے اس بات پر اس کا بہت مذاق اڑایا تو جونی جل کر بولا۔ ”موٹر سائیکل کی تصویر لگا کر گرل فریڈ کی تصویر لگانے سے لاکھ دوسرے بہتر ہے۔“ جب میں وہاں جاؤں گا تو موٹر سائیکل کم از کم گھر پر موجود ملے گی۔“

(شرف الدین جیلانی۔ خٹو والہ یار)

واسطہ بنزدیکی سے پڑا۔ تھوڑا سا آگے جا کر انہیں وہ صندوق دکھائی دے گیا۔ جس کی وجہ سے وہ اتنی بڑی مصیبت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ صندوق ایک شخصے میں بند تھا۔ صندوق کے دونوں اطراف دو گولے پڑے تھے، بنزدیکی ان ہی میں چھوٹ رہی تھی۔

ساجد نے تیزی سے صندوق کی طرف بڑھنا چاہا۔ مگر مارن نے فری سے اسے روک دیا۔ وہ بیٹھے کسی کوشش کر رہا تھا کہ مارن نے اسے کیوں روکا، اس نے مارن کو تیزی سے صندوق کی جانب بڑھتے دیکھا۔ مارن نے جیسے ہی صندوق کے پاس پہنچ کر صندوق اٹھانا چاہا۔ ساجد نے اسے انکار دیا میں طرف جاتے دیکھا جہاں وہ دیوار سے ٹکرا کر پیٹ گیا، اور اس کی تھک چلی گئی۔

کسی ناپید وقت نے اسے اچھال دیا تھا۔ مارن نے آؤ دیکھنا نہ سمجھتا جب سے پہلے نکلا اور کیے بعد دیکر سے دو دفتر صندوق کی طرف کیے۔ اور اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا اس کے سینے اور گردن کے پاس سے خون کا اور ہلکا ہوا اور زخمیں پر پھیلا چلا گیا۔

ساجد تیزی سے بھاگ کر مارن کے پاس پہنچا

تاریکی میں جس کی نظر اس کی تھی۔ دن میں کوئی بھی اس بنزدیکی کا سرخ نہیں پاسکتا تھا۔

رات میں اپنے جیس پر قابو پا کر وہ وہاں لگے۔ تمام رات انہیں خوشی سے نیند نہیں آئی۔ صبح سویرے رونے لگے وہ تینوں اس بند عمار کی سمت لپٹ پڑے۔

اسی شخوفہ دی کے ذریعے پھر کوٹا پنے لگا۔ ساتھ ساتھ اس چٹان پر پتھر کی مدد سے نشان لگا جاتا۔ کافی دن پہلے اس نے اپنے خرد پھر کر مرکز تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جس پر اس کے جوتوں ایک ہی دار سے اپنے پتھر کو لگنے لگے یا جاسکتا تھا۔ اس کے پاس کوہ پائوں والی مخصوص جھوٹی موجود تھی۔ لی شخوفہ نے پہلے پتھر کے تین مختلف حصوں پر چوٹ اٹائی۔ اور آخر میں ایک پھر پر اور پھر کے اس حصے پر کیا جسے وہ مرکز کہہ رہا تھا۔

ایک دھماکا ہوا۔ ہر طرف گرداڑے لگی۔ اتنی بلندی پر اس لیے لینا پہلے ہی دھبہ ہوا تھا۔ گردنے اسے اور بھی مشکل بنا دیا۔ ساجد اور مارن تیزی سے پیچھے ہٹ کر مرکز کے چھوٹان سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ دیکھ کر مرکز کے ختم ہونے کا انتظار کرتے رہے۔

دونوں لی شخوفہ کی طرف سے پریشان تھے۔ اگر بہتر ترقی قائم ہو چکی تھی۔ وہ آگے بڑھنے لگے۔ انہیں چھوٹے بڑے پتھروں کے کنارے تھے باہر نظر کیا جو زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ غار کا دہانہ کل تھا۔ دونوں نے پہلے لی شخوفہ کو پتھروں کے پیچھے سے نکالا اور برف میں دفن کر دیا۔ تھوڑی دیر تک اس کی قبر پر افسردہ بیٹھے رہے۔

”پتھر اب اندر چل کر جائزہ لیتے ہیں۔ وہ صندوق موجود ہے یا نہیں۔“ مارن نے افسردگی سے ساجد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

لی کی موت پر ساجد بھی بہت گرفتار تھا۔

ساجد نے آہستہ سے سر ہلایا اور دونوں عمار کی جانب بڑھے۔ غار کے اندر داخل ہوتے ہی ان کا

سندھ کیوں سے سفید رہے مگر جڑا رہے۔ وہ خوشی اٹھا۔ وہ بالکل جگہ پر موزوں تھے۔ اس نے اپنے بات لی اور مارن کو بتائی تو وہ دونوں خوشی سے اگل پڑے۔ وہ تو ان کا کندھ کے پتھروں کو بھول ہی گیا تھا اب وہ تینوں تیسرے مصرے کا بھیہ ڈھونڈنے لگے۔

پورا ہینڈز کر گیا مگر کچھ سمجھ نہ آیا۔

ایک دن لی پہاڑی کا معائنہ کر کے وہاں اس کی جوتی کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے تیسرے مصرے کا بھیہ بھی تلاش کر لیا تھا۔ وہ ساجد اور مارن کو لے کر وہاں پہنچا۔

دونوں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک چٹان پہاڑ سے اس طرح باہر نکل ہوئی ہے جیسے وہ تیر کا پچھلا حصہ ہو، جو کہ پہاڑ کے سینے میں گئی ہو۔

”تیرا چل سینے سے ہو یا“

وہ ایک دوسرے سے ملے لگے کر خوشی کا اظہار کرتے رہے۔ مگر انکی انہیں چوٹا اور اہم سراغ تلاش کرنا تھا۔ وہ روزانہ اس کا اس چٹان کے نیچے کھڑے ہو جاتے مگر وہی ڈھاک کے تین پات انہیں کچھ نہ نکالا۔

ساجد اس رات لینا آخری مصرے دہرا رہا تھا۔ اسے کچھ نہیں آ رہا تھا۔ آخری مصرے میں کیا نئی سمجھائی گئی ہے۔ ایک مرتبہ پھر اس کے دماغ میں دیا سا ردیوں ہوا اس نے سمجھو کر لی شخوفہ اور مارن کو اٹھایا۔ دونوں خوفزدہ ہو گئے۔ مگر جوش سرت سے چٹکا ہوا ساجد کا چہرہ دیکھ کر کوئی اعزاز ہو گیا۔

ساجد تیزی سے باہر نکلا اور اس چٹان کی سمت دوڑا جوتیر کے پچھلے سے مشابہتیں۔ وہاں پہنچ کر وہ دھکے دے رہے تھے۔ ان کا خون ٹھنڈ ہو گیا۔ کچھ گچھ نہیں آ رہی تھی۔ اس تیر کے سینے نیچے سے بنزدیکی کی روشنی نکل رہی تھی۔ صاف دکھائی دے رہا تھا اندر کوئی غار تاجس کے سامنے بہت پتھر چڑھا۔ پتھر نے پوری طرح غار کو بند کر دیا تھا۔ جہاں سے ظاہر کیا تھا وہیں سے روشنی باہر آ رہی تھی۔

”سندھ کیوں کے درمیان“

پتھلی کا دھماکا دھماکا اس کے ذہن میں آ گیا۔

توت سے دھاوا۔ مارن جواہر سے لپٹے بچوں کا نشانہ لے رہا تھا۔ لی شخوفہ بدحواسی میں اس سے جا مل گیا۔

دونوں ایک دوسرے سے الگ کر پڑے۔ ایک رچیچہ ایک ایک ان کے سروں پر پھینک لیا۔ ساجد نے جیب سے نکل کر لیا۔ اور اسے پتھر کا کچھ کے کندھے میں ڈالتے ہی پست سے والے لپٹنے کی گردن میں دے کر تک جبر سمیٹ دیا۔ رو کی شدت سے رچیچہ گرایا اور تیزی سے مڑا۔ ساجد کے سینے پر اس کا پتھر کا توہ ڈاکٹر 12 فٹ دور جا گیا۔ پھر اس نے آکر ساجد کو چھوڑا۔ ساجد خون کی لپٹ میں جا رہا تھا۔

لی شخوفہ بھی رچی قہاس کے بازو پر ڈھم آئے تھے۔ مارن کی وجہ سے وہ محفوظ تھے۔

انہو جوں ہی برف میں دفن کر کے وہ بہت احتیاط سے غار میں داخل ہوئے مبادا کوئی رچیچہ اندر خوب خوشی کے مزے نہ لوٹ رہا ہو۔ وہ ایک چھوٹا سا غار تھا۔ آگ جلا کر دہیٹھ گئے۔ کتے دونوں بعد وہ آگ تاپ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ دنیا واپس آئے بے خبر خزانے لے رہے تھے۔

وہ اس علاقے سے کافی واٹس ہو چکے تھے۔ ہر روز جگہ اٹھنے اور تھوڑا کھوم کر واپس آ جاتے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ پہاڑی بالکل دیواری کی مانند تھی اور جانا۔ وہ بھی بغیر انسان کے ناممکنات سے تھا۔ اس کی شش و پنج میں اس نے گزرتے رہے۔ ایک صبح جب ساجد اٹھا تو اس نے عجیب سحر دیکھا۔ غار میں رچیچہ کی تیز تیز کھالیں پھینک رہیں۔ مارن تمام رچیچوں کی کھالیں اتار لایا تھا کھالیں دیکھ کر ایک بار پھر ساجد کے ذہن میں کھلی گئی۔

”سندھ کیوں کے درمیان“

پتھلی کا دھماکا دھماکا اس کے ذہن میں آ گیا۔

توت سے دھاوا۔ مارن جواہر سے لپٹے بچوں کا نشانہ لے رہا تھا۔ لی شخوفہ بدحواسی میں اس سے جا مل گیا۔

دونوں ایک دوسرے سے الگ کر پڑے۔ ایک رچیچہ ایک ایک ان کے سروں پر پھینک لیا۔ ساجد نے جیب سے نکل کر لیا۔ اور اسے پتھر کا کچھ کے کندھے میں ڈالتے ہی پست سے والے لپٹنے کی گردن میں دے کر تک جبر سمیٹ دیا۔ رو کی شدت سے رچیچہ گرایا اور تیزی سے مڑا۔ ساجد کے سینے پر اس کا پتھر کا توہ ڈاکٹر 12 فٹ دور جا گیا۔ پھر اس نے آکر ساجد کو چھوڑا۔ ساجد خون کی لپٹ میں جا رہا تھا۔

لی شخوفہ بھی رچی قہاس کے بازو پر ڈھم آئے تھے۔ مارن کی وجہ سے وہ محفوظ تھے۔

انہو جوں ہی برف میں دفن کر کے وہ بہت احتیاط سے غار میں داخل ہوئے مبادا کوئی رچیچہ اندر خوب خوشی کے مزے نہ لوٹ رہا ہو۔ وہ ایک چھوٹا سا غار تھا۔ آگ جلا کر دہیٹھ گئے۔ کتے دونوں بعد وہ آگ تاپ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ دنیا واپس آئے بے خبر خزانے لے رہے تھے۔

وہ اس علاقے سے کافی واٹس ہو چکے تھے۔ ہر روز جگہ اٹھنے اور تھوڑا کھوم کر واپس آ جاتے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ پہاڑی بالکل دیواری کی مانند تھی اور جانا۔ وہ بھی بغیر انسان کے ناممکنات سے تھا۔ اس کی شش و پنج میں اس نے گزرتے رہے۔ ایک صبح جب ساجد اٹھا تو اس نے عجیب سحر دیکھا۔ غار میں رچیچہ کی تیز تیز کھالیں پھینک رہیں۔ مارن تمام رچیچوں کی کھالیں اتار لایا تھا کھالیں دیکھ کر ایک بار پھر ساجد کے ذہن میں کھلی گئی۔

مگر جسم خانکی سے اس کی روح پر ہزار بجی تھی۔ ساجد نے بہت قریب سے لڑن کے ذریعہ کا معیار کیا تو اس پر حیران ہو گیا۔

ان بھیر یوں میں سے ایک طاقتور بھیر یا آگے بڑھا اور اپنے جسم کو زور سے جھکا دیا۔ اسگے ہی کمرے وہ انسانی روپ میں ساجد کے سامنے موجود تھا۔ یہ وحشت ناک منظر دیکھ کر ساجد پر ہر سستہ طاری ہونے لگا اور اگر وہ مضبوط حواس کا باک نہ ہوتا تو اب تک حواس سے بچا نہ ہو چکا ہوتا۔ اس شخص نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا، جو وہاں عجیب جیز دیکھی، صندوق کی سطح پر رکھا ہوا تھا، وہاں دو گڑھے تھے، ایک چھوٹا ہوا دیکر اس سے کچھ بڑا۔ صندوق کے ساتھ کوئی غمی دھڑک رہی تھی۔ ایک چھوٹا اور دھڑک رہا اور ان میں سے بڑی زبردستی نکل رہی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھالیا اور چھوٹا گولہ نکالا۔ چھوٹے گڑھے میں رک گیا۔ یہ حرکت کر کے بڑا گولہ بڑے گڑھے میں رک دیا۔

جیسے ہی وہ اس کام سے فارغ ہوا۔ دروازہ بند ہونے لگی۔ زوردار آواز پیدا ہوئی۔ صندوق کے گرد موجود شیشہ کی تخت غائب ہو گیا اور صندوق کا ڈھکنا کھل گیا۔

صندوق میں ایک اٹھ موجود تھا جو شاید کسی دھات سے بنا تھا۔ چاندی سے پائنتی سے مشابہت خضری سفید روشنی اس میں سے پھوٹ رہی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک سفید پرچی رکھی گئی۔ ساجد نے وہ اٹھ اور پرچی دونوں اپنے قبضے میں لے لیے۔ اور باہر جانے کے لئے مڑا اس کے علاوہ اس کے دباؤ میں اور کوئی بات نہیں تھی کہ وہ کسی سے اپنے رہائی فارغ میں پہنچے اور وہاں بیٹھ کر اس اٹھ میں چڑھ کر فوگرے۔

وہ غار سے باہر نکلا ہی تھا کہ اسے گڑ گڑاہٹ سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک پہاڑی سے اسے کچھ اترتا ہوا دکھائی دیا، جیسے وہ کچھ قریب آئے۔ ساجد کے روکنے کڑے ہو گئے۔ خدایا کیلئے وہ کچھ میرے ہتھ دکھا دے۔ وہ شکر کو بھی دیتے تھے، وہ لوگوں میں ساجد تک پہنچ گئے۔ وہ تعداد میں آٹھ تھے انہوں نے آکر ساجد کو گریا،

ساجد کا خون خشک ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں میں واضح طور پر زبردستی دیکھی جا سکتی تھی۔

ان بھیر یوں میں سے ایک طاقتور بھیر یا آگے بڑھا اور اپنے جسم کو زور سے جھکا دیا۔ اسگے ہی کمرے وہ انسانی روپ میں ساجد کے سامنے موجود تھا۔ یہ وحشت ناک منظر دیکھ کر ساجد پر ہر سستہ طاری ہونے لگا اور اگر وہ مضبوط حواس کا باک نہ ہوتا تو اب تک حواس سے بچا نہ ہو چکا ہوتا۔ اس شخص نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا، جو وہاں عجیب جیز دیکھی، صندوق کی سطح پر رکھا ہوا تھا، وہاں دو گڑھے تھے، ایک چھوٹا ہوا دیکر اس سے کچھ بڑا۔ صندوق کے ساتھ کوئی غمی دھڑک رہی تھی۔ ایک چھوٹا اور دھڑک رہا اور ان میں سے بڑی زبردستی نکل رہی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھالیا اور چھوٹا گولہ نکالا۔ چھوٹے گڑھے میں رک گیا۔ یہ حرکت کر کے بڑا گولہ بڑے گڑھے میں رک دیا۔

جیسے ہی وہ اس کام سے فارغ ہوا۔ دروازہ بند ہونے لگی۔ زوردار آواز پیدا ہوئی۔ صندوق کے گرد موجود شیشہ کی تخت غائب ہو گیا اور صندوق کا ڈھکنا کھل گیا۔

صندوق میں ایک اٹھ موجود تھا جو شاید کسی دھات سے بنا تھا۔ چاندی سے پائنتی سے مشابہت خضری سفید روشنی اس میں سے پھوٹ رہی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک سفید پرچی رکھی گئی۔ ساجد نے وہ اٹھ اور پرچی دونوں اپنے قبضے میں لے لیے۔ اور باہر جانے کے لئے مڑا اس کے علاوہ اس کے دباؤ میں اور کوئی بات نہیں تھی کہ وہ کسی سے اپنے رہائی فارغ میں پہنچے اور وہاں بیٹھ کر اس اٹھ میں چڑھ کر فوگرے۔

وہ غار سے باہر نکلا ہی تھا کہ اسے گڑ گڑاہٹ سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک پہاڑی سے اسے کچھ اترتا ہوا دکھائی دیا، جیسے وہ کچھ قریب آئے۔ ساجد کے روکنے کڑے ہو گئے۔ خدایا کیلئے وہ کچھ میرے ہتھ دکھا دے۔ وہ شکر کو بھی دیتے تھے، وہ لوگوں میں ساجد تک پہنچ گئے۔ وہ تعداد میں آٹھ تھے انہوں نے آکر ساجد کو گریا،

ساجد کا خون خشک ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں میں واضح طور پر زبردستی دیکھی جا سکتی تھی۔

ان بھیر یوں میں سے ایک طاقتور بھیر یا آگے بڑھا اور اپنے جسم کو زور سے جھکا دیا۔ اسگے ہی کمرے وہ انسانی روپ میں ساجد کے سامنے موجود تھا۔ یہ وحشت ناک منظر دیکھ کر ساجد پر ہر سستہ طاری ہونے لگا اور اگر وہ مضبوط حواس کا باک نہ ہوتا تو اب تک حواس سے بچا نہ ہو چکا ہوتا۔ اس شخص نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا، جو وہاں عجیب جیز دیکھی، صندوق کی سطح پر رکھا ہوا تھا، وہاں دو گڑھے تھے، ایک چھوٹا ہوا دیکر اس سے کچھ بڑا۔ صندوق کے ساتھ کوئی غمی دھڑک رہی تھی۔ ایک چھوٹا اور دھڑک رہا اور ان میں سے بڑی زبردستی نکل رہی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھالیا اور چھوٹا گولہ نکالا۔ چھوٹے گڑھے میں رک گیا۔ یہ حرکت کر کے بڑا گولہ بڑے گڑھے میں رک دیا۔

جیسے ہی وہ اس کام سے فارغ ہوا۔ دروازہ بند ہونے لگی۔ زوردار آواز پیدا ہوئی۔ صندوق کے گرد موجود شیشہ کی تخت غائب ہو گیا اور صندوق کا ڈھکنا کھل گیا۔

صندوق میں ایک اٹھ موجود تھا جو شاید کسی دھات سے بنا تھا۔ چاندی سے پائنتی سے مشابہت خضری سفید روشنی اس میں سے پھوٹ رہی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک سفید پرچی رکھی گئی۔ ساجد نے وہ اٹھ اور پرچی دونوں اپنے قبضے میں لے لیے۔ اور باہر جانے کے لئے مڑا اس کے علاوہ اس کے دباؤ میں اور کوئی بات نہیں تھی کہ وہ کسی سے اپنے رہائی فارغ میں پہنچے اور وہاں بیٹھ کر اس اٹھ میں چڑھ کر فوگرے۔

وہ غار سے باہر نکلا ہی تھا کہ اسے گڑ گڑاہٹ سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک پہاڑی سے اسے کچھ اترتا ہوا دکھائی دیا، جیسے وہ کچھ قریب آئے۔ ساجد کے روکنے کڑے ہو گئے۔ خدایا کیلئے وہ کچھ میرے ہتھ دکھا دے۔ وہ شکر کو بھی دیتے تھے، وہ لوگوں میں ساجد تک پہنچ گئے۔ وہ تعداد میں آٹھ تھے انہوں نے آکر ساجد کو گریا،

ساجد کا خون خشک ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں میں واضح طور پر زبردستی دیکھی جا سکتی تھی۔

ان بھیر یوں میں سے ایک طاقتور بھیر یا آگے بڑھا اور اپنے جسم کو زور سے جھکا دیا۔ اسگے ہی کمرے وہ انسانی روپ میں ساجد کے سامنے موجود تھا۔ یہ وحشت ناک منظر دیکھ کر ساجد پر ہر سستہ طاری ہونے لگا اور اگر وہ مضبوط حواس کا باک نہ ہوتا تو اب تک حواس سے بچا نہ ہو چکا ہوتا۔ اس شخص نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا، جو وہاں عجیب جیز دیکھی، صندوق کی سطح پر رکھا ہوا تھا، وہاں دو گڑھے تھے، ایک چھوٹا ہوا دیکر اس سے کچھ بڑا۔ صندوق کے ساتھ کوئی غمی دھڑک رہی تھی۔ ایک چھوٹا اور دھڑک رہا اور ان میں سے بڑی زبردستی نکل رہی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھالیا اور چھوٹا گولہ نکالا۔ چھوٹے گڑھے میں رک گیا۔ یہ حرکت کر کے بڑا گولہ بڑے گڑھے میں رک دیا۔

جیسے ہی وہ اس کام سے فارغ ہوا۔ دروازہ بند ہونے لگی۔ زوردار آواز پیدا ہوئی۔ صندوق کے گرد موجود شیشہ کی تخت غائب ہو گیا اور صندوق کا ڈھکنا کھل گیا۔

صندوق میں ایک اٹھ موجود تھا جو شاید کسی دھات سے بنا تھا۔ چاندی سے پائنتی سے مشابہت خضری سفید روشنی اس میں سے پھوٹ رہی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک سفید پرچی رکھی گئی۔ ساجد نے وہ اٹھ اور پرچی دونوں اپنے قبضے میں لے لیے۔ اور باہر جانے کے لئے مڑا اس کے علاوہ اس کے دباؤ میں اور کوئی بات نہیں تھی کہ وہ کسی سے اپنے رہائی فارغ میں پہنچے اور وہاں بیٹھ کر اس اٹھ میں چڑھ کر فوگرے۔

وہ غار سے باہر نکلا ہی تھا کہ اسے گڑ گڑاہٹ سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک پہاڑی سے اسے کچھ اترتا ہوا دکھائی دیا، جیسے وہ کچھ قریب آئے۔ ساجد کے روکنے کڑے ہو گئے۔ خدایا کیلئے وہ کچھ میرے ہتھ دکھا دے۔ وہ شکر کو بھی دیتے تھے، وہ لوگوں میں ساجد تک پہنچ گئے۔ وہ تعداد میں آٹھ تھے انہوں نے آکر ساجد کو گریا،

Dar Digest 171 June 2012

تلاش کرنے لگا۔ اسے یقین واثق تھا کہ یہ سب اسی پرچی کی کرباات ہیں جسے اس نے یہ کار کھج کر پھینک دیا تھا۔ مگر وہ پرچی عاب ہو چکی تھی۔
برقانی ہواؤں نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ ساجد اب کف افسوس لئے کہ سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کھانے سے اسے کافی توانائی ملی تھی، باقی بچا کچھا کھانا اس نے ایک خلیہ میں سنبھال لیا اور آگے بڑھنے لگا۔

رات تک وہ ایک مناسب جگہ تلاش کر چکا تھا۔ کچھ جھاڑیاں ہیں اسے نظر آئیں۔ اس نے انہیں آگ لگانے کی کٹائی اور جب سے لائنز نکالے تھے ہاتھ کوٹ میں ڈالا۔ اگلے ہی لمحہ وہ اٹھا اور دوڑ کر کھانڈھا ڈالنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر عجیب عجیب آوازیں نکالتے لگے اور وہ یہ سب کچھ کرنے میں حق بجانب بھی تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی سفید پرچی تھی جسے کھوکھلے زدن کی سب سے زیادہ افسوس ہوا تھا۔ اس نے پرچی کو ہاتھ میں تھا اور زور سے بولا۔ ”ان جھاڑیوں میں آگ لگ جائے۔“

اگلے ہی لمحے جھاڑیاں تیز جرجر مل رہی تھیں۔ ساجد نے ایک بار پھر جھوٹی سے شرار ہو گیا اور تسلی سے بیٹھ گیا۔ زور دار آواز آنے لگا۔

”نہیں اپنے قلبیت میں بیخچ جاؤں“ کھوکھلائی پر گزرو گئی کچھ کوئی نہ سنا۔ اس نے ایک بار پھر کھج کر معاملہ جوں کا توں رہا۔ اس نے پرچی اٹھائیں لی اور کھانے کا ٹماکر اس پر کھانا بھیج کر آیا۔ پاس کی طبیعت معمول ہونے لگی۔ وہ بے چین ہو کر لیٹ گیا۔ پرچیوں میں سب ایک تھا۔ اتنی خوشی کے بعد ایک دم پھر باہمی کا اندیزہ اچھا گیا تھا۔ امید کا سورج تھلک دکھا کر عاب ہو چکا تھا۔
ساجد نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ اس کی آنکھوں میں نئی تیرہری تھی۔ خود ہی نے بعد اسے کئی نکتے کی بہت عرصے بعد اسے گری کا احساس ہوا تھا۔ شاید آگ اثر تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ گرہ یہ کیا؟ ہر طرف اندیزہ ہی اندیزہ اچھا۔ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دیتا تھا۔ ”یا

برہماری شریف ہو چکی تھی وہ اسی عاری میں بیٹھا ہوا تھا۔
”ہاں ہاں مارنے نہ بیچنے کی کھائیں لا کر دیں۔ اب ات کو وہ اسی جگہ بیٹھا چکا تھا اور سالار کی فٹنار سے مالایا کی سمت لے کر طرف سفر کیا تھا۔ بیچ آنکھ کر شرق کی سمت چل پڑا۔ سز کے کے تمام ضروری سامان اور کھانا سالار نے مہیا کر دیا تھا۔ وہ مسلسل آگے بڑھا۔ ایک ہفتہ ہونے کا گیا مگر برف کے سمندر میں جس نکل کا مالک وہ مسلسل چل رہا تھا اور بہت عرصہ دیر کے لئے آرام کرتا۔ برقانی ملاؤں میں وہ بے مکی بیٹھ کر اور فینہ دونوں بہت کم ہو جاتی ہیں۔ اس کی لور کا بھی ختم ہو رہی تھی۔

ایک ہفتہ سز پر کر گیا خوراک ختم ہو رہی تھی مگر انسان کو انسان کی چالور پرچی اس کی نظر نہ پڑی بہاڑوں سے اگر اسے شق نہ ہوتا تو اب تک وہ بہت چکا رہتا ہوتا۔ وہ آگے بڑھتا رہا اور گزر گاؤں کوں کوں پہنچے موز سے عبور کرتا رہا۔ خوراک اس کے پاس ختم ہوئی۔ جسم میں شہامت دور آئی۔ آخر انسان تھا۔ ناموں نے جواب دے دیا۔ بہاڑے نکل کر ایک چٹان کے منجھے تلے وہ لیٹا ہوا تھا۔ اس نے میہوں میں ہاتھ مارا شاید کوئی کھانے کوں جائے۔ کچھ کھڑکھڑاہٹ سی محسوس ہوئی تو دیکھا وہاں سفید پرچی جو ہر جگہ کے ساتھ رکھی تھی جیب سے نکل آئی۔ اس طرح سفید اور بے شکن۔ اس نے پرچی کو دیکھا تو منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”کاش! کچھ کھانے کوں جاتا۔“ پرچی کو پھینک کر وہ کروٹ لے کر لیٹ گیا۔

اگلے ہی لمحے اس کی ناک سے ذرات اقسام کے کھانوں کی خوشبو نکلائی۔ پہلے تو وہ دہم بھج کر سکریا کر جب مسلسل خوشبو محسوس کرتا رہا تو مڑ کر سامنے حیرت سے اپنی آنکھیں کھول کر اس کے سامنے سبز خران بچھا ہوا تھا اور اقسام کے کھانے موجود تھے۔ اس نے سیر ہو کر کھانا کھا۔ شرب بھی خوب پیا۔ جب بھوک مچلی تو ایک خیال سے اس کے جسم کو بھٹکا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور وہ پرچی

”یقین آپ چاہتے ہیں کہ یہ میں آپ کو دے دوں؟“ ساجد نے کہا۔
”میں اس قسم اسے کسی کو نہیں دے سکتا اور ہمیشہ کے لئے نا ہوا لگے۔ تمہیں اسے دینا پڑا ہوگا۔ جہاں سے تم اسے لائے ہو۔“ سالار نے بڑھ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مگر ایک بات یاد رکھنا کہ تمہیں وہاں پہنچنا کہیں غیر مسئلہ ہے کہ جیسے ہی تم ہر جگہ داخل رکھو گے ہمارا اتھار اور ایلہ ختم ہو جائے گا۔ وہاں سے تمہیں بے خفاقت واپس پہنچانے کا اختیار ہم کمر نہیں دیتے۔“

”تو پھر میں گھر کیسے پہنچوں گا؟ تمہارے وہ دنیا کا کون سا خلیہ ہے۔ اور یہ ضرورت کیا ہے، ہمارے خلیہ اپنی جان خلیہ میں ڈالوں۔“ ساجد نے سوال کر لیا۔
”کلیہ تو وہی کھائیاں جگہ پر کے پھر موند کر کھی گئیں۔“ یہ سوچ کر ہی اس کا نشان خون تیز ہونے لگا۔
”ضرورت ہے تمہیں کمر اپنی جان خطرے میں ڈالو ورنہ تمام عمر سکتے رو گے۔ اور سب سے زیادہ نقصان تمہارے چاہنے والوں کا ہوگا۔ زندگی بھر تم کوئی رشتہ نہیں بنا سکو گے۔ تمہارا کیا خیال ہے ہر جگہ ایک انسان کے پاس دیکھ کر ہماری دنیا کے لوگ اسے چھوڑ دیں گے۔ نہیں بالکل نہیں۔ ساری عمر تمہیں حالت جنگ میں رہنا ہوگا ایک کے بعد دوسرا حملہ۔“
”تمہیں تو ہر جگہ استعمال کرنا بھی نہیں آتا۔ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی حالانکہ قصور وراپے انجام کو پہنچے کچھ بڑھتی ہیں تم سے ہماری محسوس کر رہے ہیں اس لئے تمہیں یہاں اٹھا لائے۔ آگے تمہاری مرضی ہے۔“ سالار نے سختہ سختہ کہا اور اٹھ کر اٹھا ہوا۔ ”اور جاتے جاتے آخری بات تمہیں بتانا چاہوں۔ انسان اس علاقے کے کافی قریب ہیں۔ ذرا سی بہت اور کوشش سے تم ان تک پہنچ سکو گے۔ آج کا دن اور آج تمہارے پاس سے خوب سوچ لو۔“
”بہت سوچنے کے بعد ہم سارے سالار کی بات ماننے سے انکار نہیں کرتے۔“ سالار نے فرمایا۔
”تو پھر میں گھر کیسے پہنچوں گا؟ تمہارے وہ دنیا کا کون سا خلیہ ہے۔ اور یہ ضرورت کیا ہے، ہمارے خلیہ اپنی جان خطرے میں ڈالوں۔“ ساجد نے سوال کر لیا۔
”کلیہ تو وہی کھائیاں جگہ پر کے پھر موند کر کھی گئیں۔“ یہ سوچ کر ہی اس کا نشان خون تیز ہونے لگا۔
”ضرورت ہے تمہیں کمر اپنی جان خطرے میں ڈالو ورنہ تمام عمر سکتے رو گے۔ اور سب سے زیادہ نقصان تمہارے چاہنے والوں کا ہوگا۔ زندگی بھر تم کوئی رشتہ نہیں بنا سکو گے۔ تمہارا کیا خیال ہے ہر جگہ ایک انسان کے پاس دیکھ کر ہماری دنیا کے لوگ اسے چھوڑ دیں گے۔ نہیں بالکل نہیں۔ ساری عمر تمہیں حالت جنگ میں رہنا ہوگا ایک کے بعد دوسرا حملہ۔“

کچھ بھی تو پہنچا سکتی تھی مگر اسے اتنا ہلکا چکر چلانے کی کیا ضرورت تھی؟“ ساجد نے اپنی آنکھیں کا اٹھایا۔
”میں وہ ایسا نہیں کر سکتی جس کی اسی لئے اس نے تمہارا ہلکا اٹھارہ ترانے۔ ہر جگہ کے ارد گرد بہت سخت پہاڑ ہے۔ اور جب تم اوپر آ کر جے تو انہیں سب تمہارے ذہن کو پوری طرح کھال لئے جے گھر انہیں ڈھکیں ہوا تم لوگ مندوق کی تلاش میں تھے۔ ہرے داروں کو تم نہیں تھا کہ ہر جگہ مندوق میں بندے۔ اس لئے وہ جھوٹا کھانے۔ اور انسانوں کا ہر جگہ سے کچھ لینا دینا تمہیں اور بلا وجہ وہ مداخلت کر نہیں سکتے تھے اس لئے تم ہر جگہ تک پہنچ گئے۔“ سالار نے تسلی سے جواب دیا۔
”اور تمہارا راستی واقعی کمال کا تھا، عاری میں تم صرف اسی کی وجہ سے داخل ہوئے۔ اس نے کمال تمہارا سے عاری کے سامنے موجود پتھر تو ڈالا اس سے پہلے ہرے ہرے ہرے پتھر سے اندر داخل ہو گئے۔“
”دیکھیں تمہارا سالار میں اس کو رکھ دیندے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ آپ کی بیٹی نے یہ کیل شروع کیا۔ اور تمہیں کئی اذیت دی۔ آپ کو کھولم ہے۔“ ساجد نے رنج اور غصے کی ملی لکلی کیفیت سے کہا۔
”ہم نے آپ کو یہاں اسی لئے بلایا ہے۔ آپ اس مصیبت سے نکل جائے۔ اور جہاں تک سراس کی بات ہے وہ آگے سزا تو مہلت ہے جسے اس کا مقبض گشتار مارا گیا ہے۔ اور باقی کی تمام عمر کے سراس کو سمندر پر گرد کیا جائے گا۔“ سالار کے لہجہ میں دکھانڈ آیا۔ آخر وہ باپ تھا۔
”اوہ! مجھے بہت افسوس ہے مگر ان سب میں سراس کا اپنا قصور ہے۔“ ساجد نے سالار کے دکھ کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔
”ہاں اور وہ سزا بھی مجھے کی مگر میں یہ چاہتا ہوں کہ تم ہر جگہ کی ملکیت سے دھبر دار ہو جاؤ۔“ سالار کے لہجہ کی مگر غریب واپس آگئی تھی۔ اپنے دکھ کو اس نے اپنے حلال سے ڈھانپنا چاہتا۔



شکاری

ناصر محمود فرہاد۔ فیصل آباد

نوجوان کے سامنے جب بچانوں کا کوئی راستہ نہ رہا تو اس نے مرتا کیانہ کرتا کے مصداق غفریت کے سامنے جانے کا سوچ لیا، اور پھر اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنا کر غفریت کے سامنے چلا گیا کہ پھر اچانک.....

ہر اچھائی برائی قسمت میں نہیں لکھی ہوتی بلکہ اس کا ذمہ دار انسان خود ہوتا ہے

ہری طرح ٹوٹ گیا تھا اور اس پر کٹکے والی آگ نے جہاز کو ہری طرح جلانے کے ساتھ ساتھ تقریباً سارے علیے کو لگا جہاں پہنچا دیا تھا۔ اب وہ فانی تو وہ بے آرام اور سکون سے سمندر کی سطح پر ایک بہت بڑے عفریت کے مانند خوش تھا، اور اب میں اسی پر پناہ لینے پر مجبور تھا حالانکہ یہ بہت عجیب تھا۔

یہاں اس برقانی توڑے پر اب میرے پاس

پہلا دن پورا اس دن بحری شکر سے نچے اترنے میں لگے۔ جہاز کی اگلی ٹانف بوٹ سمندر میں ڈوب چکی تھی۔ ایندھن لے کر جانے والا ہمارا بحری جہاز بھی اب ڈوبنے کے قریب تھا۔ رات میں آنے والا ہیٹ ناک طوفان گزر چکا تھا اور اس وقت سمندر پرسکون تھا اور اس میں تیرنے والی واحد چیز، دھبہ بڑا برفانی توہ تھا جسے رات کے وقت ٹھکارا کہا جہاز

طرف اشارہ کر کے بولا۔
 ”محترم! اس خطبہ کی ایک خصوصیت ہے کہ اس
 میں جو چیز ذرا لگے جانے والی نہ ہو، کسی میں
 آکے آنے والی زندگی میں یہ آپ کے لئے بہت مفید
 ثابت ہوگی اور اب مجھے اجازت دیجئے۔“
 اجازت کا سن کر سجاد کے ذہن میں یک لخت
 ایک خیال آیا۔ اور بولا۔
 ”بزرگ مجھے پہنچ کر پہنچ کر ہمارا ربیعہ
 پریشان کر رہا ہے، کیا آپ مجھے کچھ بتائیں گے؟“
 پہنچ کر کریمہ سے اس کی پوچھ سہا کر لیا اور سجاد
 دیکھنے ہوئے بولا۔

”وہ بڑی نہیں، ہرکات کا حافظہ ظلم کا قیادورہ جس کے پاس ہوا کی تین خواہشیں پوری ہوتی ہیں۔ جب تک خواہشات پوری نہ ہو سکیں جب تک ظلم اپنے حاصل کرنے والے سے روشن جاسکتا خواہش پوری کرنا ظلم کی اپنی نشاۃ یوم منظر سے بخود اپنی کردے یا بخود کرے بعد۔ جیسے یہ خواہشات پوری ہوتی ہیں ظلم خود خواہشات ہرکات کے پاس پہنچ جاتا ہے۔“

تو مکمل کر کے پڑھو سے خدا حافظہ کہا اور وہ غائب ہو گیا۔

ساجد نے تھیلی کو ہاتھ میں لیا اور کھول کر دیکھا تو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ تھیلی کے اندر بیش قیمت پتھر مے موجود تھے اور بقول سالار کے اس میں موجود چیز بھی ختم نہیں ہو سکتی۔

مطلب یہ کہ ساجد کے وارے نیارے ہونگے
تھے اب ساری زندگی پیش و آرماس کا مقدر تھا کہ وہ
بیانی کا شوق ساجد اب صرف ان پہاڑوں کو سر کر کے
پورا کرتا ہے جن پر اس کے پیری نے بھی چڑھ سکیں وہ
بھی دو تین سال میں ایک بار۔ کیونکہ تاباں ہیروں کی
تجارت سے اسے فرصت ہی نہیں ملتی جو لوگوں کی نظر میں
وہ افریقہ سے لاتا ہے مگر حقیقت ساجد کی معلوم ہے۔



میرے مولا! یہ کیا ماجرا ہے؟ کہیں میں امرحہ تو نہیں ہو گیا۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا اور زور دے کر کہہ گیا۔
وہ اٹھ کر بیٹھ گیا، پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور باہر نکلتا چلا تو اس کا پاؤں زور سے کسی چیز سے گرایا تو وہ منہ کے بل گرا، اس وقت اسے کسی گاڑی کی آواز سنائی دی ساتھ ہی کچھ روشنی ہوئی، وہ وہیں بندے میں گر گیا کیونکہ وہ اپنے غلیظ میں موجود تھا۔

رات کا وقت تھا اور تمام لائش آن کی اور جلدی
جلدی پڑے تبدیل کیے۔ پرفانی کپڑوں میں اسے
شدید گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کپڑے تبدیل کر
کے فارغ ہوئی اور ہاتھ کا دروازہ پر دستک ہوئی اس نے
دروازہ کھولا تو سامنے سیکورٹی گارڈ کھڑے تھے۔ وہ بند
فلٹ میں چلتی لائن دیکھ کر آئے تھے۔ سراج کو سامنے پا
کر جہاز اتر رہے تھے۔

اس نے ادھر ادھر کی باتیں کر کے انہیں مطمئن کر دیا۔ وہ بچی کے ہمید کے بارے میں سوچ سوچ کر حیران ہوتا رہا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا مایا ہر ہے۔ سوچے سوچے وہ مویگا۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے کرے میں ایک بوڑھے شخص کو دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا، ارد گرد اچھل کر بیٹھ گیا اس یوں اچھلا دیکھ کر بوڑھا گویا ہوا۔

”کلمہ رائیں نہیں۔ محترم ساجدہ میں سالار کے پاس سے آیا ہوں۔ امید ہے آپ پہچان گئے ہوں گے۔ مجھے سالار نے بھیجا ہے کہ کونکلا آپ کو ہمارا وجہ سے بہت ساری جان لیوا معصیتوں کا سامنا کرنا پڑا اس لئے انہوں نے مجھے آپ کے پاس معذرت کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ اور ساتھ ہی آپ کے لئے یہ ذرا مائدہ بھیجا ہے۔“

اس نے ایک سنہری مٹی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔
 ساجد اس کو پہچان چکا تھا۔ اس لئے اب وہ
 مطمئن تھا اور اس کی باتیں سن کر مزید مطمئن ہو گیا تھا۔
 ”میری طرف سے محترم سالار کا شکریہ ادا کیجئے
 گا۔“ ساجد نے کہا۔

یہ سن کر بوڑھا اٹھ کھڑا ہوا اور ساتھ ہی تھیلی کی

ریٹے ہوئے تھے۔ تیسروں نے دنیا سے رابطے کا کوئی ذریعہ کم میں کسی کو اپنی موجودہ حالت سے آگاہ کر سکوں۔ آہستہ آہستہ میں ٹیگر والی جگہ سے دور ہٹ رہا تھا۔ سمندری ہوا مجھے اس قودہ سمیت جنوب مشرق کی طرف دھکیلی رہی ہے۔ اس کی رفتار میرے اندازے کے مطابق آدھا سا تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ اس کا رقبہ کتنے کچھ کم ہائیں کی طرف ہے۔ اب سب سے اہم سوال یہ سامنے آن کر ا ہوا ہے کہ میں جس برقیانی قودے پر موجود ہوں کیا اس کے عمل طور پر پہنچنے سے پہلے کوئی اندازی تخم مجھے بتا پائے گی یا نہیں۔ کیونکہ جوں جوں دنیا کے مختلف گوشوں کی طرف بڑھے گا تو تیزی سے پہنچنا جائے گا۔

اس قسم کے برقیانی قودے تازہ پانی سے بنے ہوتے ہیں اس لیے مجھے یہ سلی ہے کہ میں یہاں سے نہیں مروں گا۔ لیکن ایک سوال ضرور منہ بولے میرے سامنے کھڑا ہے کہ بیوک کے سب تک لڑکوں کا۔ جہاز کے عرثے سے نیچے اترنے سے پہلے جہاز کے کپتان کے کمرے سے میں نے اندازی سامان کا ایک پیکٹ اپنی کمرے سے باہر کیا تھا جس میں شبک اور مضبوط رسیوں کے علاوہ چھلی پکڑنے کا سامان بھی موجود تھا۔ میرا خیال ہے کہ اب مجھے ان کی مدد سے چھلی پکڑنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ اپنی بیوک مٹا سکوں۔

میرا اندازی سامان اور پس اس عمل طور پر داخلہ پروف سے لیکن اس کے اندر مجھے کڑی گری رہی ہے۔ پورے جسم سے پسینہ بہہ رہا ہے مگر مجھے امید ہے کہ میں اتنی جلدی مروں گا نہیں۔

تیسرا دن: جب بات ہے ایک بھی چھلی کا نٹے میں نہیں پھنسی، حتیٰ کہ ان کا کوئی نشان بھی پانی میں نظر نہیں آ رہا۔ ہاں بہت دور شاہین پڑتا ہے کہ وہ دائرے میں چکر لگاتی ہیں مگر وہ قودے کے قریب نہیں آ رہی ہیں کہ میں ان کا شکار کر سکوں، لگتا ہے وہ جان بوجھ کر مجھے نظر انداز کر رہی ہیں۔

کلکے سامان پر سونگ آگ برسا رہا ہے اور سایہ دار جگہ کی تلاش میں آج میں نے سارے قودے کا ایک

چکر لگایا ہے۔ بہت طویل اور بعض جگہ سے اس لیے جلدی چکر مکمل ہو گیا۔ اس کی ہوا رقبہ بہت شاندار ہے۔ اس کی خرد پٹی شکل کہیں کہیں بالکل ہموار ہے مگر جہاں ڈھلوان ہے وہاں آبی زیادہ نہیں ہے کہ اس پر چلنے میں دشواری ہو، مگر جس جگہ میں عجیب بات ہے مجھے یہ پٹیاں کیا وہ یہ کہ اس کی سطح آبی لٹام نہیں جتنی پانی برقیانی قودوں کی میں نے دیکھی ہے۔ یہ قودہ محض برف سے بنا ہوا ہے اور بالکل پتھر کی مانند تھ ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ قدم قدم سے اور اس پر سٹیگٹوں موسموں کا اثر ہے۔ سورج کی کمزور حدت اور بارشوں نے اس کی سطح کو دانے دانے بنا دیا ہے۔ اس سطح میں گڑھے میں پکے ہیں، کچھ میرے ہاتھ سے زیادہ بڑے نہیں ہیں لیکن ایک اتنا بڑا نظر آیا کہ میں ریک کر اس کے اندر جا سکتا ہوں۔ وہ قودہ حاکماتی مانند نظر آ رہا ہے، مگر اندر تو بہت مضبوط ہوئی، اگر میں اس کے اندر چلے کر اس کے بیرونی منہ کو بند کر دوں تو جہاز کا سامان پیدا ہو سکتا ہے، جسم کرم رہ سکتا ہے اور دلت آرام سے گزرتی ہے۔ اس طرح کے مزید گڑھے ملنا غار بھی مجھے ملے ہیں، میں بعد میں آرام سے ان کا محاصرہ کروں گا۔

چھٹا دن: آج میں قودے کی سطح پر بنے گڑھوں کا محاصرہ کر رہا تھا، ایک اتنا بڑا ہے کہ اس کے اندر سے بھی بے ہوش ہیں، کچھ سرنگوں کی مانند ہیں۔ آج میں ان میں سے سب سے بڑے خاکے کے اندر اترتا ہوں۔ بہت دور اندر تک گیا، میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ کہاں جا کر ختم ہوتا ہے۔ میرا اندازہ تھا کہ چند میٹر چلنے کے بعد یہ بند ہو جائے گا مگر وہ چہاں گیا کچھ دور چلنے کے بعد اس میں سے مزید بڑی رستے نکلے نظر آئے۔ مجھے یوں لگا کہ میں ان میں سے کم ہونے والے گا۔ یہ مقامات پر مجھے سرنگ کی سمیت بھی ہونے کی وجہ سے ٹھنڈوں کے بل چنا پڑا اور ایک آدھ جگہ تو ریک کر بھی راستہ لے کر ہٹا پڑا۔ میں کی دفعہ جانے پہچانے راستوں سے بھی گزرا۔ اس سے میں نے نتیجہ نکالا کہ یہ قودہ اندر سے اس کی سرنگوں سے اپنا پڑا ہے جو ایک دوسرے سے

جڑی ہوئی ہیں اور یہ فرخ خیز کے ٹکڑے کی مانند اندر سے نکلا ہے۔ پھر مجھے اس کا مرکز مل گیا۔ اس برقیانی قودے کے نیچے ایک کھلی جگہ ہے، ایک چھوٹا سا ہال ہے جو تقریباً نصف قدم کے محیط پر مشتمل ہے، لگتا ہے یہاں سے برف پہل چلی ہے، مگر کیسے..... میں علم نہیں۔ دیوار پر چھلی ہوئی اور فرش کے مین و دیوان پانی ٹھرا ہے، میرے تختے اس کے اندر بیگ رہے ہیں۔ یہاں کچھ روشتی ہے، ہمیں کہیں سے سورج کی روشنی کی جھلکا میں اندر گھر کر داخل ہو گیا تھا۔ یہاں روشنی میں داغیں طور پر پکھڑے کیما نکلیں نہیں۔

پہلی روشنی میں میری نگاہیں دھیرے دھیرے آس پاس کا ہاتھ لینے لگیں، میں ہر چیز کو بغور دیکھ رہا تھا۔ آج ایک ایک جگہ میری نظر میں تک میں پہلے پہل کو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ پانچہ کچھ اعزازہ ہونے لگا۔ برف کی شفافیتوں کے اندر مجھے کسی جاندار کا جسم نظر آ رہا تھا جو برف کے اندر دفن ہو چکا تھا۔ یہ اعزازہ کرنے میں مجھے کافی دیر لگی کہ برف کی دیواروں میں کس قسم کا جاندار یا چیز دفن ہے۔

ان کی تعداد تین تھی۔ پہلی نظر میں دیووں کا جیسے یہ کوئی انسانی جسم ہے مگر بغور دیکھنے سے اعزازہ ہو کر یہ اعضا انسانی نہیں ہیں۔ برف کے اندر کچھ گھنٹہ کی طرح کچھ کچھ چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ ان کا سائز کچھ میٹر میرے سر کے برابر تھا اور وہ سب گیندیں ایک ٹیوب نما چیز سے جڑی ہوئی تھیں جس کا سر میرے گھنٹے برف کے اندر دفن تھا۔ تاکہ ان روشنی کے جب دور تک دیکھنا ممکن تھا۔ سامنے لہار رہتے تھے۔ ایک گولا بنا اور ٹھنڈا ہوا نظر آ رہا تھا جب کہ پانی دونوں چکر دار اور دفن تھے۔

میں ان کے متعلق کوئی اعزازہ لگانے سے قاصر تھا۔ جب آج ایک مجھے برف کی اس دیوار سے ایک پیچہ ہاتھ لگا کر اٹھا لی وایس کے دو سے بڑے ہونے سے ناخن جو کسی تیز دھار بلیٹ کی مانند تھے وہ بالکل جھبکا چھلی کے ٹپوں کی مانند تھا۔ کسی عتاب کی چوچ کی مانند مڑے

ہوئے ان کی کل لمبائی تقریباً چار فٹ تھی اور یہ پیچہ تقریباً آدھا دیوار سے باہر تھا۔

میں چونک گیا، ایک دم میرے ذہن میں جھمکا ہوا۔ دیوار پر بائیں طرف سے دانے لگن کو لے کر حقیقت اس عفریت کی انکسیر تھیں۔ یقیناً اس برف کے قودے کے اندر کوئی عظیم الجذہ عفریت دفن تھا، کوئی ایسا عفریت جس کے متعلق دیکھا یا سنا نہیں گیا تھا۔ یہ کوئی قشری (خول دار) جانور تھا جو لاکھوں نہیں تو ہزاروں سال ضرور قدیم تھا۔

میں کافی دیر کھڑا رہا مگر تار اور اس پر غور کرنا تارو جہاں ہوتا رہا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے ان دیوئی بڑی آنکھوں کے سامنے برف صاف کرنے کی کوشش کی تا کہ میں ان کو باہر طرے سے دیکھ سکوں۔ فرش پر کھڑے پانی کی وجہ سے چھٹیں جھٹکتا تھا۔ ان لیے مجھے جھک کر ان کو دیکھنا پڑا تھا۔ سہارا لینے کے لیے میں نے اپنا ایک ہاتھ برف سے باہر نکلے ہوئے نیچے پر رکھا اور اپنا وزن اس پر ڈال دیا۔ یوں دیر بعد مجھے اس نیچے میں حرکت محسوس ہوئی پہلے تو میں نے اسے اپنا دم سمجھا مگر جب دوبارہ دیکھا کہ مجھ ہوا تو میں ایک دم متحیر اور اس ہال سے باہر بھاگا۔ دیواروں سے ٹکراتا مگر ہٹا، سانس لینے کی کوشش کرتا مگر سرنگوں سے ٹکراتا، میں باہر نکلا۔ باہر سورج کی روشنی اور کھلی ہوائ نے مجھے سہارا دیا۔ باہر جب میں دم لیا اور میں مجھ کو سونے جیسے کے قابل ہوا تو میں نے اپنے غائب کو اپنی احمق تصور کیا۔ یقیناً وہ پیچہ تحریک ہوا ہوگا کیونکہ میرا اپنا پڑا تو اس پر تھا اور میرے ہاتھوں کی حد تک کی وجہ سے برف چھلی اور اس کی وجہ سے وہ پیچہ اپنی جگہ سے ہلکا ہوا۔ وہ دناس کے زخموں ہونے کا کیا جہاز تھا۔ وہ کئی سال سے برف میں دفن تھا۔

اس میں زندگی کا ایسا سوال..... یہ ممکن ہے..... چھٹا دن: بہت جلد ہی گری رہی ہے۔ کوئی چھلی نہیں پھنسی، آج میں ہر جگہ میں نہیں ہے۔ تاہم قدر پانی سے، نہ میں کان نہیں م نہ نشان نہیں۔ میں اس پیچہ و عریض ٹینگوں پانی کی چادر پر بالکل تنہا ہوں۔ صرف

برقانی تودے کے چٹنے اور طغیانی آزاد آ رہی ہے۔ بہت جھوک لگی ہے۔ مجھے دوبارہ اندازہ چلنا چاہیے کہ کوشش کر کے اپنے شکاری پانچویں عدد سے اس بہت بڑے بچہ کو برف سے نکال لینا چاہیے۔ اس بچے کا گوشت بری جھوک مٹا سکتا ہے۔ گھنچا چڑھا کر سائنس دانوں کی ایک ٹیم کو ساہیو میں ایک برقانی تودے کے اندر سے پوری طرح سمجھا دینا یا بکسل کلاہوں والا مہم ایڈم جی اٹھائے۔ وہ سائنس دان سے گوشت کا تھپا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے اس جانور کے گوشت کا ایک ٹکڑا کھا دیا اور انور کے پھون کر کہا کہ انہیں نے تیار کیا کھانا ذرا عجیب اور بہت برا تھا مگر ان سائنس دانوں میں سے کوئی بھی

کوشش تھی کہ ہر ممکن حد تک اس سرگ سے دور رہوں۔
مراؤن اس خیال سے مایوس ہو رہا تھا کہ اس پر قاتی
ڈوبے پریش آیا جائے گا۔ لیکن وہ، کوئی اور چیز میرے
ساتھ ہے جس سے مجھے چھٹا کرے گا۔
جب ڈراما سن بحال ہوئی تو میں بیٹھ گیا، مجھے
اپنے بائبل پڑھنی اور نئی سی اس کیڑے کی حرکت
آگے سے بھی گزرونی اور یقیناً اس سرگ سے باہر
آنے سے اسے پروا نہ ہو جائے گا۔ اور جب مجھے اس
کے جسم کی طواری کا اندازہ نہ تھا۔
میں پرسکون ہونے لگا کیونکہ میں اپنی توانائی
مٹا کر نہیں کر رہا تھا۔ ایک بیٹے کی بجائے مجھے

[illegible]

30 June 2012

ایک انسان اور ایک ماورائی مخلوق کی چاہت و خلوص اور دیدہ دلیری پر مبنی شر کے خلاف برسر پیکار، خوفناک حیرت ناک عجیب و غریب حالات و واقعات کے گرد گھومتی ہوئی سوچ کے افق پر محو پرواز اپنی نوعیت کی ناقابل فراموش دلغریبی سے معمور، دل میں کسک پیدا کرتی اپنی مثال آپ داستان حیرت جو کہ پڑھنے والوں کے ذہن سے برسوں محو نہ ہوگی۔

ابھی کہا تھا کہ سٹائی لوگوں کیلئے دل پر اثر کرنے والی ایک ذریعہ است اور حیرت انگیز رواد

”شاہد وہ جن اپنے ممکن کی طرف آ رہا ہے۔“ عمیکانے خود کو کھٹے سے جدا کرتے ہوئے کہا۔
”اب میں کیا کرتا ہوگا؟“ میں نے مشغور ہو کر پوچھا۔
”دیکھو یہ جن سرکش ہے، اسے اس لڑکی کے بالوں سے محبت نہیں ہے بلکہ وہ اس کے ستم پر قابض ہونا چاہتا ہے کہ ساری عمر اس کو اپنی ہوس کا نشانہ بنائے رکھے اور اسے جسمانی لذت سے دوچار رکھے اور اس پر جیسی تشدد کرے۔ لہذا اس سرکش جن کو باز رکھنے کے لیے اور اس میں موہن لڑکی کو اس کی گرفت سے نکالنے کے لیے میں اسے جلاٹا ہوگا تاکہ اندر بھی وہ اس لڑکی کو ٹھک اور پریشان نہ کر سکے۔“ عمیکانے اس کا علاج بھی بتائے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”جب وہ جن یہاں اس کرے میں داخل ہوگا تو وہ ہمیں دیکھ کر ٹھٹھک جائے گا اور مجھے سے آگ بکولہ ہو جائے گا۔ جب وہ تم پر حملہ آور ہوگا کہ تمہارے ہاتھ میں اس کی مجیبہ کے بال ہوں گے تم اس وقت ناچس کی سلائی جلا کر ان بالوں میں آگ لگا دینا۔ جیسے جیسے بال جلنے جائیں گے، وہ بے ویسے اس کی جھوٹی محبت دم توڑتی جائے گی اور وہ خود کو مل کر تباہ ہوگا

جائے گا۔ اس کے راہ کو ہونے کے بعد وہ لڑکی بیٹھ کے لیے اس کے لڑے زادو ہو جائے گی۔“ عمیکانے کا اعتراف درست تھا۔ پلک جھپکتے میں وہ کرے کے اندر آن موجود ہوا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس لڑکی کے بال اور دوسرے میں دیا سلائی پکڑ رکھی تھی۔ وہ واقعی مجھے دیکھ کر پریٹھک کرک گیا۔ پھر مجھے سے آگ بکولہ ہوتے ہوئے مجھ پر پھسکا۔ اس سے پہلے وہ مجھ پر حملہ آور ہو کر بال میری گرفت سے جڑائے میں کا سیلاب ہو جاتا۔ میں نے دیا سلائی کو جلا لیا تھا۔ تب وہ چیخا۔
”دیکھو کیا امت کرو۔ مجھے میری مجیبہ سے جدا مت کرو۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ میری مجیبہ کی رضا مندی کو چھوڑ کر نہیں ملانے کا۔ مگر تم نے وعدہ طمانی کی ہے۔ جیسے جیسے بالوں کو آگ جلا رہی تھی، اسے جلن ہی محسوس ہونے لگی تھی۔ اچھا چلو چھوڑو۔ تمہا دو یہ آگ۔ میں وعدہ کرتا ہوں اس لڑکی کا بیچا چھوڑ دوں گا۔ اس کا دیتا سے بہت دور چلا جاؤں گا۔ مگر پلٹ کر نہیں آؤں گا۔ مجھے دیکھو تم جلاؤ۔ چھوڑ دینے۔“ اس کی آواز فضاں دیکھ کر میرا دل نرم پڑ گیا۔ میرا دل بچ گیا تھا۔ میں نے عمیکانے کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ مگر اشارہ باکس میں وارد ہوا۔ دل ہو گیا۔ بالوں کے

”میں گڑا۔۔۔ تمہارا کزن تم سے عجیب کرتا ہے تو وہ ہمیں ہر حالت میں اپنا لے گا اور تمہارے بال بيمش کے لیے ایسے سوزی رہیں گے ان بالوں کے بعد سے بال جا نہیں گے۔ ایک سال بعد پھر تمہارے وہی حسین، دل نش، لمبے سیاہ، گھنے، چمک دار اور نرمی بال ہوں۔ تم کوگی تو جن تمہارے کزن سے بات کرے گی کہ دل کا حال چاہ لوں گی۔“

ہمکنے لے اسے سمجھاتے ہوئے ان موٹے سے شروع

”دیکھو مسٹر نیلما کو ایک پیاری نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا، جس کی وجہ سے اس کے دو تمام حسین بال جھڑ پڑے ہیں جو ہمیں پسند تھے۔ لہذا اب اس درخت کی مانند ہے جس کے پتوں کے موسم میں تمام پتے گر جاتے ہیں۔ کیا تم اس صورت میں بھی اس سے محبت جتانے رو گے۔“ فریڈا نے اسے کہہ دیتے ہوئے پوچھا۔ دو درخت گرا کر اندر کے میں گیا۔ واقعی نیلما کی ہونٹیں تھیں۔ اس کے کزن کو ایک دھچکا لگا اور وہ دل پکڑ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ دو خوشگوائی کے اعزاز میں کھانا کھا۔

”بابا جی مہری بہن نیلما کی شادی پر خرچ کر دیتا۔ خدا حافظ۔“ میں بھی حمیرا کے پیچھے پیچھے گھر سے باہر نکل آیا۔

”ہماری محبت اور ہمارے نکاح کا گواہ خدا ہے اور خدا سے بڑا گواہ اور سچا کوئی نہیں ہے۔“ قمیہ کا کہنا اس جواب نے مجھے واقعی لاجواب کر دیا تھا۔ میں خاموشی سے اپنا ہاتھ سفر طے کرے لگا۔

”کیا تمہیں اپنے کام کا کامیابی ہوئی۔“

مجھے خاموش دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو ڈھونڈا تھا۔

”ہاں سرائقو لیا گیا ہے۔ مجھے وہیں جانا ہے۔“

انشاء اللہ بہت جلد اس مہم سے فارغ ہو کر میں اپنے گاؤں چلیں گے، جہاں میں تمہیں اپنا لوگ دگا۔ دکان والوں کو بھی کواہ بنا کر ٹھیک ہے تم ان لوگوں کا خیال رکھنا۔ میں بہت جلد تم سے ملوں گا۔“ میں یہ کہہ کر رخصت ہو گیا اور فریقہ الہمر کے گھر چلی گئی۔

میں نے اریبہ سے رابطہ کیا اور ملے کا کہا تو اس نے مجھے ایک جگہ بتا دیا، وہاں با آسانی پہنچ گیا تھا۔ چند روز بعد اریبہ کی سہیلی آئی۔ وہ مجھے کے کرک ایک شان دار رستوران میں چلی آئی۔

”ارسلان صاحب! مجھے بہت زوری ہو کہ لگی ہے۔ آج میرا موڈ تھا کہ آپ کے ساتھ کی اچھے سے رستوران میں کھانا کھاؤں ٹھیک ایک بجے اور ہو کہ وقت بھی ہو رہا ہے۔ اگر نماز تک میں ایک بجے ہی گئے تھا ہوتا ہے۔“ اریبہ باتیں کرتی ہوئی رستوران میں ایک طرف جانے لگی تو میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا رہا تھا۔ رستوران میں چھوٹے چھوٹے میز بنے ہوئے تھے۔ اریبہ نے کرسی پر نظر اکر رہے تھے۔ کیوں کہ یہاں پر انہیں کسی کا بہت خیال رکھا گیا تھا جس سے یہ رستوران اور اس کا ماحول دی آبی ٹی نظر آ رہا تھا۔ اریبہ نے ایک ویڈیو کیمرا ہاتھ میں لے کر ایک کونے کی طرف لپکا، جہاں ایک میز بنی خالی تھا شاید اریبہ نے پہلے سے جب کہ لیا تھا۔ اریبہ نے بچ کا آڈر دیا۔

”مس اریبہ! اس قدر تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ میں سادہ سا کھانا پسند کرتا ہوں اور بھرت چائے کی ایک پیالی پر بھی تو اتنا کیا جاسکتا تھا۔“ یہ بات میں نے ازراہ تکلف کہی تھی، ورنہ حقیقت تھی کہ مجھے بھی ہو کہ بہت شدت سے محسوس ہو رہی تھی اور پھر اس رستوران میں بیکان کی خوببوہوا کے جھوکوں کے ساتھ آریبہ کی جو بھوک بھڑک رہی تھی اس نے مجھ سے تکلف

دن کر کے ابھی کی اور میں اس کے اسرار پر اس کے ساتھ کھانے میں مشغول ہو گیا۔ عجیب پُر لذت اور ذائقہ دار کھانا تھا۔ میں لوگ اپنے گھروں کے اور اپنی بیوی کے ہاتھوں کے بیکان چھوڑ کر ہوٹلوں کا رخ کرنے تھے۔ حالاں کہ بہت سے لوگوں کے گھروں میں لگ ب لگ اچھے پڑے گھر تھے غیبت ہوتے تھے جو کئی لذیذ اور ذائقہ دار کھانے بناتے تھے مگر پھر بھی ہفتے میں دو تین دن لوگ ہوٹلوں اور رستورانوں کا رخ ضرور کرتے تھے شاید یہی لذت اور ذائقہ ان کو یہاں منتقل کیا ہے۔

”کیا آپ ہر روز کھانا باہر کھاتی ہیں۔“

میں نے چون کر کہا ایک جیسے لیتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں! لیکن وہ عادت نہیں ہے، میری گھریلا

ملازمہ بہت اچھے بیکان پکا لیتی ہے۔ اس کے ہاتھ

میں لذت ہی نہیں، یہ حد ذائقہ بھی ہے اور پھر اسے

اچھے کھانے پکانے کا تیل بھی آتا ہے۔ شاید اس نے یہ

خبر باقاعدہ سیکھا ہوا ہے۔ بس کبھی کبھار جب کی

دوست کے ساتھ ہوتی ہوں تو کی اچھے سے رستوران

میں کھانا کھانے کو ترجیح دیتی ہوں۔“ اریبہ نے دوست

کے لفظ پر زور دیتے ہوئے بتایا۔ میں کچھ دیر خاموش رہ

رہے تھے۔

”جی مس اریبہ۔ کیا آپ نے کالج جا کر

کچھ معلومات اکٹھی کیں؟“ وہ بھی مجھے ان موضوع پر

آنے کے لیے بے چین دکھائی دے رہی تھی۔ میرا

سوال سننے ہی پر ہی آئی۔

”ہاں ارسلان۔ میں مقامی انجینئرنگ کالج گئی

تھی۔ پرنسپل صاحب چھل حسین زیدی صاحب سے بھی

ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو

انہوں نے اس معاملے میں میری بہت مدد کی۔ ارباز خان

کے دو سے نوٹ کر دیئے۔ ایک خاص کامیابی کا جو

میں کا تھا اور دور مستقبل بنا جو کوئی کہے۔ ارباز خان

کے ایڈمٹ کارڈ پر اس کی تصویر کو بڑے غور دیکھا۔ یہ

وہی شخص تھا جو سارے کے پڑوس میں آکر رہا تھا اور پھر

رہا تھا۔ دن لوگوں سے جان کاوری پیدا کر کے ساتھ ساتھ میری شادی بھی ہو گئی اور پھر حسینہ سمیت صاحبہ کو لے کر کوئٹہ چلا گیا۔ ارباز خان نے اپنا نام اور میں اس کا نام تھا۔ یہ شخص اس قدر ذہین تھا کہ اس نے دونوں شادیوں کے موقع پر اپنی کوئی تصویر بننے نہیں دی تھی۔ اور سووی نیکرو کر رہا تھا۔ اسلامی شریعت کی آڈ لے کر۔ پھر اعتراض کرنے والے کو اس نے بیکان بیان دے کر جب کرادیا

تھا کہ اسلام میں تصویر بنی حرام ہے، اس لیے وہ تو

تصویر کھینچنا چاہتا ہے اور نہ ہی سووی ہوتا۔ چون کہ اس

شخص کی کنیت میں پہلے ہی سے تھا تھا، اس لیے اس نے

انہیں چھپانے کے لئے کناہ اور ہرم کو کئی نشان میں چھپا دیا۔

کالج کے فائیم میں بھی جو تصویر لگی تھی، اس تصویر میں بھی

اس کے چہرے سے رجسٹر اور فرعونیت ظاہر ہو رہی

تھی۔ یہ شخص لازمی قاتل تھا۔ اس نے اپنی دونوں

ہاتھوں کو ٹوٹ کیا ہوگا۔ میں نے اریبہ کے ٹوٹ کیے

ہوئے سے پتہ چلے۔ ایک ہتھیار گاؤں کے قریب شہر کا تھا

اور دور ارباز کوئی دی آکٹیشن روڈ کا تھا۔

”ارسلان! کیا سوچنے لگ گئے ہو؟“ اریبہ

نے مجھے کی گہری سوچ میں غرق دیکھ کر سوال کیا۔

”جی ٹھیک نہیں ہوا اریبہ۔ اب ہم اس دور سے

فرض تک آتی ہے پہنچ سکتے ہیں اور ارباز روڈینہ اکرم

کی مدد سے اس پر ہاتھ بھی ڈال سکتے ہیں۔ کیوں نہ اس

سلسلے میں مس روڈینہ اکرم سے مشورہ کر لیا جائے۔

”میں نے اچانک خیال غائب کیا۔“

”بائبل ٹھیک ہے۔ اس سلسلے میں وہ شخص

عورت ہمارے ساتھ پہلے بھی بے لوث مدد کے لیے تیار

ہوگئی تھی۔ اب بھی وہ نا اشل سے کام نہیں لے گی۔“

اریبہ نے میری تجویز سے اتفاق کیا تھا۔ لہذا اس بار

میں نے انجینئر روڈینہ اکرم کو اپنے گھر پر دعوت دے کر

بلا دیا تھا۔ بحیثیت ایک دوست کے، تاکہ اس پر دوسرے

ماحول میں اس سے اس موضوع پر گفتگو ہو سکے۔ روڈینہ کو

بھی کوئی اعتراض نہ ہو سکا۔ وہ خوشی آج رات سات

بجے اریبہ کے گھر آنے پر تیار ہو گئی۔ میں شام تک آنے

کے لیے اریبہ سے رخصت ہونے کی اجازت چاہنے کا

مگر اس کے بعد ارباز اور میں نے جا کی خدمت کے

وہیں روک لیا تھا۔ سر یہہ ہو چکی تھی۔ سورج آہستہ

آہستہ مغرب کی سمت اپنا دن بھر کمر مسل کر رہا تھا۔

دھوپ ڈھلتی جا رہی تھی۔ دھوپ کی چمکی ٹخن میں

شدت کی جگہ نرمی آ رہی تھی۔ دن کو تاریکی کا خوف

ستارے لگتا تھا۔

اریبہ نے چائے بنوا دی تھی۔ میں اب بھی

سائبر اور علیقا کے قاتل کے بارے میں منصوبہ بندی

کر رہا تھا کہ اس کے سفر پر ان کیسے گرفتار کیا جاسکے گا۔

شروعات کے لیے کسی جگہ سے ذہن میں ایک تریب

آگئی تھی۔ میں سوچ چکا تھا پہلے اس گاؤں کے قریب

شہر میں جا کر ارباز خان کے عارضی سے پتہ چھاپا مارا

جائے، غیر محسوس انداز سے۔ ہو سکتا ہے وہاں سے کچھ

نشانبات مل سکیں۔ یا اس کی کوئی خبر سننے کو میسر آئے۔

ہو سکتا ہے۔ یہاں سے کچھ مشکلات مل ہونے کے آثار

نظر آجائیں۔ اگر وہاں سے کچھ نہ مل سکا اور نا کافی ہوئی

تو پھر میں کوئٹہ کا رخ کرنا پڑے گا جو رات پورا چندن

پور سے بہت دور تھا اور سارے پارکس۔ کچھ میرے خرم

خوسے اور بہت دور تھا۔ میں کوئی چٹان نہ خرم

نہیں بن گئی تھی اور نہ کوئی سرحد اور بارڈر میرا راستہ

روک سکتا تھا۔ دوسرے سے پتہ نہیں لازمی کوئی نہ کوئی

خاطر خواہ کامیابی ضرور ہوگی، جس سے میں ارباز خان

تک پہنچنے میں ہولت ہو جائے گی۔

اگر اس کی گرفتاری عمل میں لانا مقصود ہوتی تو

رحمتی باقی ہے۔ ہم دونوں ڈھنی آٹھنگی کی بنا پر ہی ایک دوسرے کے غریب آئے ہیں اور ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے پر کمر بستہ ہیں۔" میں نے ہر ایک کا عتابانہ تعارف کرانے ہوئے کشادہ دل سے بیان کیا کر دیا۔

کو ایک دوسرے کا جینوں سامنے بنایا ہے۔ دونوں کا سناوٹ، بدنن یا ریشہ ہے جس کے ذریعہ تعلیم دونوں نے خود کو نونے والے بدنن میں حاصل کیا ہے۔" اے

نے مردہ دہلی سے پوچھا تھا۔
 ”دراصل ہم نے خدمتِ خلق کا اپنے آپ
 سے عزم کیا ہوا ہے۔ ہم نے اپنی زندگیوں کو خدمتِ خلق
 کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ میں نے بھی اور میرے
 بھی۔ یہی وہ فانی ہم انجسکی ہے جس نے ہمیں ایک
 دوسرے کے قریب کر دیا ہے۔“ میں نے اپنا شش پان
 کر دیا تھا۔

”کتنے خوش نصیب ہو کم دونوں جو دینی ہم
آجکی دلا ستمی مل گیا ہے۔“ میں اریہ کا دکھ سمجھ سکتا تھا
اور مجھے اس کی تنہائی کا خیال بھی تھا اس نے ایک سر دواہ
بھری تھی جو میرے دل کو چر کر زور تھی گئی۔ میں نے دل
میں خیال کیا، اگر مجھے زندگی کے کسی موڑ پر ایسا لڑکا ملا
اریہ کے قابل ہو تو اریقینہ اسے اریہ سے شادی کے
لیے تیار کر لوں گا جو اریہ کو بھی پتہ نہ آئے گا۔

تمام ہوئے کوئی۔ میں نے اوریہ سے اسباب
 روینہ اکرم کو پرائیڈ کرانے کے لیے کہا۔ اس نے فون
 پر اسے پرائیڈ کرایا تو دو گھر سے فطری دانی کی اور اسی
 طرف آ رہی تھی۔ جس منٹ گزرے ہوں گے کہ پکپک
 روینہ اکرم نے تیل کا پٹن دیا۔
 ”روینہ میری دوست، میں نے تمہیں آج
 نبی اپنے کام کی لیے اوریہ دے دی۔ تم بھیجی کہ
 میں بھی اسی مطلب پرست گورت ہوں۔ دراصل“

”اریبہ..... تم اسے زحمت کا نام اور مطلب پرستی کا الزام کیوں دے رہی ہو۔ یہ تو میرا فرض ہے۔ میرا پیشہ ہے، اور میرا اخلاق فریضہ بھی بنتا ہے کہ میں

نہیں سکتا۔" اوریہ نے بڑے وثوق سے کہا۔
 ”ہاں اور بیڑہ صابرہ..... اوریہ ٹھیک کہتی ہے
 کیوں کہ وہ اس کا بہنوئی تھا۔ شادی کی ساری رسومات
 اس کے سامنے ادا ہوئی ہیں۔ یہ یقیناً اس کی ہر حرکت
 سے واقف ہوئی اور پھر اراہز خان کو اس تصویر کے
 حوالے سے میں بھی بخوبی پہچان سکتا ہوں جو مجھے

صانع کی کہن نے دکھائی تھی۔“ میں نے ردِ بینہ کی بات کو کاٹے ہوئے کہا۔

باخلاق اور منتہا رہی ہے۔ اس کے چہرے پر کوئی مسما
کی اور قابل پن کی کوئی تحریر نہیں آتی۔“ روینہ نے
ہر ذرا سے اسے باز خان کی تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا۔
”کیا آپ ہمیں بھی اس لڑکے سے ملوا سکتی
ہیں، جس کو میں اب باز خان اور ہے اور جسے خان سمجھ رہے
ہیں۔“ امیرہ نے ہرے دل کی ترغیب کرتے ہوئے
پوچھا۔
”کون نہیں ملوا سکتی۔ بالکل ملوا سکتی ہوں۔
لیکن آپ لوگ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ جس شخص

سے میں آپ کو ملوانے جاؤں گی وہ نہ تو بار بار خان ہے اور نہ ہی اور میں خان، اس کی شکل اس تصویر سے ضرور ملتی ہے مگر اس کا نام دلاور خان ہے جو اسلام آباد میں ایک ڈسپینری سینٹر کو چلا رہا ہے اور اس کا ڈسپینری سینٹر

کسی ایک قسم کی اشیا کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس میں ضروریات زندگی کی تمام اشیاء چھپتی ہے بڑی سستی سے چھپتی سب موجود ہیں اور وہاں ہر درجہ کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ ان کا کاروبار اندرون ملک سے چرون ملک تک پھیلا ہوا ہے یعنی یہ سمجھ لو کہ یہ ایبورت، ایکس پورٹ کا کام بھی کرتا ہے۔ دلار خان بہت معزز اور شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔“

رہیں۔ جاہلی تھی کہ شادی سے پہلے وہ لا در خان کی آزمائش ہو جائے گی۔ اس کارروائی میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ اور یہ ہے مجھ سے ایک دن کی سہلت۔ باقی کا کمرہ پوری نر کی ہے تو اس میں ہم بکلا جائے۔ بچانے کب آؤں گی سو مجھے کوئی کام نہیں تھا۔ میں نے یہ دن خیمہ کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح خیمہ کے سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور اچھا رکے حالات۔ اس ساتھ ساتھ عامل جو درکار انجام بھی مضام ہو جائے گا۔

میں عجیب اتفاق تھا کہ میں جس جگہ، جس مقام پر کڑا ہو کر ٹھیک کا حاضریہ کرنے کے لئے دھڑاتا ہوا تھا، اس وقت اسی مقام پر بہت جلد حاضر ہو پائی تھی۔

میں اس وقت کے گھر سے نکل کر اسی ریسٹوران کی طرف چل پڑا تھا، جہاں ایک بار بیٹھے امیر نے ہر یک کلف خیانت کلائی کی۔ اس صبرِ راجھی میں چاہ رہا تھا کہ میری آواز دی آئی ہے ریسٹوران میں کچھ کلاؤں اور دیر ساری باتیں کروں۔ میں نے اپنے منصوبے کے مطابق ٹھیک کا حاضریہ کرنے والے لئے دھڑاتے لڑوہ اسی نشانہ پر آدمی کی جس پر میں محزون تھا۔ میری آنکھوں میں خوشی کی چمک ہو گئی اس کے چہرے پر تو ایسی تازگی، نمٹھری کی سی کسی گلاب کو بہار کی ہواؤں کے سمجھو کی تھی۔

”امسلمان خیر تہ تو ہے نا۔“ ”ہم کیا کرے اصر

اور نظر نہ کرتے ہوئے پوچھا۔
 ”ہاں سب خیر ہے لیکن تم اس قدر فکرمند
 لہجے میں کیوں پوچھ رہی ہو۔“ میں نے سوال کیا۔ کیوں
 کہ میری حیرت دو چند ہو گئی تھی۔

”دراصل جب تم مجھے یاد کرتے ہو اور ملنے کی خواہش میں وارد کرتے ہو تو میں ڈر جاتی ہوں۔ کہیں تم کسی مشکل یا معصیت میں تو نہیں پھنس چکے ہو۔ یا کوئی دوسرا شخص موت اور زندگی کی کش مکش میں جھٹا تو نہیں ہے جس کی تم تہہ در تہہ کرنا چاہتے ہو۔ میں انگریزی کی صورت حال میں ایک تجسس لے کر حاضر ہو جاتی

ہلی معلوم ہو جائے گا۔" میں نے غصوں کیا کہ رات
 بھر ہوا۔ نے کہا ہوں کے ساتھ ساتھ سردی میں بھی اضافہ ہوتا
 رہا رہا تھا۔ میرے کمرے کے شانے سے سر کا دھڑکا۔
 ایک جھٹکے سے جھکی رک تھی۔ میں نے کمرے سے
 اُرد کیا تو ران اور سنان جاگتھی۔ جہاں دور دور تک
 کوئی آبادی نہ نظر آ رہی تھی۔
 "کیا ہوا۔" میں نے جیسے ڈرائیور سے
 پوچھا۔

نے تھکی کا دروازہ کھول کر ہمیں چھپنے اترنے کے لیے کہا۔ میں حیران تھا کہ وہ مسلسل چھری یا پادھر میرا کوا گاؤں کی طرف تیار کر رہا تھا۔ ایسا کیا کیوں۔ میں نے اس پہلو پر غور کیا تو بات غور سے سمجھ آگئی۔ میں نے ایک نظر میرا کوا جسامت پر ڈالی اس کے سر پر ایک بھر پور نظر سے مشاہدہ کیا۔ میرا کوا اس وقت دیہاتی لباس میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے بھاری دالی چھوٹی سی کرتی اور آدمی پٹلی تک کا کلا ہوا ایک کپڑا رکھا تھا۔ لپٹنے کی ہیبت اور کھڑے ہو کر ہلنے کی ہیبت میں جیت میں ہیبت کی ہیبت اور کس کے لیے جی ہوا کی ہیبت سے اس کی اسارت میں نکل کر سامنے آگئی تھی۔ چھوٹی سی کرتی پر ۲۰۰ لپٹی جی جڑیا۔ اس کے سینے کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اس تھکی نے ڈانچہ کرک نظر اٹھا میں جلا ہوا غریب فطری نہیں تھا۔ اگر میں بھی دور سے میرا کوا دیکھتا تو غلطی دیہاتی تو ہی ہی تصور کرتا۔ جب ہم تھکی سے باہر نکلے تو اس نے بیروں میں اونچی بیڈل کی بجائے کھوسے چھن رکھے تھے اور سونے پر ہمارے لیے کیا تھا کہ باقوں کی چوڑیاں اتار کر سونے کے کھوسے کے کڑے اور بیڑوں میں جاندار کی پانچ بھی پھینک رہی تھی جو اس کے قدم رکھتے پر چھین کر چمن کا شور مچا رہی تھی۔ رہی کس کی اس موٹے موٹے موتیوں کی مالاؤں نے پوری کڑی میں جو میرا کوا نے اپنے گلے میں کس سنیا سی ہوا کی طرح ڈال رکھی تھیں شاید وہ سونے کے بڑے بڑے ٹھیکے اور بیڑی چھری والی لوگ بھی چھین لے کر آکر اس کے کان اور ناک ہماری حوصلوں کی طرح پھینچے ہوئے ہوتے۔

ایک ایک دور سے آتی ہوئی ایک اور تھکی ہمارے قریب آ کر رک گئی اس میں جس سے چار بچے تھے جو جان بچا رہے ہوئے۔ اس نے ایک نے لپٹا لی ہوئی نظروں سے میرا کوا جائزہ لیتے ہوئے چھما۔

اور اُن میں انا بچا مشکل ہو جائے گا۔
 ”اگر ہو تو کون ہیں یہ لوگ۔“ سردار کے سوال
 نے میری قصود کا سلسلہ ختم کر دیا تھا۔

”سردار یہ شہری بالو ہمارے گاؤں کی عزت کو
 خاک میں ملا رہا تھا۔ اس گاؤں کی گوری کو اپنی جھوٹی
 محبت کے جال میں پھنسا کر شہر لے جا رہا تھا۔ جیسے کہ
 اس سے پہلے کسی کی شہری بالو ایسا کرنے کا ارادہ کر چکے
 تھے۔ ایک دوق کا سا بچہ بھی ہو گئے تھے۔ سردار یہ لوگ
 گاؤں کی بھولی بھالی لڑکیوں کو محبت کا ہمسارہ دے گا کتنی
 ہوس کا کھلا رہتا ہے۔ اور یہی بھرا جانے پر اسے ٹھٹھے
 والوں کے ہاتھ روکتے رکھے گا۔ کونسا بچہ بچہ بچہ
 کر دیتے ہیں۔“ لکھنئی ڈراما ہیر نے کمال کی انکار
 کرتے ہوئے کہا۔

”کیوں ری چھوڑی؟“ تجھے بھی لاج نہیں
 آئی۔ اسے ماں باپ کی ناک کھانا چھٹی تھی۔ یہ جوانی
 دہائی ہوتی ہے۔ کیا یہ دیوانہ پن اس کی شہری بالو کے
 ساتھ پروا کر رہا تھا۔ تجھے ہے اپنا جو بن سنبھال لیں جا رہا
 ہے تو لیا میں اس کا رکھوالا بنا دے۔ ہم اس کی حفاظت
 تجھ سے بہتر کریں گے۔“ سردار نے آگے بڑھ کر
 غمیکہ کا بازو پکڑا دیا تھا۔

”دیکھو گوتم داس کی شہری بالو سے پوچھو کہ
 کس کا قاتل کون سے شہر سے ہے اور لکھن میں کیڑے
 گردہ کا سامھی تو نہیں ہے۔ جس کا کام ہی ہے کہ
 گاؤں کی سیدھی سادی لڑکیوں کو غلام کر شہر لے جاتے
 ہیں اور اپنی ان گنت رنگین کرتے کے بعد ان میں کسی
 دوسرے گردہ کو کوچ دیتے ہوں یا پھر طوٹ بے کار جسم
 فروشی سے بھی دہل کھاتے ہوں۔ ذرا ابھی طرح
 کاہلیاں کرنا کہ ایک کس کس گاؤں سے کتنی لڑکیاں اس
 طرح لے جا چکے ہیں۔ میں ڈراما کی کئی کئی عزتوں
 خاک میں ملا رہا ہوں۔ کیا وہاں کام چا پوچھوں۔“ سردار نے
 مجھے ان ظالم اور سفاک دروہے نما لوجوؤں کے
 حوالے کرتے ہوئے غمیکہ کو کھینچا ہوا اپنی ضد
 عمارت میں لے گیا۔ اچانک سردار کے قدم ٹپک گئے۔

اور پولیس کی نظروں میں نہیں آتے تھے۔
 لکھن غمیکہ نے میرے کان میں گونجی کی تھی کہ
 اس کا خیال ہے کہ لوگ ڈاکو ہیں بلکہ راندن ہیں جو
 راتے میں رات کے وقت گھات لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔
 اور رات کے راہی اور دیگر مسافر کو لوٹ لیتے ہیں۔
 اس طرح یہ لوگ رات گاہے کا رنہ لے لکھنئی ڈراما ہیر اور
 دیگر بہرہ پر کی صورت میں پھیلا دیے ہیں جو
 مسافر کو زوردار حکما کا پیڑ ڈرائی سے لوٹ لیتے ہیں
 اور اپنے سردار کے پاس بھانے سے لے آتے ہیں تاکہ
 ان کی شخصیات کو حوصلہ دے جواب دے جائے۔
 یہ محض اس کی خیال کی حد تک درست تھی۔ ہوسکا
 تھا۔ کیونکہ لکھنئی ڈراما ہیر نے ہمارے ساتھ ساتھ کچھ ایسی
 سلوک کی تھیں کہ گھات لگا کر ہمارا چھپا کیا اور پھر ہمیں
 اپنے جال میں پھنسا کر دیرانے تک لے گیا اور
 پھر کسی ایک کس پر ٹپک گیا۔ اس لکھنئی ڈراما ہیر
 گھات نہ ہوتی تو اس کے ساتھ بغیر کسی اطلاع کے ہم
 تک کیسے پہنچ سکتے تھے۔ وہ خود بخود ہماری سست چلے
 آئے اور میں اپنے سردار تک چلے آ کر پھر گیا۔

میرے دل میں ایک خدشہ اور جھمکے نہ رہا تھا۔
 یہ کہ لوگ نہ ڈاکو ہیں اور نہ راندن کی ٹیڈے لگے یہ گردہ
 مجھے عزت کے ٹیڈے لگے اور ہوس کا کار زیادہ نظر آ رہا ہے
 تھے۔ ان کی نظروں سے عوامی چمک رہی تھی۔ ان کے
 جسم اور پتہ سے بھی عیاں ہوں سے کہیں تھے اور پھر ان
 کی حرکت و شکلات بھی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ ان کا نشانہ
 بھولی بھالی گاؤں کی غریب لڑکیوں کی عزت سے
 کھینچا ہے۔ کیوں کہ جب ان کا سردار ایک آواز پر اس
 خدشہ کو حل نما عمارت سے باہر نکلا تو اس کی نظر سب
 سے پہلے غمیکہ پر ہی جم گئی اور وہ اس کی بیوی کے
 پیچھے لڑکی کی طرح گھبرا ہوا تھا، جیسے وہ کوئی کوشٹ کا پیچھے
 بڑی ڈال لگاوا اور خود بخود پیچھے سے نہ میں جا
 جائے گا۔ اگر میرا یہ خدشہ درست تھا تو غمیکہ ان کے
 لیے وہ بڑی ثابت ہو گئی جسے وہ تو نگل سکتے ہیں اور نہ
 ہی اٹھ سکتے ہیں۔ وہ ان کے گلے میں ایک جائے گی

پہلی بھی منظر ہو گا۔“ میری بازوؤں کو دھونچا وہ ان
 ٹپک کر کہ ہے۔“ لکھنئی ڈراما ہیر نے ہمیں اسی
 غمیکہ میں پیچھے کا اشارہ کیا جس میں ہم سوار ہو کر اس
 دیرانے تک آئے تھے۔ پھر وہ چاروں کو جان بھی لائی
 لکھنئی میں سوار ہو گئے۔ ہماری لکھنئی روانہ ہوئی تو،
 لوگ بھی ہمارے پیچھے پیچھے چلے گئے۔ رات کا وقت
 تھا۔ ہر طرف سنسن اور دیران چمکی۔ سنا پھار اور
 تھا۔ اندھیرے کا راج تھا۔ تیز رفتاری کی وجہ سے وہی
 منٹ کے وقفے کے بعد ہم ایک جنگل میں داخل
 ہوئے۔ جسے اس جنگل کے سر پر ہی مندر تھا۔ یہ
 ڈراما ہیر کی انگلی اب بھی ٹرانسپیر پر تھی۔ وہ
 چاروں کو جان بھی مست خرابی میں ہمارے ساتھ چلے
 گئے۔ مندر کے پیچھے ایک بڑی حویلی نما عمارت بھی ہو
 کر اب شاید بڑا جنگل تھی۔ یا اسے یہاں کے لوگوں نے
 خدشہ خیز قرار دے دیا تھا۔ شاید اس لیے ان لوگوں نے
 ہمدعا میں یا ڈاکوؤں نے اس پر قبضہ بھالیا تھا۔ میرا
 خیال تھا کہ یہ کوئی ڈاکوؤں کا بڑا گردہ ہے جو رات کے
 وقت گاؤں میں یا اس کے قریبی علاقوں میں لوٹ مار کرتا
 ہو۔ وہ خود بخود بہرہ پر دل کر رہا کہ میں شاید لوگ
 عام انسانوں کی طرح گاؤں میں رہے ہوں گے۔ اس
 طرح کی کواکلوں کا ان کاں کے کا لے کر تو اس کی خبر بھی
 نہیں ہوتی ہوئی اور ان کا بھرم بھی قائم رہتا ہو گا۔ اچھے
 ڈاکوؤں کے گردہ کا کامیابی سے ڈاکوئی کرتے رہتے
 کا ثبوت یہ بھی تھا کہ ان کے پیچڑوں کو لوگوں میں کتنے
 لے رہے تھے جن سے اس گردہ کو خبریں ملتی تھیں کہ کس
 کے گردہ میں اتنا زیادہ ہے اور کس کے پاس مال،
 دولت کتنی ہے یا پھر کس کے گردہ میں عوامی یا غیر عوامی
 تجارت کے ذریعہ ہیں۔ اس طرح کتنی خبر پا رہی تھی
 لوگ جوں میں گاؤں والوں کے ساتھ ان کے پیچڑوں
 بن کر رہتے تھے رات ہوتے ہی ڈاکو بن جاتے تھے اور
 وہی چار لوگ مار کرتے تھے اور کامیاب رہتے تھے۔
 اس طرح یہ لوگ نہ صرف عوام بلکہ خواہی چھوڑ دیں

کرم دلوں میں بھی جی اور اس کاؤں میں ہمیں
 کی حیثیت سے رہا نہیں پڑے ہیں۔ لکھنئی ڈراما ہیر نے
 میری طرف اشارہ کر دیا۔ ہوتے جواب دیا۔
 ”کیوں رے شہری بالو، کیا تجھے ہمارا ہی گاؤں
 ملا تھا اپنی ہوس کو مٹانے کے لیے۔“ دوسرا شخص نفرت
 سے بولا۔
 ”نہیں بھائی جان، میں نے کہا ناں کہ آپ
 لوگوں کو غلطی ہوئی ہے۔“ میں نے غمیکہ کا ہاتھ
 تھامے ہوئے پھر کہا۔
 ”واقعی ہم دلوں میں ہیں اور یہی ہیں اور آپ کے
 گاؤں کی لڑکی کے رہنا کے گردہ میں رہا ہوا اختیار کیے ہوئے
 ہیں۔ اس کی چچی اس بات کی گواہ ہے کہ کرم اس کے
 ہمسار ہیں۔“
 ”کیا تم اپنا نکاح نامہ دیکھا سکتے ہو جو اسے
 دہتی ہے کہ رہے ہو کہ ہم دلوں میں ہی ہیں۔“
 دوسرے دو جوان نے ہمارے گردہ گھبراہٹ کرتے ہوئے
 پوچھا۔ اب مجھے خیال آیا کہ میں نے ماں ہی کا لفظ
 کہہ کر غلطی کی تھی، کیوں کہ نکاح نامہ تو ہمارے پاس نہیں
 تھا اور نہ ہی قاضی سے اس کا نکاح ہوا تھا۔ یہ
 میں نے میری بات کے دلائل سے قائل ہو کر ماں کا لفظ کہہ کر
 ایک دوسرے کو اپنے نفس کا ملک بنا دیا ہے اور ایک
 دوسرے کو قتل کر لیا ہے جس کا گواہ خدا ہے مگر انسان تو
 انسانوں کو گواہ مانتا ہے۔ میں نے گھبرا کر کہا۔
 ”نہیں ہمارے پاس اپنا نکاح نامہ تو نہیں ہے۔“
 ”دیکھا تمہاری شہری بالو خود ہی اپنے چال
 میں پھنسا گیا۔ چلو اب سیدھے سیدھے ہمارے ساتھ
 چلو اب تمہاری سزا دیا جائے گا فیصلہ ہمارا مارا کرے گا۔“
 لکھنئی ڈراما ہیر نے مجھے دھکا دیتے ہوئے کہا اور میری
 پٹلی سے رہا تو اس کی نال لگادی۔ دلوں جوڑاؤں نے مجھے
 بازوؤں سے کس کر پکڑ لیا تھا اور دھمکیاں کی طرف ہاتھ
 بڑھانے لگے تو میں نے ہڈیاں کرنا۔
 ”دیکھو میری بیوی کو ہاتھ مت لگاؤ۔“ پہلے
 اپنے سردار کے پاس لے چلو، پھر جو وہ فیصلہ کرے گا،

”اور ہاں گہری آج تم شراب بہت اچھی لائے تھے۔ ہرن کا گوشت کھانے کے بعد شراب نے نشہ دہا لایا کرو کھا ہے اور سونے پر کھائے تم اتنا اچھا اور مہر پر شایب بھی آئے۔“ آج تک تمہاری محنت اور وفا داری کا نہ صرف انعام و اکرام لے گا بلکہ میرے بعد حصہ بھی۔“ سردار نے مڑ کر فرمایا جسے میں کہہ رہا تھا۔ گہرو کا سینہ بال غافلانہ کرادری کی چڑا اور کیا تھا۔ ہائی تو جہان میں کرادری کی رخصتی کی طرف لے گئے اور اس کے سنے سے مجھے ایک موٹے رے کی عدد سے ہانہ دہ پایا۔ ہانہ سنے سے پہلے انھوں نے میری طاقتی بھی لی تھی۔ میرے پاس سے انھیں ایک بوٹے کے ساتھ چھین لیا تھا۔ وہاں اتنا چھوڑا کہ وہ ہنسنے لگے اور اسے دیکھ کر ایک طرف کو پھینک دیا۔ بعد ازاں یہ لوگ بیٹھ کر شراب نوشی کرنے لگے اور ہمو کے بیچریوں کی طرح کسان اور دیکھے گوشت کے انتظار پر بیٹھ رہے۔ ان سب کو ایک ایک لوہہ، ایک ایک صدی کی ماتنگ رہا تھا۔ مجھے اس درخت سے ہانہ کر کر حلی کے نزدیک ہو گئے تھے۔ شاید وہ ایسا ہی کرتے ہو۔ ڈاکر کھاری کے چٹے میں دسے کر اس کی بیچور اور بے بس سسکیاں کن کر لطف اندوز ہوتے ہوں گے۔ وہ اس خندوش لذت کی دیواروں سے لپک لگا کر شراب نوشی کر رہے تھے۔

”لے یار گہرو، تو زیادہ شراب پی لے۔ آج تو سب سے پہلے تیری باری ہے۔“ ایک تو جہان نے اپنے ساتھی گہرو کو دھمکے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”کیا وہ ہے؟“ آخر کھانا کھانے اور سردار تک پہنچانے کی محنت تو میں نے کی ہے۔“ گہرو نے سرداری میں جواب دیا تو اس کا سینہ فخر سے پھول گیا تھا۔

”اے یار..... کافی دیر ہو گئی ابھی تک ہرن کے ڈھکی ہو کر رونے کی آواز نہیں آئی۔“ دوسرے تو جہان نے کسی تشویش ناک لہجے میں اس طرف توجہ دلائی تھی۔

”ہاں سردار..... تو ٹھیک کہتا ہے۔ سردار نے شراب بھی کافی دیر پہلے پی لی تھی اور ہرن کا گوشت کھاتے ہوئے تو اسے اور دیر ہو چکی تھی۔ اب تو ڈاکر کھینے کا بھر پور موقع تھا۔“ گہرو نے جس لہجے میں اپنے ساتھی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اس کے ساتھ ہی انھیں ٹھکانے کی کوئی چیز ٹھونے کی آواز آئی تو ان کی جان میں جان آئی۔

”ہاں دوست ہرن پر حملہ اب شروع ہوا ہے۔“ سردار اپنے ڈھاکر کو آزاد کر کے جان بچانے کا بھر پور موقع دیتا ہے اور پھر کھلے جنگل میں شیر کی طرح گھات لگا کر بھائی ہرن کو دوپچتا ہے اور ڈھاکر کے اپنی ہوس کی آگ بجھاتا ہے۔“ گہرو نے تو جہان نے سردار کے ڈھاکر کرنے کی روداد کی قسم اسٹوری کی طرح سنائی، جیسے اس نے بھی سردار کے ڈھاکر کرنے کے مناظر خود اپنی آنکھ سے دیکھے ہوں۔

ٹھکانے کی کوئی چیز ٹھونے کے بعد مسلسل چیزوں کے ٹھونے کی آواز میں ٹھکانوں میں گھرنے لگیں۔ وہ سب کان لگا کر سنے رہے۔ یہ آواز دوسری راتوں سے مختلف تھیں۔ اس کے بعد کسی کے گڑگڑانے اور رونے چلانے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں جس نے ان شرابیوں اور بدعاشوں کا سارا نشہ ہرن کر دیا۔ چونکہ یہ آوازیں انسانی نہیں بلکہ روانہ تھیں۔ گہرو نے بعد کی ٹھکی حلق سے آوازیں آنے لگیں۔ جیسے کوئی منوں بوجھتے دے کر کہہ و دفعاں کر رہا ہو۔ ہرشالی کے ہوش و حواس چاہتے رہے۔ پھر قدموں کی آوازیں جو کسی کے ہاتھ پر پھٹتی ہیں۔ آگے لگیں تو خندوش لذت کے درد دیواریں لرز اٹھیں۔ ٹوٹی پھوٹی اور بوسیدہ کمرکیاں اور دروازے خود بخود بند ہوئے تو یہ سب ایک اور روح فرسا منظر دیکھ کر تمام کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ سب ہرشالی پٹپٹا اپنی جگہ پر دم بخود کھڑے تھے۔ ان کے پاؤں کن کن ٹھکی ہو گئے تھے۔ مگر کسی میں اتنی جرات اور ہمت نہیں تھی جو اندر جا کر حقیقت اعمال جان سکے۔ گہرو نے میرے چہرے پر نظریں جم کر دیکھا

تو وہاں اس کو سکون اور ایمان نظر آیا۔ کیوں کہ میں جان گیا تھا کہ ہیریکا نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ وہ اپنی جتنا بال طاقتوں کے بھر پور کام لے رہا ہے اور سردار کو سزا پکھاری ہے۔ بلکہ انہاں گناہ اور مجبور ہے اس لڑکیوں کا انتقام بھی لے رہی ہے جو اس ظالم، بے جا اندر جانے کی بہت کرنا اور جرات مندانہ قدم بڑھاتا، ان کا سردار ایک کفر کی کوڑ تو ڈھکان کے سامنے ان گرا تھا۔ گہرو اور اس کے ساتھیوں نے دیکھا کہ سردار کے ہر قدم پر کسی درد سے نچا چارو کے پتوں کے نشانات بہت گہرے ہیں اور ان سے فواری کی صورت میں خون بہہ رہا ہے۔ سردار کے دراز ہاں کو اس نے دروئی کے نچا گھس گھا کہ وہ اکثر اپنی جگہ چھوڑ دیتے تھے۔ جڑ سے ہراس زور کا گھوسلا مارا گیا تھا کہ سردار کا منہ اوپر سے اوپر پھر گیا تھا اور سامنے کے دانت بھی ٹوٹ گئے تھے۔ ان کے ہاتھوں اور بیدوں کی ہڈیوں کے ساتھ ساتھ ریزہ ریزہ کی ہڈی بھی ٹوٹ چکی کیوں کہ وہ کوشش کے باوجود بلی نہیں پار تھا۔ وہ پورا ناچار ہاتھ اور کاس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ کوئی میری رسیاں کھول رہا ہے۔ ایک لہجے میں، میں آواز دھونے لگا تھا۔ یہ حیران کنی جو عجیب حالت میں درخت کے چپے آ کر میری رسیاں کھولنے لگی تھی۔

”یہ تم نے بہت اچھا کیا جو ایسے غیث انسان کو بہت کرادری دیا۔ وہ نہ جب تک اس مرحلے سے گزرتا تو خود کو طاقت کا خدا ٹھہراتا اور سیدی سادی لڑکیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتا رہتا۔“ میں نے سرگوشی کے انداز میں ہیریکا سے کہا۔

”بھئی تو فرما کر ظاہری ظلم چلنا تو ابھی باقی ہے۔ تم نہ دیکھتے جاؤ۔ آج میں تمہیں ایک نیا تجربہ بھی کرائی ہوں تاکہ تم اس عمل سے بھی گزرا جاؤ اور مزید کندن بننے جاؤ۔“ ہیریکا نے بڑی جھنجھکی سے کہا تھا۔

”کیسا تجربہ؟“ ہیریکا..... میں تمہاری بات کا

مطلب نہیں سمجھا۔“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”اسلان آج میں تمہارے جسم میں داخل ہو کر چھپیں یا تجربہ کرنا چاہتی ہوں تاکہ تمہیں معلوم ہو سکے کہ جب کوئی جنس کی انسانی جسم میں داخل ہوتا ہے تو اسے کیسا محسوس ہوتا ہے اور اس کو اپنے اندر کسی بھی تبدیلیاں محسوس ہوتی ہیں اور اس میں ایک انسان کے مقابلے میں کتنی کتنا طاقت اور قوت بڑھ جاتی ہے۔“ ہیریکا نے خود کو میرے جسم میں داخل کرنے کے لیے تیار کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن ہیریکا کھیں ایسا کرنے سے میں۔“

”نہیں اسلان، تمہیں کسی قسم کی تکلیف محسوس نہیں ہوگی مگر یہ نیا تجربہ عجیب سا ضرور لگے گا اور تم اس عمل سے بہت کچھ سیکھو گے۔ اس طرح نہ صرف تمہاری جسمانی طاقت کی گتیں بڑھ جائے گی بلکہ وقتی قوت میں بھی بے پناہ اضافہ ہوتا محسوس کرو گے۔“ ہیریکا نے مجھے دلاسا دیا۔

”ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔ مجھے ہر قدم پر باب تمہارا ساتھ دینا ہے۔ تم میری شریک سفری نہیں بلکہ شریک زندگی بھی ہو۔“ تاؤ مجھے کھاتے رہا۔“ میں نے خود کو ایک طور پر تیار کیا تو تھا۔ دراصل ہیریکا چاہتی تھی کہ وہ میرے جسم میں داخل ہو کر میری جسمانی طاقت کو گت کرے کہ انھیں ان کے کبے کی سزا اور اور حرا پکھاؤ۔

میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ ہماری بحث و مباحثے میں ان شرابیوں کو بھانسنے کا موقع مل جاتا۔ کیوں کہ وہ بھتو چپے تھے کہ اندر جانے والی لڑکی کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ ورنہ آج سے پہلے ہی بڑی منہ زور اور ہاتھ چھوڑ لڑکیوں کو سردار کے چند منٹوں میں ڈال دیتی تھیں۔

”بس چند لمحوں کے لیے انھیں بند کرلو۔“ ہیریکا کے کہنے پر میں نے انھیں بند کی تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں صحرای خیز صوب میں آکر ہوا

ہوں۔ پھر مجھے گرم گرم لوہی کی قسم میں لگتی محسوس ہوئی
 اذرا کی تیز ہوا کے گرم ہونے کے لیے پورے جسم کو
 اپنی لپٹ میں لے لیا۔ رفتہ رفتہ یہ گرم ہوا میرے
 مساموں، ناک، آنکھوں اور منہ کے ذریعے جسم کے
 اندر داخل ہونے لگی۔ میرے پورے جسم میں ایک تسلی
 سی دروڑگی، ایک گرم پھر بھٹکا جسے اکوار میں اپنے آپ
 میں نہیں پا۔ جب فیمکا میرے جسم میں داخل ہوئی تو
 مجھے آنکھیں کھولنے لگا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا
 تو مجھے درودور دیک صاف نظر آ رہا تھا۔ اپنی دور جی میری
 دنیا کی غلط فہمیں کی، اور درودور میرا جسم آکھاس
 پر احتیاط جھیر کر ہوا گیا تھا۔ میں نے اپنے جسم پر
 ہاتھ پھر کر دیکھا تو اس کی پیت اور جسامت میں کوئی
 تبدیلی واقعی نہیں ہوئی تھی۔ میرا دل، دماغ، ذہن اور
 آنکھیں بغیر کسی تغیر و تبدل کے دیے کی دیے تھیں۔
 ہاں کر مجھے بار بار اپنے جسم کے اندر دیکھ کر احساس ہوا
 تھا ایسے جیسے کہ میں نے تیز دھوپ میں کسی لمبا اوڑھ
 رکھا ہو۔ بڑی عجب درخبر کمرائش تھی۔ جس سے نہ تو
 مجھے پیٹنے آ رہے تھے اور نہ ہی جی اور کھن محسوس ہو رہی
 تھی بلکہ اس کمرائش سے دل میں بھی گہرا ہمت نہیں تھا
 اب محسوس ہوا تھا جیسے میں سر میں ملے کون کے کون
 پیچے دھوپ میں بیٹھا ہوں اور دھوپ کی نرم نرم شعاعوں
 سے بدن بھینک رہا ہوں۔
 ”آؤ کچھ دبا، بھارتی باری ہے۔ سر ادرنے
 کیا کہا تھا کہ نہیں ایسا پھر شباب لانے پر نہ صرف
 انعام اور اکرام ملے گا بلکہ اس کے بعد اس میں سے صہ
 بھی۔“ میں نے کمرہ کے بائیں پاس کھینچ کر اسے یاد دلایا۔
 ”نہیں میں اندر نہیں جاؤں گا۔ وہ کوئی عام
 لڑکی نہیں ہے۔ مجھے پتا ہوتا تو میں اسے یہاں تک
 لانے کی زحمت ہی نہیں کرتا۔ اور ہاں تم کو بھی عام
 انسان نہیں ہو۔ بھلا تم خود بخود دیوں کی قد سے کیسے
 آزاد ہو گئے۔ مجھے تو کچھ بھی نہیں آ رہا۔“ کمرہ نے دو
 قدم پیچھے ہٹے ہوئے گہرا ہمت میں کہا۔
 ”کمرہ دبا تو نہیں پتا چاہئے گا۔ نہ جانے تم

لوگوں نے کتنی بے گناہ مڑکیوں کا کلوہ کیا ہو گا۔ اس
 کی سزا جیتنے کا وقت آیا ہے۔ تو مجھے پتہ میرے ہونے۔
 میں نے ایک زوردار طعنہ اس کے پیڑھے رخسار
 جھاتے ہوئے کہا۔ ملانے کی آواز اس قدر زوردار تھی
 کہ رات کے سناٹے کا سینہ چر کر درودور طاعون تک
 مچتی ہوئی۔
 ”دور نہیں ساتھ آگے بڑھو، ہم باہر ہے اور
 یہ آگیا۔ چلو اس پر ٹوٹ پڑو اور اس کی بیوی نے جو
 ہمارے سردار کی حالت بنائی ہے، اس کا انتقام بھی اس
 کے لئے لو۔“ کمرہ نے اس انخراہی کی فحرت کو لگا کر
 وہ ایک ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا
 جیسے میرے سامنے دوہا پانچ دھواش میں تھے بلکہ پانچ
 گیندیں بھی جن کو میں ہر بار ایک زوردار لگ کر تھا تھا
 اور وہ گولی کی بجائے دیوار سے جا گرائی تھیں۔ یہ میل
 اتنی بار بار ہوا گیا کہ سردار کی ران اس کی سب کی سب اڑاں اور
 پٹیاں ٹوٹ کر کرچیاں کرچیاں ہو گئی ہوں گی اور کچھ کا
 تیسرہ بدن بھی ہوا گیا۔ جب وہ اپنا ج اور تھکا ہو گئے تھے
 اس حالت کو پہنچ گئے کہ ٹھیک ہونے کے بعد بھی کسی
 عورت سے زیادہ کڑا تو درود کی بات ہے، سوچ بھی کسی
 نہیں سکتے تھے۔ وہ سب بے جان لاشوں کی طرح ایک
 دوپے سے درود در پڑے تھے اور کچھ کے تو اعصاب
 بکھرے ہوئے تھے۔ عجب بول ناگ اور دھشت ناگ
 منظر تھا جیسے میری زندگی میں پہلی بار مرنا ہوا تھا۔ آج میں
 نے اپنی آنکھوں سے فیمکا کا قصہ، انتقام اور خون کی
 گرمی دیکھی تھی۔ اور اس کی جانی طاعون کا بھی عمل کر
 چاہا تھا۔ اب تھا۔ اب وہاں دیو دیو گوروں سے زیادہ طاقت ور
 میں کمرہ دیو میں جن عورتوں پر بھی بھاری پکڑی تھی کہ
 فیمکا کوئی عام عورت نہیں تھی اس نے اپنی دنیا میں کمرہ
 بہت جگہ بننے کی کوشش کی ہوئی۔ جس طرح انسان اپنی
 حفاظت اور ناگہانی آفت اور مصیبت سے بچنے کے
 لیے جوڈو کرانے، بالنگ اور ہتھیار چلانے کا فن سیکھتا
 ہے، اسی طرح فیمکا نے بھی جنوں کے سردار سلطان
 سے اپنی جانی قوتوں کو داپس لینے کے لیے نجانے کیا

ہاتھ نہیں کی ہوں گی اور کیا کیا پانچیں بیٹے ہوں
 کے اور بھی کچھ مصیبتوں سے گزر کر وہ لندن میں ہو گئی۔
 ہر حال اس کی تمام تر کاوشیں اور محنت و دشقین بے کار
 ہو گئیں۔ اس کی انسانیت کی خدمت کرنے میں اس
 کی ادا کو جو وہ تھیں اور اسے رتبے اس کے معاون و
 مددگار بن گئے تھے۔
 ”اب یہ کام ہو گیا ہے۔ دشمن اپنے ٹیکر
 کو مار چکے ہیں۔ ہر ایک کو اس کے لیے کسی سزا
 کی ہے۔ کیا آپ تم میرے جسم کو آزار دو گے؟“ میں
 نے فیمکا سے پوچھا۔
 ”اپنی جلدی کیا ہے۔ مجھے اس قدر محفوظ پناہ
 کا وہی پتا ہے اور تم سے خالی کرنے کا کمرہ ہے ہو
 میں نہیں نکلتی۔“ فیمکا نے بچوں کی طرح خند کی
 میں نے سوچا کہ اگر میں ہوتا اور فیمکا آدم زاد اور
 میں اس کے جسم میں یعنی اپنی جگہ پر کے جسم میں حلول
 کر جاتا تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر ایک عجب سے
 لطف و سرور میں موش جانا اور محبت کے نشے سے سرور
 ہو جانا اور اس کے پر خوار و بدست کس سے سرشار
 میں نکل سکتا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ تو پھر میرے دل کے
 اندر سے آواز آئی۔ ”پھر تم فیمکا کو اس کے محبوب، اس
 کے شوہر کے جسم کی پناہ کاہ سے اس سے کھینچ کر اپنے
 والے سس سے، تو کون دماغ کو کھل کر دینے والے انسان
 کی خوشبو سے کیوں نکال دینا چاہتے ہو۔ میں لا جواب
 ہو کر خاموش ہو گیا۔
 ”کیا ناراض ہو گئے۔ چلو میں باہر آ جاتی
 ہوں۔“ فیمکا نے کسی انجانے خوف میں جھلا ہو کر کہا۔
 ”میں فضا ہونے والی کوئی بات نہیں ہے۔
 میں سوچ رہا تھا کہ تم باہر نہیں آئیں تو میں چائنا
 رستوران میں لکھا نا کس کے ساتھ کھاؤں گا اور اپنے
 سامنے کسی بھانجرا آنکھوں کی پیاس بجھاؤں گا۔“ میں
 نے بھانجرا کہا۔
 ”ٹھیک ہے میرے سر تاج، آپ کے
 سامنے آ رہی ہوں۔ آپ خود کوسنا لے رکھنا۔“ فیمکا
 نے میرے جسم کو آزار کرنے کا ارادہ کیا تو خود بخود میری
 آنکھیں بند ہونا شروع ہو گئیں۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا
 جیسے میرے جسم کی رگ رگ سے کوئی چیز پھینک کر ایک جگہ
 جمع کر رہا ہو اور پھر ایک زوردار ہتھکا جیسے کچلی کا کرفٹ
 لگا کر ایک جھٹکے سے پلوں محسوس ہوا جس نے
 مجھے ٹھک سے اٹھا کر زمین پر پھینک دیا ہے۔ میرا وزن
 منوں ہلکا ہوا تھا اور اس کا ریش کا بھی نہیں ہوا۔ مگر
 نہیں تھا جو فیمکا کے میرے جسم میں حلول کر جانے
 سے محسوس ہوئی تھی۔
 ”آؤ چلے۔“ فیمکا نے میری کمر میں
 ہاتھ ڈال کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔
 ”ہم اب کسی بھی جگہ نہیں جا سکتے بلکہ تم
 اپنی جادوئی قوت کے چارے رستوران لے چو گی تاکہ پھر
 اس قسم کی ناگہانی مصیبت نہ پڑ جائے۔“ میں نے
 فیمکا کو اور قریب کرتے ہوئے کہا۔
 ”میرے سر تاج، اس قسم کے معاملات کو
 مصیبت نہ کہیں۔ اس کے ذریعے تو قدرت ہم سے
 کزور اور بے سہارا لوگوں کی مدد کر رہی ہے اور
 خالوں اور جاہلوں کو ٹیکر کر دوا تک پہنچا رہی ہے۔
 ہو سکتا ہے اس طرح اس جگہوں سے قلم خود اور برکت
 کام کا دستان مٹ جائے۔“ فیمکا نے مجھے نصیحت کے
 اعجاز میں بھانجرا کی کوشش کی۔ میں نے اپنے سامنے
 چائنا رستوران کو دکھا تو سڑک پر چرک گیا۔
 ”کیا ہوا آپ رک کیوں گئے۔“ فیمکا نے
 بڑے ادب و احترام سے پوچھا۔ واقعی فیمکا نے مجھے اپنا
 شوہر دل دیا جان سے تسلیم کر لیا تھا۔ شاید فیمکا بھی
 شریف انفس مردوں کی طرح پاکیزہ اور صابر و عورت
 تھی۔ یہی اس نے سہاگ رات منانے کی طرف توجہ
 نہیں دی تھی اور نہ ہی اسکی بات سے متح کیا تھا کہ تو
 میں ہی چاہتا تھا کہ والدین کے سامنے باقاعدہ کھاؤ
 کسے ایجاب و قبول کے ساتھ کھاؤں گے سامنے
 فیمکا کو دل میں بنا کر کمرہ عری میں لے جاؤں اور پھر ہم

اپنے دلور دور کریں اور دل کے تمام ارمان پر کر لیں اور تمام حسرت نکال لیں۔ ہم میں سے کسی کو کون کی جلدی نہیں تھی۔ جب سے ہم نے ایک دوسرے کو دل سے اپنا بنالیا تھا تب سے ایک دوسرے سے ہمارے ہونے کا بھی خطرہ نہیں رہا تھا۔

”ہمیکا اس لباس میں تو واقعی گاؤں کی سب سے حسین ذیل اور میر پرور جو بن والی لڑکی لگتی ہو۔“

جی چاہتا ہے تمہیں سامنے بٹھا کر کئی دنوں تک سنا رہوں۔ مگر کھرا اس ہوئی میں، میں تمہیں اس دیہاتی لباس میں نہیں لے کے پاسکے۔ لوگ نہیں عیب و خرابی نظروں سے دیکھیں گے تو مجھے سالگے گا۔“ میں نے تعریف کر کے اس کو خوش کر دیا اور پھر لباس تبدیل کرنے کا تقاضا کیا تھا۔ یوں اس ذرا بھی برا لگتا تھا۔

”چند لمحوں کے لیے رخصت کی اجازت چاہتی ہوں۔“ کہتے ہی ہمیکا میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد وہ اپنی آئی تو وہ بالکل سادی ہو گئی۔ چھوڑ کر میں ملیں تھی۔ حسن و شباب و جو بن کسی لباس کا کھنکھان نہیں ہوتا۔ ہمیکا کا بھرپور شباب اس سادہ سے لباس میں بھی پرکشش تھا۔ اس کے انکسار کے مستی چمک رہی تھی۔ میں نے غماز کیا سوچ کر کرباب مسکرایا اور اس کے ساتھ جانا رستوران کی طرف گامزن ہو گیا۔ چند قدم چلتے کہ بعد ہمیکا نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تھا کہ وہ اپنی جتنی جتنی سے اڑا اشارہ سے منع کر دیا۔

”بہت زور کی بھوک لگی ہے اور دم در کر رہے ہو؟ کیوں؟“ ہمیکا نے اپنے پیٹ پر ہاتھ میسرے ہوئے کہا اور وہ نہ بوری نہ لگی۔

”میں چاہتا ہوں اس چاندنی رات میں تمہارے ساتھ چلنا کا حزمہ بھی لوں۔ دیکھو تاہم کیت و کلپان، تمام درخت، شاخ اور پتے تک چاندنی میں نہا رہے ہیں۔ ہر طرف چاندنی کھل کر پھیل رہی ہے۔ اور

میں کڑی سے بھڑکی کا لطف نہ رہی تھی۔

”ہمیکا، جس میں بہت زور کی بھوک لگی تھی چلو رستوران چلتے ہیں۔“ میں نے ہمیکا کی بھوک کو دیکھتے ہوئے اسے یاد دلایا۔ اس نے میری بات کو اپنی ہی کر دی یا پھر وہ اپنی اس میری بات کو اپنی ہی سمجھ گئی۔

”ارسلان،“ کہنے لگا اس نے ہانے اور دل فریب موسم نے انسان تو انسان آسانی خلق چاند کر لیا اپنے سر میں جھلا کر دیا ہے۔ زمین میں جس قدر کشش ہوئی ہے وہ اپنی کشش سے آسانی خلق کو بھی اپنی طرف کھینچ لاتی ہے۔ دیکھو تو سب جاع بھی آسمان سے زمین پر راز آئے اور اس عیاں میں نہا کر کس قدر فرحت اور تازگی محسوس کر رہا ہے۔ یہ کروڑوں کی بڑی اس باب کا عجوت ہے کہ چاند اس کروڑوں کی بڑی سے کڑی عیاں میں اتر آئے۔“ ہمیکا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کا نرم دانا دک اور گداز ہم اپنے قریب تر کر لیا۔ نہ صرف قریب تر کر لیا بلکہ اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر لیا۔ جس قدر جاں فزا لے تھے۔ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ چاندنی رات کا سماں، دل فریب موسم، سہانے منظر، ٹھنڈی ٹھنڈی سانسوں میں فرحت سے بھری ہوا، خوش اور گداز اور پھر ایک جوان پر شباب جسم کی قربت نے مجھے مدھوش کر دیا تھا۔ میں دھبہ جتان بارے تنگ سا ہو گیا تھا۔ اس موسم میں ہمیکا کا حسن و آئندہ ہوا تھا۔ اس کے بدن سے بدست کرنے والی ہنک اڑ رہی تھی۔ وہ سب دیکھ کر جو میں نے پہلی بار دیکھی تھی اس کی دکان میں محسوس کی تھی۔ میری سرس میں اتنی قربت جاتی تھی۔ سو نے پر سہا کر کہوں یا نہیں پر دہلا کر ہمیکا کے ایک ادا نے بے نیاز سے ہاتھ اڑھایا اور اپنی نرم و تازک انگلیوں کی مدد سے اپنے ریشمی، مخماری اور سیاہ گٹھائوں جیسی زلفوں کو کھول دیا۔ زلفوں کا کھلتا کھڑا کبھی جیسی خوشبوئیں سے مائل منظر ہو گیا۔ میں نہ صرف ہمیکا کی ریشمی زلفوں میں پیار سے انگلیاں پھیرنے لگا ہوں گے

کھینچنے لگی رہا تھا۔ اور اپنا چہرہ ان میں چسما کر وہ مجھ کی خوشبو سونگنے لگی۔ یہ جب تک مجھ سے ہٹا لے گی، میرے قدم ڈھنگے نہ لگے۔ میرے جذبات بھر رہے تھے۔ میں اپنے آپ کو بکا پوائے میں کا کام ہوتا تھا۔

”دیکھو بالے، اگر تم نے مجھے چھوئے گی تو کوشش کی تو میں اس عیاں میں کو کر جان دے دوں گی۔“ اگر یہ نوسانی آواز میرے کان میں نہ آتی تو میں اپنے آپ سے کیا ہوا بعد خود ہی تو ڈرتا۔ اس دن کا انتظار رکھ لیا ہوا تھا۔ میں جس عیاں کا اپنے والدین کے سامنے اپنانے کے بعد اور ان پر کرنے کا کر رہا تھا۔ شاید اس حرکت سے میں اس کی نظروں میں گر جاتا۔

”چھو، دیکھو میری بات غور سے سنو، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں اب یہ روکتی نہیں کروں گا۔“ مرزا آواز پر ہم جو گئے تھے۔ یہ آواز کباب میں بڑی ثابت ہوئی تھی۔ اس آواز نے ہمیں عیش و نشاط کے لمحوں سے باہر نکال دیا تھا۔ یہ آواز ہمارے لیے اذیت وہ ثابت ہوئی تھی۔ مگر ہمارے زندگی کا مقصد بھی تھا کہ بے حس اور کر زور انسانوں کی مدد کی جائے۔ مظلوموں کو خالوں کے چنگل سے نجات دلائی جائے اور ان کے جو رستم سے دور رکھا جائے۔

”میں بالے تم نے اپنا اختیار کھو دیا ہے۔ میں نے تم کو ٹھٹ کر چاہا۔ تم جو عیت کی تم پر اعتبار کیا کر تم نے میرے اعتماد کو ٹھٹس پہنچائی۔“ نوسانی آواز کی بات سن کر میں نے اور ہمیکا نے خود کو شہلا اور اس طرف قدم بڑھا دیے جس طرف سے آواز آ رہی تھی۔ ہم نے اپنے آپ کو ایک رخصت کی آڑ میں کر لیا۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو عیاں کے بیچ میں ایک نوجوان دو شیزہ کڑی تھی جس کا آدھا جسم ناف تک پانی میں ڈوبا ہوا تھا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے غور کیا تو محسوس ہوا کہ اس کی ٹیٹھ کا کربان چاک ہو کر پتے تک آیا ہوا ہے۔ کسی کی وجہ سے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے سینے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ (جاری ہے)

قوس قزح

قارئین کے لیے منتخب شدہ اشعار

خوابوں سے ہواؤں سے نہیں لٹے کچھ لوگ
موسم کی اداؤں سے نہیں لٹے کچھ لوگ
مل جائیں تو جینوں کو سچا دیتے ہیں جین
کھوجائیں تو دعاؤں سے نہیں لٹے کچھ لوگ
(شرف الدین جیلانیؒ، شہزاد الیاء)

دلفاں کے بدلے جتنا دیتے ہیں
نہ کردہ گناہوں کی سزا دیتے ہیں
ہم لٹے ہیں جنہیں خلوص سے اکثر
وہی لوگ ہمیں دعا دیتے ہیں
(شبیر احمد پرازد، جٹوالوالہ)

لیڈر غم افلاں میں جو بیٹا ہے
سرایہ پستی کا کفن بیٹا ہے
شاہی عینے میں سکائے مردور
اک رات میں جتنے کی یہ سے چٹا ہے
(امین امتیاز احمد، کراچی)

اگر تلاش کرو گے تو ملن ہو جائے گا
مگر کون جھیں میری طرح چاہے گا
تمہارے ساتھ یہ موسم گلابیں بیٹھا ہے احسان
تمہارے بعد یہ موسم بہت ملائے گا
(احسان بحرؒ، زاوے شیالوالہ-سیالوالہ)

اب تو اپنی طبیعت بھی جدا لگتی ہے
ساکس لگی ہوں تو رشتوں کو ہوا لگتی ہے
(انتخابؒ، چنچری، بریوالہ)

درد ہے دل میں پر اس کا احساس نہیں ہوتا
روتا ہے دل جب وہ میرے پاس نہیں ہوتا
برباد ہو گئے ہم ان کے پیار میں
اور وہ کہتے ہیں اس طرح پیار نہیں ہوتا
(انتخابؒ، چنچری، بریوالہ)

قلم میں وہ طاقت نہیں جو دل کا درد دکھ سکے
زبان میں وہ پرداز نہیں جو اڑ کر تم سے مل سکے

میں اس پر مرنے ہوں اس کو دے دو یہ کون
کیسے کہوں اسے وہ دقا وہ کچھ تو نہیں
(ہارانیؒ، بریوالہ)

موت ہانگوں تو زنگی تھا ہوتی
زہر لوں تو وہ بھی دوا ہو جاتی
اب تو ہی بتا کر میں کیا کروں لڑکی
جس کو چاہتا ہوں وہ ہے، دقا ہو جاتی
(غلام نبی نورؒ، گھنڈیاں خاں)

ابھی کس ہونے دوں وہیں خود کو دے دل میرا
تمہارے لئے ہی رکھا ہے لے جاناں جوں ہو کر
نہ کس ہوں نہ نااہل ہوں محبت کو بھگتا ہوں
تمہارا کیا محروم ہے مگر جاؤ جاناں ہو کر
(دانا نظر اقبالؒ، جٹوالوالہ)

اس طرح توڑا ہے تم نے دل میرا
کوئی صدا بھی نہ کر سکا میں بھی
بعد تیرے نہ اٹھیں یہ کمرہ میں بھی
کوئی دعا بھی نہ کر سکا میں بھی
(منیر احمد ساغرؒ، سیال چٹوں)

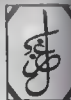
مسلل دل لگنے سے دھواں ہوتا تو کیا ہوتا
جو سوئے غمؒ، جاوداں ہوتا تو کیا ہوتا
غیمت ہے اگر انھوں نے رداں سے لٹکنا خون بہا ہوتا
غم الفت اگر دل میں نہاں ہوتا تو کیا ہوتا
(محمد نعیم علیؒ، سیال چٹوں)

ایسے لوگوں سے بھی تم لٹے رہے دل کھول کر
جو دقا کے نام پر سواگر کی کرتے رہے
(محمد اسحاق نجمؒ، سواگر پور)

کیوں چپکے سے وہ لوگ اتر جاتے ہیں دل میں
جن لوگوں سے قسمت کے ستارے نہیں لٹتا
(عمر دوازؒ، گھنڈیاں خاں)

اے شمع مجھے چمکوک دے
میں نہ میں رہوں تو نہ تو رہے
میری محنت کا
میری حسن کو ہے منظور
(مس فوریہ کنولؒ، کھنچن پور)

ٹوٹ جاتے نہ کہیں ترک محبت کی تم
تیرے قدموں کے نشانوں سے بہت دور چلے
(محمد عمرانؒ، کوشک کلاں، کھنچن پور)



آنکھوں سے میری کون میرے خواب لے گیا
چشم صدف سے گوہر نایاب لے گیا
اس شہر میں خوش بھائی کو کس کی لگی ہے آہ
کسی دل زدہ کا گریہ خوشاب لے گیا
کچھ خدا کے فیض سے ساحل بھی دور تھا
کچھ قصوں کے پھیر میں گرداب لے گیا
ہاں شہر بھی دوسرے ہیں یہاں بحث کر انہیں
غم لے گیا ہے یا غم غراب لے گیا
کچھ کوئی کوئی آنکھیں بھی موجوں کے ساتھ تھیں
شاہد انہیں بجا ہے کوئی خواب لے گیا
فرطان ابد ہاں ہاں میں سب گنت کھو گئے
ہو جاتا ہوا کا اچھ سے مضرب لے گیا
فیروز کی دشمنی نے نہ مارا مگر ہمیں
ایوں کے افقات کا ڈیراب لے گیا
اے آنکھ و آدب تو خواب کی دنیا سے لوٹ آ
مڑکھن تو کھول، شہر کو سیلاب لے گیا
(پریہ شریزار و کلاہر گیلانیؒ، کراچی)

منصف وقت کی تحریر بدل جاتی ہے
دیکھ آجائے تو تقریر بدل جاتی ہے
کوئی لیتا ہوں جب پھول سا چہرہ اس کا
”زینت ہجر کی تفسیر بدل جاتی ہے“
ہاتھ پہ ہاتھ دھرے رہنے سے کیا ہوتا ہے
دل میں جذبہ ہو تو تقدیر بدل جاتی ہے
کوئی ہوتی نہیں خفیف سزا میں میری
”فرق اٹاتا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے“
اس لئے دور سے کرتا ہوں میں دیار اس کا
پاس جاتا ہوں تو تصویر بدل جاتی ہے
بہار رکھوں بھی تو ہر خواب کا منہر کیسے
آنکھ کھلتی ہے تو تصویر بدل جاتی ہے
(عظیم خان عیسٰیؒ، کال پرموٹی)

عکس سارے آنکھوں میں بٹ گئے
خواب میرے کچھوں میں بٹ گئے
جو بنائے میں نے خوابوں کے محل
اس کے صے دوستوں میں بٹ گئے
حق کا رست چھوڑ کر پایا ہے کیا؟
دور سارے ظلموں میں بٹ گئے
ہو گئے بے مول جو اصول تھے
اپنی پٹنی قیصوں میں بٹ گئے
زر کے پتے بھاگتے سے کیا ہوا؟
جہنم کھویا آپٹوں میں بٹ گئے
ذمہ داری کس ہے چاہت کے لئے
لوگ کیسے نفروں میں بٹ گئے
دہر میں غلام خدا ہی آسرا
میرے اپنے دشمنوں میں بٹ گئے
(فرید خانؒ، لاہور)

چاہتوں کے گھر میں میرا کوئی بھوا نہیں
فرما لے کر جاؤں کہاں کوئی سنتا نہیں
خود غرض ہیں لوگ بیکار ہے ان سے دوستی
تیری پاکیوں تلے دھپ کوئی جلا نہیں
ملوں میں کس سے تیرے شہر میں اے ہمیں
دستور ہے اٹکنا چھڑے کھر کوئی ملتا نہیں
بستی تو بھی لڑنے کا سامان کچھ بھلا ہے
پھر خوشی کا لہو عمر بھر کوئی رہتا نہیں
(محمد علی باباؒ، فیصل آباد)

راستے کا غبار ہیں آنسو
اون پروردگار ہیں آنسو
سمجھوں میں جو زینت و زینت ہے
ان کی وجہ قرار ہیں آنسو
صدمت صدمت پہ کوئی حرف کیوں نہ آئے
آنکھ کا کاروبار ہیں آنسو
ان کی تقدیر کتنی اڑاں ہے
خاموشی کا فرار ہیں آنسو

مکرائیں تو لوٹ لیتے ہیں
کیسے خیر بے کار ہیں آسو
یہ خیر نظر کا غزن ہیں
آئینے کا وقار ہیں آسو
غلاب کا عکس تو نہیں دیکھا
کیا کیا؟ سایہ دار ہیں آسو
ان کا قمر ویدہ دل پہ
شہر کے راز دار ہیں آسو
(چندری تیرجہاں علی پوری.....ملتان)

یارب میں تیری پارگاہ میں فریاد کرتا ہوں
تجھ کو ہر وقت ہر گمراہی میں یاد کرتا ہوں
آزاد میری بے پوئی کردے اے میرے رب
ساری عمر ماؤں کا احسان میں تیرا
ماؤں کو اٹھ اٹھ کر دوتا رہا ہوں میں
دامن کو انکس سے اپنے بھگتا رہا ہوں میں
خود کہا تو نے کہ مانگو مجھ سے تو دوں گا
میں ہوں تیرا رب عطا کروں گا ہر چیز تجھ کو
اے رب پورا کروے اپنے محبوب کا فریاد
کروے تو میری اپنی قدرت سے ہر مشکل آسان
(شرف الدین جیلانی.....ٹنڈوالہار)

زینت پہ چل نہ سکا آسمان سے بھی گیا
کسے جو پہ تو پردہ اڑان سے بھی گیا
بھلا دیا تو بھلانے کی انتہا کردی
اب وہی فضل میرے وہم دگمان سے بھی گیا
کس کے ہاتھ سے نکلا ہوا وہ تیر ہوں میں
ہدف کو چھو نہ سکا اور کمان سے بھی گیا
تباہ کر گئی مجھے کچے گھر کی خواہش
میں اپنے گاؤں کے کچے مکان سے بھی گیا
پہاڑی آگ میں کودا تو کیا مانجھ کو؟
اے پاجن نہ سکا اور اپنی جان سے بھی گیا
(انتخاب نامہ انیس سال.....سوات چورس)

دعائی میں زعمی کی ادا نہیں لیتی
مفت میں کسی کی دعا نہیں لیتی
تم لاکھ آزمائے رہو لوگوں کو
کس سے دل نہیں ملتا تو کسی سے طبیعت نہیں لیتی
مجھے مغرور مت سمجھو دنیا والا!
ایک بس اس کی یاد سے مجھے فرقت نہیں لیتی
بات صرف محبت کی ہے اے دوست
کسی کو ملتی ہے بے حد تو کسی کو نفرت بھی نہیں لیتی
یوں تو ملتی ہے ہر چیز دنیا کے بازار میں
نہیں ملتی اگر کچھ تو وفا نہیں لیتی
(انتخاب بیفتی رضا.....میان چوں)

رخسار ایسے ٹٹھلتے ہیں جناب کے
پہنے ہوں جیسے 'چاند' نے گہرے غلاب کے
گھسا ہے تیرا نام بھی 'چاند' کے خواب سے
آؤ دوق وکھاؤں میں دل کی کتاب کے
اتنی پلا دے کہ تیری ہر کے روئیں ہم
فصل ہماری آکھ سے آسو شراب کے
اترا وہ اس طرح سمندر کی گود میں
بتے بھرتے تھے سوکے پہلو میں آپ کے
ویدار یار کھیتے ہو آج کل
ہرے میں چاند سے چہرے پہ کالے غلاب کے
لے کے رات بھر بھی نہیں ملا احسان
سورج بتا گیا یہ دھوکے تھے خواب کے
(احسان.....میاوولی)

تیرے شیش محل میں ٹھکانے ہی کسی
میری کنیا میں بھی چراغ جلتے ہیں
تو لیتا ہے سانس فافس کی فضا میں
میرے انگڑوں پہ خواب چلتے ہیں
میرا لباس میری پیکان ہے
میرے لبوں میں صداقت وٹن کی
میں پٹا ہوں رھتی کی ماؤں کا
(انتخاب نامہ انیس سال.....سوات چورس)

میری شہادت ہے عبادت وٹن کی
میرے شہر میرے وٹن کا اہل ہیں
میری غزلوں میں ہے پیغام وٹن کا
میرے خیال شیطا اگلے رہیں گے
میری نغموں میں ہے نام وٹن کا
میرے دیکھاں میں ہے سوتا اگائیں گے
پتھر ہم ہیں فولاد جن کے
قرض ہے وٹن کا ان کے کندھوں پہ
اس مٹی میں وٹن ہیں اجہاد جن کے
میرے جسم پہ ہے ودی وٹن کی امانت
میں وٹن کی خاطر جان بھی لوٹا دوں گا
میرا خون بھی کہے گا لا الہ الا اللہ
میں کلہ کافر کو بھی پڑھا دوں گا
بھینوں کے کھیل گے پھول یہاں پہ
لبوں کو لے کی رہبری جن سے
افق سے اونچے ہوں گے پرچم
حوصلوں کو لے کی پیگیری جن سے
(نامعلوم.....)

جب یاد آتی ہے مسکرا لیتے ہیں
کچھ ہل ہر فم بھلا دیتے ہیں
کیسے بیک سکتی ہیں آکھیں آپ کی
آپ کے سے کے آسو بھر ہالیتے ہیں
سرخ ہونٹوں پر جو تل نظر آتا ہے
حم سے وہ جان سا جاتا ہے
ان کی آنکھوں کی مستی میں کھویا جو
وہ آدمی کہاں اٹھ پاتا ہے
ان کی زلفوں کے سامنے تلے جو بیٹھ گیا
وہ آدمی کہاں اٹھ پاتا ہے
خود نوری آج تک ہنسا ہے اس جنجال میں
جو بھی اسے دیکھے اسے وہی ہر طرف نظر آتا ہے
(ظلام نامہ نوری.....کٹھنا خاص)

کوئی چھو جائے جب ہم سے تو ہم ٹھوکہ نہیں کرتے
میری عقل میں کسی کو ہم رسوا نہیں کرتے
جس راستے پہ ہوں ہزاروں قدموں کے نشان
اس راستے سے اسے ولایت ہم بھی کرا نہیں کرتے
محبت کی مسافت میں جو ساتھ چھوڑ دے اپنا
مطر کے اس فضل کو ہم بھی دیکھا نہیں کرتے
ہر دکہ محبت کا خوشی سے بھیل لیتے ہیں ساغر
قرض ہے وٹن کا ان کے کندھوں پہ
اس مٹی میں وٹن ہیں اجہاد جن کے
میرے جسم پہ ہے ودی وٹن کی امانت
میں وٹن کی خاطر جان بھی لوٹا دوں گا
میرا خون بھی کہے گا لا الہ الا اللہ
میں کلہ کافر کو بھی پڑھا دوں گا
بھینوں کے کھیل گے پھول یہاں پہ
لبوں کو لے کی رہبری جن سے
افق سے اونچے ہوں گے پرچم
حوصلوں کو لے کی پیگیری جن سے
(نامعلوم.....)

نہ جانے کن خیالوں میں کون سے تھے تم بھی ہم بھی
محبت اک دو بے سے چڑھتی کرتے تھے تم بھی ہم بھی
ملنے تھے تو کون سے رہتے تھے محبت کی باتوں میں
چھڑتے تھے جب تو اداس رہتے تھے تم بھی ہم بھی
نئے سنتے تھے محبت کے اور شہر لکھتے تھے
غلاب لا لاکر کیا ہوں میں رکھتے تھے تم بھی ہم بھی
کچھ بے خودی بھی طبیعت میں یا عمر ہی ایسی تھی
چاہت میں سرشاری میں جانے کیا کچھ سہتے تھے تم بھی ہم بھی
باتیں بھی کرتے تھے بھر ساتھ رہنے کی
اور جدائی کے خیال سے بھی ڈرتے تھے تم بھی ہم بھی
رکاوٹیں تو بہت میں مگر زمانے سے بے پرواہ ہو کر
اکڑ لیک دھڑلے لے لے کر نکل پڑتے تھے تم بھی ہم بھی
سمجھ میں ہی نہیں آتی تھیں باتیں تفریق و تقسیم کی
دل کی کہتے تھے اور دل کی سنتے تھے تم بھی ہم بھی
بہت اداں ہیں تم جن ہو سکے تو دل لویک ہار
آج بھری دیکھتا ہوں جو بھی لکھتے تھے تم بھی ہم بھی
(دیشان اقبال علی۔کراچی)
☆☆

تم جہاں پر بیٹھ کر جاتے ہو اک بات ہے اس میں فریادی کی
 رگوں میں ہے دور تیرا تم جس چیز کو اتھ لگاتے ہو محبت میں کچھ کچھ غریب سا ہے
 خوشبو میں ہے سرد تیرا میں دہاں بٹھا رہتا ہوں (محمد احسان غنیمت گل پور)

گوئی ہوا بے سفر
 (انتخاب کا مہر) (خیریت)
 ☆☆

کوئی ہوا یا ہمسفر

رقص موت

ایم ایلاس

مکمل ناول

رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی ہوا کے دلخراش اور دلدوز چیخ جب سنائی دی تو جاگتے لوگوں پر اچانک دھشت طاری ہو گئی۔ لوگ سہم کر کپکپانے لگے کہ اس کے بعد پھر اچانک لہولہاں منظر نظر آیا۔

تلفظ..... سطر سطر دل و دماغ کو بہوت کرتی..... ڈراؤنی اور تجرہ نگیز کہانی

گوپی نے بارہ برس کی عمر میں قدم رکھ دیا تھا۔ جب وہ پیدا ہوا تھا باپ نے اس کا نام گوپال رکھا تھا۔ جب وہ ایک برس کا ہوا تو اس کی ماں نے اسے گوپی کہہ کر پکارنا شروع کیا۔ کیوں کہ گوپی سری نکا کا بہت بڑا اور مقبول گویا تھا۔ ماں باپ کے علاوہ کسی سے گوپی کہہ کر بلا تے تھے۔ اب جب کہ وہ بارہ برس کا تھا لیکن عمر کے لحاظ سے تو دس برس کا دکھائی دیتا تھا۔ وہ جس دنیا میں رہتا تھا وہ بھی اس کے قد کی طرح چھوٹی تھی۔ اس کی دودنیا میں تھیں۔ اس کی ایک دنیا تو وہ چوکروں پر مشتمل تھی جو چھ منزل عمارت کی پانچویں منزل پر واقع تھی۔ وہ کمرے گرمیوں میں بھی کی طرح دھکتے تھے اور ترک معلوم ہوتے تھے اور جب سردیاں آتی تو وہ کمرے ڈیپ فریژ کی مانند بن کر رہتے تھے۔ وہ مردنک ہوتا تھا۔ اس دنیا میں وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کی ماں اور چاچی بھی تھے۔ اس کے چند دوست تھے جو اس کی عمر کے تھے۔ اس نے ہم عمر دوستوں سے ہی دوستی بھی کی تھی۔ جن کے ساتھ نہ صرف وہ اسکول جایا کرتا تھا بلکہ سرک، میدان اور ایک قریبی پارک میں کرکٹ یا فٹ بال کھیلا کرتا تھا۔ لیکن اس کی دوسری دنیا نہایت وسیع تھی۔ تلاکی

باندھ لاکھو۔۔۔۔۔ وہاں پر ہر کام کیا جاسکتا تھا۔ کوئی شخص نہیں بھی جاسکتا تھا۔ اپنی مرضی اور خوشی سے۔ نہایت آزادی تھی۔ جس کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ کوئی روکنے ٹھکنے والا نہیں تھا۔ کوئی دیوار نہیں کی۔ کوئی پتھر نہیں۔ اس دنیا میں جانے کا راستہ بھی نہایت آسان تھا۔ اس دنیا میں جانے کے لئے ایک بل بھی نہیں لگا تھا۔ بس آگئیں بند کرنے کی دیر کہ وہ اس لاکھو دنیا میں پہنچ جاتا۔۔۔۔۔ وہ تصوراتی دنیا تھی۔ جس کا وہ حکمران تھا۔ ایک فلی ہیرو کی طرح۔۔۔۔۔ اسے یہ دنیا بہت پسند کی۔ سونے لے بی دنیا تھی کہ گوشہ تلاش کرتا اور آگئیں بند کر کے صرف ایک ہی جہت میں اس دنیا میں پہنچ کر کھو جاتا اس کا دل واپسی کو نہیں کرتا تھا۔

لیکن وہ اس دنیا کے بارے میں کسی کو بتاتا نہیں تھا۔ اس کی ماں اور چاچی اسے بارہا کہتے تھے کہ اب وہ بڑا ہو گیا ہے۔ بچپن رہا ہے نہ تو اسے بچپن جیسی باتیں کرنی چاہئیں اور نہ سننے دینے۔ اگر وہ کسی فکری سے کسی بات پر اس دنیا کی کوئی بات کہہ بیٹھتا تو اس کی نہ صرف رشک ہو جاتی بلکہ بری طرح ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کر دیا جاتا۔ اس کے چاچی بہت شے والے تھے۔ پچھلے کچھ عرصے سے اس کے چاچی نے اس کی پلائی شروٹ

کر دی تھی۔ اس کی اس ہی تھی کہ وہ بیٹھ جھٹھٹھ قلمیں دو کی کہ
ایسا کرتا ہے۔ ہاں باپ اس کی کج بچاگت کا یقین کن کہ نہیں
کو تیار ہی نہیں ہوتے تھے۔ انہوں نے اس کی قلمیں
دیکھنے پر باندی لگا دی تھی قلمیں دو بیٹھے سے یہ قلم ہوا
تھا اس کے ہنوں کی دنیا اور دماغ، سہانی اور نین کو ہوائی
تھی۔ اس کے دل میں بچائی کی پائی کا ایسا زور اور خوف
بیٹھ گیا تھا اب وہ بڑا ہتھلا ہو گیا تھا اور کبھی بھی بڑے کے
سامنے ہنوں کی دنیا کی کوئی بات نہیں کرتا تھا۔
پھر ایک دن اس کی زندگی میں وہ بات آئی جس
کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور نہ ہی پنے میں
ایسا نظر آ سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

جولائی کا مہینہ بڑا اظہارِ مسافک اور بڑا مہینہ تھا۔ ہر
سرت آگ بکس رہی تھی۔ اس نے بستر پر سونے کی بہت
کوشش کی۔ محسوس کر دیش بڑا رات۔ ہر طرح کی جھڑپ
اور کوشش کی لیکن سونے میں کامیاب نہ ہو سکی اور یوں
دن بھر کی قزاق سے جتنی دیر میں صبح ہو چھٹا راسی
تھیں۔ رات کے وقت بھی کرنا تھا رہا ہوا تھا۔ گولی کو ایسا
محسوس ہوا کہ اگر وہ جھڑپ دیر اس کرے میں رک گیا تو
اس کے سامنے بدن میں آبلے پڑ جائیں گے۔ وہ دیکھا تھا
کرکڑی کے ذور سے آگ سے بچنا ڈال دی کرکڑی پر گیا۔
وہ بڑا بیزپر ہو کر بھی فضا میں کودتا تھا اس حرکت پر
اسے اپنی کا کوئی خوف نہیں تھا۔ کیوں کر بچائی گھر
موجود نہیں تھے۔ وہ رات کی شفت میں کام نہ کرے
ہوئے تھے۔

آگ سے بچاؤ ڈال بچائی بیزپر ہو بے کنی
ہوئی تھی۔ وہ رات کے عقب میں کوڑیوں کے ساتھ
ساتھ لوہا پھرت تک چلی گئی تھی۔
ہر منزل پر کرکڑی کے ساتھ ملا ہوا آبی پلیٹ
قائم تھا کہ آگ لگے کی صورت میں فحارمت کی سہولت
کرکڑی کے ذور سے اس چوڑے پر چڑھ کر بیزپر کیوں
جائے دیکھتے۔ ہر گھر پر انگرانی میں بچا سکیں۔
اس کا مایاب ہو جاتا۔ وہ دیکھ کر تک چوڑے پر کسسا تا
رہا اور پھر اس پر فحوی غاری ہو گئی۔ اس کی میں گہری۔

خندہ آنے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ بس فحوی ہی غاری
ہو گئی تھی۔
رات کو نہ جانے کس وقت اس کی آنکھ کھلی۔
اسے آنکھوں کے پتوں پر روشنی کی بچھن محسوس ہوئی
تھی۔ جس کی وجہ سے اس کا دھوش ذہن چونک کر بیدار
ہو گیا تھا۔ پہلو تو وہ بچھا کر ہو گئی۔ اتنی جلدی۔؟
ہو گیا وہ چہرے پہلے ہی تو سویا تھا اس نے آنکھیں کھلی
کر لہو پر دیکھا تو آسمان تاریک تھا۔ کین کین کین ٹھٹھا
رہے تھے۔ اس نے گردن کھما کر چھٹی منزل کی طرف
دیکھا۔ سردی کی وہ بکلا واصل اس کرکڑی سے پھوٹ رہی
تھی۔ کوڑی پر پردے سمجھے ہوئے تھے۔ لیکن نیچے ایک
دور چوڑی گئی۔ اسے بند کرے میں ایک بلیس دھن تھا جس
کی روشنی اس دور سے گزرتی ہوئی اس کی آنکھوں پر پڑ
رہی تھی۔ اس کا چہرہ کرکڑی کی چونک سے ستواہی تھا اور
چونک سے بالکل خراب تھا۔ گولی نے ڈراما کھسک کر
اس دور سے آنکھیں لگا دیں۔ ذور فاری کر کے کا اندوہی
منظر روشن ہو گیا۔

گولی کو کسی بھی تانک جھانک کر یوں کو دیکھنے کا شوق
نہیں رہا تھا۔ نہ ہی وہ چھپ کر ان کی حرکات و سکنات کو
دیکھتا تھا۔ لیکن ان دونوں کے غیر معمولی طرز عمل نے اس
کے جذبہ تجسس کو بیدار کر دیا۔ اس کے دل میں ایک
شقیان سا بونے لگا۔ اس لئے کہ ان کی حرکتیں ناقابلِ فہم
تھیں۔ مگر ایک کرسی پر بیٹھا کسی ہر سر کے سر ہوا تھا۔
اس نے اپنے ہاتھ اپنی آنکھوں پر اس طرز پر رکھے ہوئے
تھے کہ انکھوں بند ہونے پڑنے پائے۔ شریب شریب
ایک بول اور دو خالی گلاس رکھے ہوئے تھے۔ جن کی تہہ
میں اس وقت بھی شریب کی گھل حقدار موجود تھی۔ لیکن
وہ موگن پار ہوا تھا۔ آنکھوں کے سامنے جو ہاتھ موجود تھا
اس کی دو انگلیاں ڈرامی ہوئی تھیں جن میں سے وہ
حورت کی حرکات و سکنات کا شکار رہا تھا۔
حورت بیچوں کے بل ہی انکھوں سے بے ادوار
چلی رہی تھی کہ آہستہ پیدائ ہو۔ جیسے وہ اس کی بینڈ اور

آرام میں غلغلہ مٹاتا تھا جی ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں درد
کا کوٹ تھا جسے اس نے چہرے پہلے کرسی پر سے اٹھایا
تھا۔ اس نے بڑا گرا کر ایک کیا کیا ہوا تھا۔ جس سے وہ
خوب صورت کے بجائے بڑی منکھ زنگہ زد رہی تھی اس
کی ماں اور اس فحارمت کی لڑکیوں اور عورتوں کو اس نے
پکے اور کھسک سیک باپ میں دیکھا تھا۔ جو کلم لہا کر اوس
کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ لیکن یہ کسی غریبی کی چیل کی
تھی۔ وہ اسے ذرا بڑا کر بھی خوب صورت نہیں لگتی۔ وہ
بیزرے ہے بہت کرک گئی۔ اس پر پشت مرد کی طرف
تھی۔ پھر وہ جلدی جلدی کوٹ کی بیبیوں کی تلاش لینے
لگی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی کھرباہی تھی۔

مرد بائیں ساکت انگلیوں کے درمیان سے
حورت کو غور دیکھا۔ بیبیوں کو کھولنے نٹو سے حورت
نے ایک ہانگی ایک ایک ٹک کر مرد کی طرف دیکھا۔ ذور فاری
کھلی ہوئی انگلیاں آپس میں جوڑ لیں۔ حورت نے ایک
کمر اس کی لیا۔ پھر وہ سٹپن ہو کر دو پارہ اپنے کام میں
مصروف ہو گئی۔ پھر وہ چائے اس حورت نے کسی اندوہی
جنب سے ایک بلی کی ٹونوں کی لڈی نکالی۔ اس نے ٹوٹ
ایک طرف پیچھ کر یا ٹونوں پر لگا دیا۔ جڑے میں صرف اس
کا چہرہ دکھ اٹھا گیا۔ آنکھیں کا فحارمانا غار سے نکلے گئیں۔
یہ بے ٹونوں کی لڈی تھی حورت سے جھکا کر ٹوٹ گئے تھے۔
ایسا کسی گولی کا سانس چھٹکا ہوا اور پکلا پورا
یہ وہ گیا۔ اس کی گردن میں اچھوٹ ہوئے لگا۔
مرد کا ایک ہاتھ پٹائی آہستہ آہستہ کسی بے طرز پر کسی
سانپ کی طرز میں تھلا کر ہوا حورت کی طرف بڑھا رہی تھی۔
ہاتھ کی حرکت بہت ہی آہستہ اور غرضوں انداز سے تھی
جسے حورت محسوس نہیں کر سکی۔ پھر وہ ہاتھ آہستہ آہستہ
بالکل سیدھا ہو گیا۔ اس سانپ کی طرز جو چھن مارنے
کے لئے ہو جاتا تھا۔ ہاتھ کی گھل کی ہوئی موٹی موٹی فولادی
انگلیاں حورت کے بدن سے چڑھا کر قاعیلے پر رک
تھیں۔ اب مرد بڑی احتیاط سے اور سنگین مفاہقت سے
بیزرہا رہا۔ کرکڑی پر بے اشتہی کی کوشش کرنے لگا۔
اس کے ہاتھوں پر سکرہٹ مکمل رہی تھی۔ لیکن یہ

مسکراہٹ خوش گوار نہیں بلکہ زہری اور غماص قسم کی تھی۔ گوئی کے سارے جسم میں خوف کی لہر چلی کی روئی طرح دوڑتی تھی۔ عورت ٹوٹ گئے جس کی خوشی سے ٹوٹ بائیں اور بے کراہے سے تار پھٹی پر بار بار تھوک کر کن رہی تھی کہ ٹوٹ گئے میں غلطی نہ ہو جائے۔ اس لئے وہ مرد کی کسی حرکت کو محسوس نہ کر سکی۔ یہ غلطی نہیں کیوں گوئی کا اس عورت سے اخیانی بھڑکائی ہوئی تھی۔ اس کا ذہن کچھ چیخ چیخ کر عورت کو خطرے سے آگاہ کر رہا تھا۔ لیکن عورت نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

مرد اچانک کرسی پر سے اچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے اسے کچلا کا چھٹکا لگا ہو۔ کرسی فرش پر آئی اور میز پر اٹھنے لگتی تھی۔ اس کا پھیلا ہوا بازو عورت کی گردن میں ساٹھ بن کر رہی کی طرح لپٹ گیا۔ اس کی پشت ابھی مرد کی طرف تھی۔ بازو کا معلقہ ڈانٹا تھا۔ ہوتا گیا اور عورت اس کی گرفت سے نکلنے کے لئے کسی طرح کھینچنے کی کوشش کی۔ دوسرے ہاتھ سے عورت کی کلائی پکڑ لی جس کی گردن میں ڈال دی تھی۔ عورت نے جلدی سے ہاتھ اٹھا نیچے کرنے کی کوشش کی لیکن اسے روہی ہو چکی تھی۔ مرد کی آہنی گرفت کلائی پر مضبوط ہوئی اور وہ آہستہ آہستہ جھرت جھرت کا ہاتھ مروڑنے لگا۔

عورت نے دردی شدت سے بے بس ہو کر ایسی آوازیں نکالی جیسے گوئی کو یہی کسی انسان کے ہجے کے نیچے دب کر بیٹھتی ہے۔

”جینے کی ضرورت نہیں۔“ مرد نے فرماتے ہوئے کہا۔ ”مجھے معلوم تھا کہ تم اس قسم کی حرکت کرو گی۔ میں سو رہا ہوں تم پر کچھ نہیں سمجھتا۔ کیوں ٹھیک ہے؟“ ”مرد بے سحر کے انداز سے نہا۔

”مجھے چھوڑ دو۔۔۔ مجھے جانے دو۔۔۔“ وہ ڈیانی لہجے میں کہتی۔

”ابھی نہیں جان۔۔۔!“ عورت کا ہاتھ مزید بے رحم سے مروڑتے ہوئے استہزاء سے لہجے میں کہا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دھس کر رہی تھی۔ میں نہیں ایسا مردوں کا گرم آئینہ کسی کے ساتھ یہ

حرکت نہ کرو۔“

عورت دردی شدت سے دہری ہو گئی اس نے کراہے ہوئے کہا۔ ”نارائن۔۔۔ نارائن۔۔۔! جلدی سے آؤ۔ میری مدد کرو۔“ ایسا معلوم ہوا تھا کہ وہ دانستہ اپنی آواز دھکی رہی تھی جانتی ہے کہ جس کے لئے اسے خود پر جبر کرنا پڑا ہے۔

فوری ایک منٹ کے کر کے کار دروازہ کھلا۔ دوسرا مرد اندر داخل ہوا۔ اس کی پھرتی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دروازے کے ساتھ کان لگائے مستعد کھڑا تھا کہ ضرورت پڑنے پر عورت کی مدد کے لئے پہنچ سکے۔ دوسرا مرد جو کمرے میں چار حاضرات سے گھسا تھا کچلی کے کونے کی طرح لپٹا ہوا پہلے مرد کی پشت پر پہنچا۔ اس نے ایک لمبی سی ناخنہ نہیں لی اور زہری ہلت دی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر ہاتھوں کو سر سے بلند کیا۔ پھر جیسے ہی پہلے مرد کا سر گھری زانو پر آیا۔ اس نے پوری قوت جمع کر کے پہلے مرد کی گردن پر دو ہتھ مارے۔ پہلا مرد بھری ہوئی پوری کی طرح فرش پر گر کر لڑکھا گیا اور وہ فرش پر ایک ٹھوک سے جس د حرکت پڑا۔

عورت جب کہ فرش پر پکھرے ہوئے ٹوٹ سینے لگی۔ اس نے سارے ٹوٹ جلدی سے جمع کر کے نارائن کی طرف بڑھا۔

”یو۔۔۔ اسے رکھ لو۔“ وہ اس وقت اپنی تکلیف بھول گئی تھی۔

”جلدی کرو۔۔۔ میں یہاں سے فوراً نکلتا ہوں۔“ نارائن نے غصے کو دبا تے ہوئے کہا۔ ”تم بے خوف ہو۔ حیرت کی بات ہے کہ تم اس کی شرب میں بے ہوشی کی دوا بھی ملائیں سیکس۔؟ کیا وہ چار ڈالنے کے لئے تھی؟“

”میں نے دوا ملائی تھی۔! میں سچ کہہ رہی ہوں۔۔۔ شاید اس جنگلی نے نیکو کیا تھا مجھے دوا لی ملائے ہوئے۔“

جلاتے ہوئے کہا۔ ”جب یہ ہوش آئے گا تو شہر کے

سارے پولیس والے ہمارے گرد جمع ہوں گے۔ وہ ہمیں نہ سمجھیں گے۔“

اس نے عورت کا ہاتھ تمام لیا اور دروازے کی طرف قدم بڑھا۔

اچانک فرش پر پڑے ہوئے ساکن بدن میں حرکت پڑ ہوئی۔ پہلے گردنے دونوں ہاتھوں سے نارائن کے پیچے جکڑ لئے۔

نارائن لڑکھا کر کہا۔۔۔ اور اپنا جسمانی توازن پر فرار نہ کر سکا۔ وہ کئے ہوئے سمیتر کی طرح فرش پر گر گیا۔ پہلے گردنے نارائن کی انگلیں چھوڑ دیں۔ پھر پھٹی کی طرح خوب گردن کے نارائن کے اوپر آ گیا۔ وہ دونوں مرد ایک دوسرے میں قہقہہ ہانگے۔

نارائن کے مقابلے میں دوسرا مرد زیادہ پھر تیار اور طاقت ور تھا۔ اس میں تو جو اڑتی تھیں ڈانٹا ہی تھی۔ جسم میں بہت مضبوط تھا۔ وہ نارائن پر سوار ہو کر اس کے سر پر بے ہمتا اور بڑی بے رحمی سے کے بے سراسر ہوا تھا۔ یہ حقیقت بھی گوئی پر چلا ہو گئی تھی کہ گردن اسی طرح نارائن پر پھوڑے جیسے گھوٹے بے سراسر ہوا تو ایک لمحہ کے اندر اندر نارائن کے ہوش ہونے کا جو تا کو ٹوڑ خیزوں کی وجہ سے پہلے ہی اسے ہوش دھواں کم کر بیٹھا تھا۔ نارائن کے دونوں ہاتھ فرش پر بے جان انداز میں پھیلے ہوئے تھے اور اس کی ہونٹیں نمایاں ذمیلی پڑ چکی تھیں اور انگلیاں کھٹکے گی تھیں۔

عورت حواس باختہ انداز میں پورے کمرے میں دوڑ رہی تھی۔ اس کی حالت بھی بڑی غیر ہوری تھی۔ اسے ایک ایسے ہتھیار کی تلاش تھی جو اس کے سامنے نارائن کی مدد کر سکے اور اسے موت کے منہ میں جانے سے بچا سکے۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ پہلا مرد اس کے سامنے کی جان لینے سے باز نہیں آئے گا۔ وہ اپنے اسامی کی جان اپنی جان کی طرح پیاری تھی۔ اس کی کچھ سمجھ نہیں آ یا کہ سر طرح سے اس کی جان بچانے کے اور دشمن سے نجات حاصل کرے۔ اس نے سوچا۔

”کاش! اس کے پاس پتھول ہوتا۔“

جیسے ہی اس کی نگاہ عکسار میں پڑی تو وہ کچلی کی سرعت سے اس کی طرف بڑھی۔ اس کی اور کوئی پھر اس نے اندر سے کوئی کچھ نہ نکالی۔ جس سے متنبہ ہونے والی چپکے سے گوئی کی آنکھوں کو چند سیڑیاں۔ اور وہ اسے چڑھ کر کچھ نہ نکال سکے۔ کیوں کہ عورت اس کی جانب بھی اسے محسوس ہوا کہ کچھ نہ کیا ہو سکتا ہے۔؟

وہ عورت اس نے کچھ میں دبا تے بڑی پھرتی کے ساتھ کچلی اور نارائن کی طرف دوڑ دی۔ اس نے جبکہ کہ وہ چیز نارائن کے ہاتھ میں تھوڑی۔ پھر ایک طرف تھوڑی سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

چند لمحوں کے بعد جب وہ چڑھ دونوں مردوں کے سروں سے بلند ہوئی تو گوئی اس چیز کو دیکھنے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ مردانی سائز کا تیز دھار چاقو تھا۔ نیچے دے ہوئے نارائن کا اٹھا ہوا ہاتھ بڑی تیزی سے نیچے آیا اور چاقو اوپر دالے مرد کے سر کی پشت میں دے تک پیوست ہو گیا۔

اوپر والا مرد فوراً ہی ساکت اور بے جان ہو گیا۔ لڑائی بند ہو گئی۔ لیکن چاقو والا ہاتھ دکا نہیں۔ اس نے دائیں بائیں حرکت کی۔ اور اندر پڑ گیا ہوا چاقو باہر نکل آیا اور پھر فوراً ہی ہاتھ پر بلند ہوا۔ اور جھٹکے میں اس نے چاقو اوپر دالے مرد کی پشت میں دے تک میں گیا۔ بہت ہی خوناک کھینچا۔ اور پھر اسے روک دیا کیونکہ ساگا اس کے نیچے جانے لگا۔ گوئی کو ایسا محسوس ہوا جیسے اوپر والا مرد اپنے بدن کے اندر ہی چاقو کے کڑے سے ٹرپ رہا ہے۔ گوئی کو سمجھا تھا کہ وہ مر گیا ہے۔ لیکن وہ نہیں تھا۔ کیوں کہ اس کا جسم ہولے ہولے کاٹ رہا تھا۔ نیچے دبا ہوا مرد شاید چاقو کی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھا۔ اس نے بڑی بے رحمی سے چاقو کھینچ کر باہر نکالا اور پھر تیسرا وار سابقہ انداز سے کیا۔ پھر وہ دونوں ہی ساکت ہو گئے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان میں سے ایک کھری کھری سانسیں نکالتا تھا۔ جب کہ دوسرا بالکل ہی سانس نہیں لے رہا تھا۔

عورت بت بنی بھٹی بھٹی نظروں سے یہ منظر دیکھ
 رہی تھی۔ اس کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا
 کہ اس کے بدن میں لہو کی ایک بوند بھی نہیں رہی ہے۔

ایک لمحہ کے بعد نارائن نے اپنے لوہو پر اہولہا بن
ایک طرف بے ہوشی سے ہٹایا۔ پھر پھر جی سے فرخ سے
کھڑے ہو کر اپنا جہاز اسہلایا۔ پہلے والے مرد نے بری

طرح دھنک کر رکھ دیا تھا۔ اور اس کا جہڑا بھی نشانہ بنایا تھا۔ درہ اور تکلیف اس سب بڑی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ پھر وہ عورت کے قریب گیا۔ دونوں فرش پر پڑے ہوئے

”کیا۔۔۔ کیا۔۔۔ یہ مر گیا؟“ عورت نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ پھر اس نے سوالیہ نظروں سے

میں دریافت کیا۔ ”کہیں ابھی اس میں جان تو باقی نہیں رہ گئی ہے؟“

”گھبراؤ نہیں..... روزانہ سینکڑوں افراد قتل ہو جاتے ہیں اور قاتلوں کا بھی کسی سراغ نہیں ملتا..... پولیس محبوسوں جیک مارکر بیٹھ جاتی ہے۔ بس..... اب تم خود کو قابو میں

رکھو..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”میرا دل اندر سے بیٹھا جا رہا ہے۔“ عورت نے

سکھائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میرے بدن میں ٹھنڈے سپرے

چھوڑ دے ہیں۔“

”تمہیں زیادہ خوف زدہ اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ مارائن نے عورت کو گھر کی دی۔ ”اسے

”کیا ایسے خواب نظر نہیں آتے ہیں۔۔۔۔۔۔“
 ”ہمارا بالکل یکساں نہیں ہوگا۔“

”مجھے کچھ رانے اخلا دے دو۔“ نارائن نے

کمرے میں نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”خون فرش پر“

پبلر ہا ہے اسے سوکنا ہے۔“
 موت چھ لکھوں کے لئے کمرے سے باہر چلی
 تھی۔ جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں بہت

ہمارے اخبار تھے۔ نارائن نے اس کے ہاتھ سے اخبار لے کر فرش کے نیچے لور اس کے چاروں طرف اخبار پھیلا دیئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

جہاں پچھریں پہلے مستول بیٹھا ہوا تھا اس نے اپی ماسیں
بھال کرنے کے بعد عورت کی طرف سوالیہ نظروں سے
دیکھا۔

آواز تو نہیں سنی۔ آہستہ آہستہ تھوڑا سا رونا شروع ہوا۔

”ٹھک سے۔۔۔“ اس نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔

”اب ذرا اس کھڑکی کی خبر لو لیکن پردہ مت ہٹانا۔۔۔۔۔ اس نے تاکید کی لہجے میں کہا۔“ بس ذرا سا کھسکا کر دیکھ لو کہ کوئی اس طرف تو نہیں ہے؟“

عورت کمزکی کی طرف بڑھنے لگی۔ کوہی اس طرح چونک کر پیچھے ہٹا جیسے کھلی کے زبردست جھٹکے نے اسے کمزکی سے ہٹا دیا ہو اس نے فوراً ہی ادھر ادھر نگاہیں

دوڑا ایں۔ اسے معلوم تھا کہ چند محلوں کی بات ہے مورت
کمر کی تک پہنچ جائے گی۔ جب وہ پردہ کھسکا کر باہر
جھانکنے لگی تب وہ اسے اتنی چہرے پر نظر آجائے گا۔

اس نے ہاں چمکے تھے وہ ان چند کواکس میں سے
 اتر کے نیچے جا نہیں سکے گا۔ چاہے وہ انتہائی تیزی سے
 کیوں نہ اتر جائے۔ اور پھر وہ اتنے مختصر سے وقفے کے
 عرصہ میں، نواحِ زمکہ میں، بھی نہیں پہنچ سکتا۔

اس کی عافیت اسی میں تھی کہ فرائی سرعت سے کہیں
جھپ جائے۔ اس کی نظر چہرے کی رینگ پر ٹٹکتے
ہوئے کبل مرڈی جسے سوکنے کے لئے وہاں لٹکا دیا گیا

تھا۔ گوپی اپنی چہرے پر لوشا ہوا دوسرے کنارے پر پہنچ

کیا۔ جہاں کیل لٹکا ہوا تھا۔ اس نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر کیل کھینچا اور ہاتھ بڑھ کر کیل کے اندر دب گیا۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ کیل کو اچھی طرح پھینکا کر

اسی طرح اپنا بدن ڈھانپ سکتا۔ وہ دل ہی دل میں
 بگوان سے پرانتھنا کر رہا تھا کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ
 کبل سے باہر نکلا نہ ہو۔

ایک لمحہ بعد میں پر رومی کی ایک پتی لڑی۔۔۔۔۔
کو پی کیل کے اندر روشنی کی پتی کو محسوس کر سکتا تھا۔ اس کا
مطلب یہ کہ صورت پردہ کھسکا کر باہر جمنا تک دے رہی ہے۔

یہاں چیت فارم پر بیسویں صدی کے ہیں۔
گوپی نے عورت کی آواز سنی۔ اس کی شرایوں میں
جیسے نجد ہو گیا۔ ”ہاں..... یاد آیا۔ یہ تو ہمارا گیل ہے جو
میں نے سالہا سال کے ساتھ ساتھ“ عورت کی آواز

لحمے سنائی دی۔ ”نچے پلیٹ فارم پر گر گیا ہے۔ میں ڈرگئی تھی۔ کیوں کہ مجھے ایسا لگا تھا کہ کوئی پلیٹ فارم پر لیٹا ہوا ہے۔“

”پردہ کھینچ دو.....“ مرد نے جھلاتے ہوئے کہا۔
 ”کیا وہاں کوئی تماشا ہو رہا ہے جو ساری رات کھڑی
 ہوگی؟“

فورا ہی رو تکی پی ٹی غائب ہو گئی۔ گو پی سمجھ گیا کہ کھڑکی کا پردہ عورت نے درست کر دیا ہے اور کھڑکی سے ہٹ کر اندر چلی گئی ہے۔ اس کی جان میں جان آئی۔ لیکن

”یہ اس کے کاغذات ہیں۔“ گوبی کو مارٹن کی

ہزاروں کے برابر ہے۔ اس کا نام پیوٹھا اور ایک گاؤں کو بھی جہاں
ہزاروں کے برابر ہے۔ چلو اچھا ہوا۔ کیوں کہ اکثر مال بردار
کے متعلقہ افراد کو قتل کر دیا گیا ہے۔

لوگوں کی فکر اور پریشانی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ جلدی سے اس کی ماری جیسے خالی کر دو۔ اس لئے بھی کہ کوئی کاغذ اور پرزہ بچا نہ جائے جس سے اس کی شناخت ہو جائے۔

”لو..... اب اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ
15 June 2012 Courtesy ww

وہ کون تھا.....؟ کہاں ملازم تھا.....؟ عورت کی آواز لرز رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی بھی لمحے رو دے گی۔ ”تم اس کے بارے میں یہ سب کچھ کیوں سوچ رہے ہو؟“

”فرق کیوں نہیں پڑتا۔۔۔؟“ نارائن نے تیز لہجے میں پوچھا۔
 ”اصل بات یہ ہے کہ ہم نے اسے قتل کر دیا۔ یہ

عزت نے جواب دیا۔ ”ہنگوان کے لئے یہ سب چھوڑ دو۔ ہمیں کسی جھیلے میں پرنے کے بجائے یہاں

”اب ہمیں بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

سچے کی کوشش کرو گانا۔! ہمیں یہاں سے فرار ہونے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ بس کی لاش یہاں سے ہٹا دیں۔۔۔۔۔ کسی نے بھی اسے

یہاں آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا..... اور پھر کسی کو چٹا نہیں کہ یہاں کیا ہوا۔ اگر ہم یہاں سے فرار ہو جاتے ہیں تو سبج ضرور کوئی نہ کوئی لاش دریافت کر کے پولیس کو اطلاع

کر دے گا..... تم نے اس بات پر غور نہیں کیا۔ قلیٹ خالی کر کے جانا مصیبت کو دعوت دیتا ہے۔ اس لئے ہم قلیٹ میں رہتے ہیں۔ اس لئے کہ ہماری عدم موجودگی ثابت

کر دے گی اسے ہم نے گل کیا ہے اور پھر پورے ملک کی پولیس سرگرمی سے ہمارے قہر قبہ میں لگ جائے گی۔ وہ آج نہ سنی گل نہ سہی..... لیکن کتنی نہ کسی روز تو ہمیں گرفتار لگے گا۔

”پھر کیا کرو گے.....؟“ عورت کے لہجے میں خوف تھا۔ ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ اندر سے دل

”ہم اس کی لاش ٹھکانے لگا دیں گے۔“ نارائن نے جواب دیا۔ ”پولیس کو ہمارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملے گا۔ نہ ہی ہم بروہاتھ ڈال سکیں گے۔ بغیر ثبوت کے

ہمارا بال تک بچا نہیں کر سکتے۔ پھر ہم یہاں پہلے کی

Dar Digest

طرز رہیں گے کسی کو ہم پر شک نہیں ہوگا۔
گولی نے چہرے سے کل چٹا کر ڈی کی طرف
دیکھا۔ نیچے چوٹ کے ساتھ پہلے جو زرد ہوئی تھی۔ اب
وہ بھی عاب ہوئی تھی۔ اب وہ انٹیں دیکھیں سکا تھا۔
لیکن ان کے درمیان پہلے والی انگلیوں کی طرح اس
سکنا تھا۔ اسے ان کی انگلیوں سے ہٹا کر دیکھی تھیں۔ سرور کا
نہیں تھا۔ وہ جلد زہلہ ہو کر ہٹ کر اپنے کمرے میں
جاتا جاتا تھا۔ اس کے لئے ایک ایک لمحہ جا کر کل ہوتا
جا رہا تھا۔ پھر وہ اندھا ہو کر آہستہ آہستہ چوڑے پر پھٹنے
لگا۔ اس کے ہر ہاتھی بیڑی سے ٹکرائے۔ لیکن وہ اس ہتھی
کی چٹ کی پروا کے بغیر ٹھکسای رہا۔ وہ چوڑے کے
فولاری فرش سے چپقلی کی طرح چپکا ہوا تھا۔ اس کے
کانوں میں مرد اور عورت کے درمیان ہونے والی گفتگو کی
آواز اب بھی آ رہی تھی۔
”کیئن نارائن۔“ عورت نے ساٹ سے لہجے
میں دریافت کیا۔ ”ہم اس کی لاش کو کہاں فٹکا لے گئیں
گے؟“

”ابھی بتا ہوں۔“ نارائن نے جواب دیا۔
”ذرا تم وہ تھیلے اٹھا کر ڈالو جن میں تم ہر ماہ سودا سلف
خرید کر لاتے ہو۔“
گولی بڑی احتیاط سے ایک ایک بیڑی اتر رہا
تھا۔ بیڑیوں کو بے کسی ہوئی تھیں اور ان میں رنگ
ہوا تھا۔ گولی کو احساس تھا کہ اگر وہ اندر کی آواز سن سکے
تو وہیں باہر سے آنے والی آواز بھی آ سانی ہے۔ آواز سن
سکتے ہیں اور پھر انٹیں فوری ہمارا اس کی جودگی کا پتا
چل جائے گا۔ وہ بڑی احتیاط سے تھیلیاں ایک ایک
گتھوں کے بل آہستہ آہستہ بیڑیوں اتر رہا تھا۔
”نارائن!.....! اتنا بڑا آدمی اس تھیلے میں کیسے
آ سکتا ہے؟“ کانٹا نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔
”تمہاری کھوپڑی میں عقل ہے تو سوچ کر
دیکھو۔“ نارائن نے تیز لہجے میں کہا۔
”مصل ہے جی تو میں کہہ رہی ہوں۔“ کانٹا نے
کہا۔ ”اس میں ایک پتھر آسکتا ہے لیکن یہ نہیں آ سکتا۔“

”تھیلے کا پیسے ہیں۔۔۔۔۔ وہ ان دو قدوں میں
با آسانی آ جائے۔۔۔۔۔ تم دیکھنا یہ انٹیں میں کس طرح
آ سکتا ہے۔“ پھر کمرے میں چندھوں گہری خاموشی طاری
رہی۔ پھر مرد کی بھاری آواز نے اس کو تسکین کو ڈال دیا۔
”کانٹا۔۔۔۔۔ ہلدی سے غسل خانے میں جا کر میرا سزا
لیٹی آؤ۔۔۔۔۔ تاکہ میں اس کام سے جتنا جلد ہو سکے فارغ
ہو جاؤں۔“
”نہیں۔۔۔۔۔ نارائن نہیں۔۔۔۔۔ پلیز۔“
کانٹا دھتکڑی سے ہلکا احتجاج کرنے لگا۔
”میں نے تم سے کب کہا کہ تم کمرے کے دھڑ
ساری کارروائی نہ دیکھو۔۔۔۔۔ جہیں کیسے کی کوئی ضرورت
نہی نہیں ہے۔ یہ میرا کام ہے میں کر لوں گا۔۔۔۔۔ تم ایسا
کرو۔ دوسرے کمرے میں انتظار کرو۔ جب میں آواز
دوں اب تم جانا۔۔۔۔۔ یہیں سے کراہا نکل صاف نظر آئے
گا۔“ نارائن نے کہا۔
گولی رک گیا تھا۔ اس کا بدن ہرف کی طرح
خٹھا ہو گیا تھا۔ دوسری طرف خاموشی طاری ہوئی تھی۔
گولی پوری بیڑی اتر گیا تھا۔ اس چند پائیدار دھڑے
تھے۔ اس کے بعد کسی چوڑے قاص کے ساتھ اس کی
کڑکی کی۔
”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔“ گولی کو مرد کی آواز سنائی۔
”اب ذرا یہ اخبار اٹھاؤ۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ مجھے کھلی کی
ضرورت ہے۔“ باہر پلیٹ فارم سے کھل
لاؤ۔۔۔۔۔ اس کے بعد تمہارا کام ختم۔۔۔۔۔ تم دوسرے
کمرے میں چلی جانا۔“
یہ سنتے ہی گولی کے سارے بدن میں برقی روروڑ
گئی۔ اس نے سانپ کی طرح پھیلنے ہوئے بغیر پائیدار
لے سکے اور چوڑے پر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ ایک جست لگا
کراپے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ اچانک اس کے پیچ کی
چیز میں بری طرح الجھے۔ اس نے جلدی سے نیچے
دیکھا۔ اس کا سانس رک گیا۔ کھل اس کے قدوں میں
لپٹا ہوا تھا۔ گولی کو اس کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ اس
نے جلدی سے سر اٹھا کر پوچھا۔ دیکھا۔ ٹھیک اسی کے روشنی کی

ایک چوڑی ہٹی اوپر والی کڑکی سے نکل کر اوپر والے
چوڑے پر پڑی۔
”کھل۔۔۔۔۔! ہٹی بک نہیں ہے۔“ عورت نے مرد
سے کہا۔ ”وہ ہوشیار ہے نیچے کر گیا ہے۔ میں اب کیا
کروں؟“
”وقف۔۔۔۔۔“ مرد کی ہڈی سے برقی آواز
گونجی۔ ”تم میں تو ذرا سی عقل نہیں ہے۔۔۔۔۔ تم چھوٹی
بچی کی طرح پوچھ رہی ہو کہ میں کیا کروں۔۔۔۔۔ دوسری کھل
نہ کے جلدی سے باہر بڑا آؤ۔ کیا تم اپنی تحریکوں
سے ساری دنیا کو اذیتا جانتی ہو۔“
فوری روشنی نکل ہوئی۔ گولی نے پھر جھٹک کر
کھل ہٹایا اور پھر جست لگا کر کمرے کی کڑکی میں داخل
ہو گیا۔ دوسرے کمرے وہ اپنے کمرے کے فرش پر کھڑا ہوا
تھا۔ اس کے علاوہ دھڑ کھڑا اور کھل کھڑا اتفاق نہیں
تھا کہ وہ کھل اکر اوپر والے چوڑے پر بڑاں اکرے
چندھوں کی مہلت پائی تو کوئی مہلت جگہ پر موجود ہوتا۔
”او۔۔۔۔۔“ نارائن۔۔۔۔۔ میرا کھل ہوا سے ڈر کر
پلیٹ فارم پر گر گیا ہے۔“ کانٹا کی خوف میں ڈوبی ہوئی
گوشی سنائی دی۔ چہرے پہلے تو یہاں پر تھا۔ وہ
نیچے کر گیا۔ حالانکہ وہ اس کی تحریکوں کی آواز نہ کرے۔
”یہ دقت ابن باتوں کو سوچنے کا نہیں ہے۔۔۔۔۔
ہو اسے ہی گرا ہے۔ کسی نے نہیں کر لیا ہے۔ نیچے جا کر
اٹھاؤ۔۔۔۔۔“
گولی کو اپنی بیڑیوں پر قدموں کی ہلکی سی چاپ
سنائی دی۔ جو قریب آتی جا رہی تھی۔ وہ کڑکی کے ساتھ
والی دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے کمرے
میں اندر میرا تھا۔ اگر وہ عورت کڑکی سے تھاکر کہتی
اور روشنی کرتی تھی تو وہ اسے نظر نہ آتا۔ کیوں کہ وہ
کڑکی کی دیوار سے چپکا ہوا تھا۔ قدموں کی چاپ بند
ہوئی۔ پھر گہری تاریکی میں ایک سفید سایہ لپٹا اور
اندر میرے میں عاب ہو گیا۔ دوسرے کمرے قدموں کی
چاپ بلند ہوئی اور وہ روٹنے لگی۔ پھر تاریکی ہو گیا۔
”کمال ہے۔۔۔۔۔ ہوا باگل بند ہے۔۔۔۔۔ جس

ہے۔ پھر یہ کھل کس طرح اڑ کر نیچے گر گیا۔ ساڑی،
چٹائی، کوٹ، پلاٹ، ڈاؤن پش اور جاڑی ہوئی تو اس طرح نہ
گرتی۔ کھل بند کی کھل مل رہا ہوا۔“ عورت نے
بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”کیا کی عورت نے ڈر کر مارا ہوگا۔“
چندھوں کے بعد سے کڑکی بند ہونے کی آواز
سنائی دی۔ پھر سمجھ کر چھا گیا۔ گولی چندھوں تک اسی
طرح سے حس و حرکت کرنا آہٹ لیتا رہا۔ پھر وہ اپنے
بستر پر جا کر دروازہ ہو گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ انگوٹوں پر
لیٹ گیا ہو۔
کراہی سوتور کی تحریک طرح دیک رہا تھا۔ ہر
طرف سے آگ برسی رہی تھی۔ وہ ابھی حالت میں
فعلی اتار کر لٹ جاتا تھا۔ لیکن اس نے فعلی اتارنے
کے بجائے چار داؤڑ لٹی۔ اس نے چاروں کے اعدا پنا سر
بھی چھایا اور بستر پر بری طرح کا پٹنے لگا۔ جیسے یہ بستر
کا مہینہ ہو گا۔ اس کے سر دی پر رہی ہو اور بڑیوں میں
چمید کر رہی ہو۔
ایسا جاڑا کھلی نہیں کھاتا۔ وہ کان کا کراہ پڑے آنے والی
آوازوں کو سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے اوپر چلنے پھرنے
کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اس وقت
میں وہ اپنی کیفیت پر قابو پا چکا ہے۔ وہ اس عورت اور مرد
کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس کی نظروں کے
سامنے داؤدہ منتظر کھوٹے لگا کہ اس وقت کیا ہو رہا
ہوگا۔؟ اس کمرے میں جہاں کل کی واردات ہوئی
ہے۔ یہ تصورات خوفناک کر نے اور دھتکڑی انگیز کر رہی۔
ایک بار پھر اس کے کمرے پر زور طاری ہو گیا۔ سخت گری،
جس اور جس میں جس میں کپکپاہٹیں ہونے لگی۔ پھر
خٹنے سے پہلے چھوٹنے لگی۔ لہجے سے گری لگی۔
بہت دور تک اس طرح انٹوں کے ساتھ اور اوپر
چلنے پھرنے اور پھیلنے جانے کی آوازیں آتی رہیں۔ اور
پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ اب اسے ایسا لگا جیسے اب اس
قلبت میں وہ دونوں موجود ہیں۔ گولی نے سوچا۔
کہیں وہ دونوں عقل کی لاش فٹکا لے گئے کے لئے تو

معمولات میں شامل تھا۔ اسے اس بات کی آشتی کی کہ اسے کرے سے باہر نکال دے۔ اس نے سوچا۔ اسے جلدی کرنی چاہیے۔ وہ سن اکیس کی ماں کا کام پر جاتی جانے کی بھرہ وہ کسی شام کو آئیں اکیس کی بھرہ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اس نے آہستہ آہستہ دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھٹ کھٹانے لگا۔ اس نے آواز اٹائی کہلی رگھی کی کہ اس کے پانچ بیٹے بیٹے بیٹے بیٹے بیٹے۔ وہ بہ گہری نیند میں ڈوب جاتے تھے۔ گھر سے خرابے لئے تھے اسے ان کے خرابوں کی آواز ملتی دے رہی تھی۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ انہیں نیند سے بے مل رہ کر بچ گیا ہے۔

”ماں! ماں! ماں!“ اس نے دروازہ کھٹ کھٹا دیا۔ ہونے والی کولہاڑ کچھ دیر بعد اس کی کوششیں باآورد ثابت ہوئیں۔ باہر سے اس کی ماں نے دروازے پر جھانکی دنگ دنگ کر اپنی موجودگی سے باخبر کیا۔

”ماں! مجھے باہر نکالو۔“ پلینڈر امیری بیداری مانا۔
”ہی میں تمہاری بہتری اور بھلائی کے کوئی؟“ مان نے سرکشی میں جواب دیا۔ ”تمہارے ہاتھی نے کہا کہ جب تک تم اعتراض نہ کرو تو تم نے جو کچھ کہا ہے وہ جھوٹ تھا۔ اس وقت تک تم باہر نہیں نکل سکتے۔ تم اعتراض کرنا ہو کوئی ایلولو۔ جواب دو۔“

”نہیں!“ اس نے کہا۔ کالج پر احتجاج تھا۔ وہ باپوں اور اسفرد ہو گیا۔ گرا ساس لے کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل اعدہ سے بھگسا گیا تھا۔ خود اس کے والدین اس کی بیچ بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھے۔ انہیں خدا کی قسم تھی۔ اسے کسی۔۔۔ وہ ہٹ

چھری پر اتر آیا ہے۔ ان کا خیال تھا۔ لیکن ایسی بات نہ تھی۔ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔؟ وہ سوچنے لگا۔ کیا اسے خاموش رہنا چاہیے۔؟ کیا اسے احتجاج کر لیتا چاہیے۔؟ اس نے جھوٹ بولا ہے۔؟ نہیں۔۔۔ وہ ہرگز ہرگز چاہیے گا کہ انہیں کھوئے۔۔۔ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ نظر انداز کر دیا جائے۔ اگر وہ خاموش رہتا ہے تو

تھا۔ اسے صرف دیکھ کر کہ وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ اس میں احتجاج نہیں تھا کہ وہ باپوں کے کہیں اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنا سکے۔ آخر کار پولیس افسر نے سراٹھا کر دیکھا۔ پھر اس نے حیرت اندوزی سے کچھ کہنے لگا۔
”کیا بات ہے؟“
”کیا تمہاری سائیکل چھٹی ہو گئی ہے؟“
”نہیں جناب۔!“ کوئی نے اگتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں۔۔۔ میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔“

”تم کیا بتانا چاہتے ہو۔۔۔؟“ پولیس افسر نے دوبارہ کثافت پر نظر پڑا دیا۔ ”میں۔۔۔ کوئی نے بڑی احتیاط سے جاؤں طرف دیکھا۔“

”کیا وہ بچے کے سرک پر دیکھا ہے؟“
”نہیں۔۔۔ وہ بچے کے سرک پر دیکھا ہے۔“
”تم کیا بتانا چاہتے ہو۔۔۔؟“ پولیس افسر نے دوبارہ کثافت پر نظر پڑا دیا۔ ”میں۔۔۔ کوئی نے بڑی احتیاط سے جاؤں طرف دیکھا۔“

”کیا وہ بچے کے سرک پر دیکھا ہے؟“
”نہیں۔۔۔ وہ بچے کے سرک پر دیکھا ہے۔“
”تم کیا بتانا چاہتے ہو۔۔۔؟“ پولیس افسر نے دوبارہ کثافت پر نظر پڑا دیا۔ ”میں۔۔۔ کوئی نے بڑی احتیاط سے جاؤں طرف دیکھا۔“

”کیا وہ بچے کے سرک پر دیکھا ہے؟“
”نہیں۔۔۔ وہ بچے کے سرک پر دیکھا ہے۔“
”تم کیا بتانا چاہتے ہو۔۔۔؟“ پولیس افسر نے دوبارہ کثافت پر نظر پڑا دیا۔ ”میں۔۔۔ کوئی نے بڑی احتیاط سے جاؤں طرف دیکھا۔“

”کیا وہ بچے کے سرک پر دیکھا ہے؟“
”نہیں۔۔۔ وہ بچے کے سرک پر دیکھا ہے۔“
”تم کیا بتانا چاہتے ہو۔۔۔؟“ پولیس افسر نے دوبارہ کثافت پر نظر پڑا دیا۔ ”میں۔۔۔ کوئی نے بڑی احتیاط سے جاؤں طرف دیکھا۔“

”کیا وہ بچے کے سرک پر دیکھا ہے؟“
”نہیں۔۔۔ وہ بچے کے سرک پر دیکھا ہے۔“
”تم کیا بتانا چاہتے ہو۔۔۔؟“ پولیس افسر نے دوبارہ کثافت پر نظر پڑا دیا۔ ”میں۔۔۔ کوئی نے بڑی احتیاط سے جاؤں طرف دیکھا۔“

کر رہے ہوا کہ؟۔۔۔ پھر اس نے گولی کے چرے پر گہری نظر ڈالی۔ گولی کے چرے پر چمائی ہوئی شہید کے اس لاش کا شک و دو شک نہ کیا۔
”نہیں سر!۔۔۔ گولی نے سر ہلا دیا۔
”اچھا دیکھو۔۔۔“ اشرار نے۔ ”یہ میرا شبہ نہیں ہے۔ کیا تم شے کا مطلب سمجھتے ہو؟“
گولی نے کچھ نہ دیکھتے ہوئے جلدی سے اپنا سر اٹھایا اعجاز میں ہلا دیا۔

لیکن وہ بالکل دھپل کر رہے ہو۔۔۔؟“ اس نے ہال کی سمت اشارہ کر کے کہا۔ ”بس وہاں چلے جاؤ۔ وہاں جو صاحب بیٹھے ہیں انہیں اپنی کھائی پانی سنا۔۔۔ وہ صاحب ہال کے دروازے پر نہیں ہوں گے۔ پہلا دروازہ چھوڑ دو مگر سرے کے سرے پر پہلے چائے و دہن پر وہ صاحب ہوں گے۔ جن کے بارے میں میں بتا رہا ہوں۔ دیکھو۔۔۔ پہلے دروازے میں مت گھٹا۔ وہاں جو آدمی بیٹھا ہے بہت خاتم ہے تمہاری عمر کے بچوں کو ناشتا میں کھا جاتا ہے۔۔۔ سمجھ گئے نا۔۔۔؟“

گولی نے انہماک میں سر ہلا دیا۔ پھر وہ راہ واری پلٹ کر تہا ہوا ہال کے دروازے پر رک گیا۔ پھر اس نے کمرے پر پولیس اسر کی طرف دیکھا جو اس کی طرف متوجہ تھا اس نے ہاتھ ہلا کر گولی کا حوصلہ بڑھا دیا۔ گولی کو دروازہ کھول کر اندر اس میں داخل ہوا۔

اس نے خوف و ہراس میں دروازے سے پہلے دروازے کو دیکھا۔ اور دے دے دے دروازوں کے ساتھ بیڑے قحط اعجاز میں اس کے سامنے سے گزرا اس کا دل تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ پھر اس نے دوسرے دروازے پر کھانچے ہاتھ سے دنگ دی۔ دنگ دیتے ہوئے اس کی جان اٹھ گئی۔ یہ حالت اس وقت طاری ہوئی تھی جب وہ اس کو طلب کئے جانے پر پہل کے کرے میں داخل ہوتا تھا لیکن اس وقت وہ اس سے خوفزدہ تھا۔

”آ جاؤ۔۔۔“ اندر سے ایک تیز آواز نے گولی کو کھینچا۔ گولی نے اپنے جسم کو حرکت دینے کی کوشش کی۔

ہو چلا آج آج آج آج۔۔۔ پولیس کا ڈیس سائزن بھائی ہوئی تیز رفتاری سے اس کے گھر کی طرف چل پڑیں گی۔ پولیس اسر جیج اس کا حکامات دیں گے۔ قتلوں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن پتا نہیں اس اسر کی کیا ہو گیا ہے جو بپ چاپ بیٹھا اسے دیکھے جا رہا ہے اسے لگا پولیس اسر نے بتایا ہے۔
”کیسے نام ہے تمہارا بیٹا؟“ اس نے چندوں کی خاموشی کے بعد دریافت کیا۔ ”کہاں رہتے ہو؟“

گولی نے اپنا نام اور بتایا۔
”کیسے نہیں خواب نظر آتے ہیں۔۔۔؟“ اس نے دوسرے نرم لہجے میں دریافت کیا۔ ”خوف ناک خواب جنہیں دیکھ کر چیخ نکال جاتی ہے۔“
”نہیں سر۔۔۔؟“ گولی نے نمونہ لہجے میں جواب دیا۔ ”مجھے ایسے خواب نظر آتے ہیں۔۔۔ بہت نظر آتے ہیں۔“

پولیس اسر میر کی طرف جھکا۔ اس نے سامنے رکھے ہوئے داخلی مواصلاتی نظام کے آلے کا شن دیا۔
”واں! ڈرا دھر آؤ۔“
چندوں کے بعد ایک درمض کرے میں داخل ہوا۔ وہ بھی سادے لباس میں لیڈن تھا۔ جس کی وجہ ان اسر کی بقت گولی کی نظروں میں کم ہو گئی تھی۔ کچھ دیر وہ اس کے متعلق پتہ میں صلاح مشورہ کرتے رہے۔ گولی ان کی سرکشاں میں نہیں سکتا تھا لیکن اسے احساس تھا کہ کنگو کا موضوع خود اس کی اپنی ذات ہے کیوں کہ وہ بھی اس کی رک کر کے بڑی عجیب نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہونے والے تاثرات بھی غلط تھے۔ اس نے جس بے باک جرم کی اطلاع دی تھی جس کی وجہ سے پولیس اسر ان کا پریشان ہونا لازمی فطری امر تھا۔ لیکن اس کے بجائے کسی بھی گولی کو ان کے ہونچ پر دہی پڑی اور ترخانہ نہ کرنا نظر آئی تھی۔ جیسے وہ اس کے سامنے کسی نوکری کو پیش کر رہے ہوں۔

پھر پہلے اسر نے اسے مخاطب کیا۔ ”تو تم نے انہیں ایک آدمی کے گلوے گلوے کرتے ہوئے دیکھا تھا۔“

اور۔۔۔؟“
یہ سراسر غلط بیانی تھی۔۔۔ حقائق کو کسج کیا جا رہا تھا۔ گولی نے کج بولنے کا تہہ کیا ہوا تھا وہ انہیں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ وہ اس کے بیان کو توڑ دے کہ اس کے سامنے کریں۔۔۔ ہاں اگرچہ پہلے ہی بات اس کے سامنے کی جاتی تو وہ اس شان اور دھرم سے متوجہ ہو جاتا ہے۔

”نہیں سر۔۔۔؟“ اس نے اسر کی بات کا سنتے ہوئے کہا۔ ”میں نے انہیں لاش کے گلوے کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے صرف اپنے کانوں سے سنا تھا کہ وہ اس کے گلوے کرتے لاش کے ہلاک سے بڑے قحطوں میں بند کریں گے اور پھر ان گلووں کو باہر نہیں پھینک دیں گے۔“

لیکن اس سے پہلے کو انہیں یہ بتانا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے انہیں ایک آدمی کو قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور قحط میں رہنے والے ہڈی سے اس کی نظروں پر آتا ہے۔ پھر وہ اپنے سر کے دائرے تھے۔ پولیس اسر نے فوراً اس سے دوسرا سوال پوچھا۔
”کیا تم نے اپنے والدین کو اس جرم کی اطلاع دی تھی؟“

یہ بیوا غلام سوال تھا۔ جس نے اسے بری طرح پکارا کر کھدایا تھا۔ اسے جیسے کسی کرے اس خان میں ڈال دیا تھا۔ اسے اس بات کا ڈر خوف محسوس ہو رہا تھا کہ جب وہ بڑی سچائی سے اس سوال کا جواب دے گا تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔ کج بولنے سے اس کا جوش ہوتا تھا۔ اس نے دھڑکنے میں جلا ہو گیا تھا۔ آخراں نے کج بولنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
”جی۔۔۔ جی ہاں۔۔۔“ اس نے جھپکے ہوئے جواب دیا۔ ”آواز اس کے قلع میں محسوس تھی۔“
”پھر وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں آئے۔۔۔ انہوں نے جنہیں تمہا یہاں کیوں بھیجا۔۔۔ انہیں یہاں خود آنا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں جو انہوں نے تمہیں پرہیز دینے کا کرنا تھا۔ یہاں بھیج دیا۔“ اس نے کہا۔

Price : 300/-

میک اپ کی اہمیت کیا ہے؟

جب میک اپ اچھا ہو تو حسن میں بھار، لکشی نظرات کی ہے اور پھر میک اپ کرنے میں ہر خواتین کا اپنا ہنر، طبعیت اور تفاسات کی ظاہر ہوتا ہے۔

بیماری، بھینس، ایک بویٹھ ہونے کے ناطے، بیش کہہ سکتی ہوں کہ میک اپ بھی ایک فن ہے۔ ہر کام میں ماہر ہونے کے لئے تربیت اور پرنسپل ضروری ہے اور بغیر کسی ماہر کے ہمارے کسی بھی کام میں ماہر ہونا مشکل ہے اور میک اپ کے فن میں ماہر ہونے کے لئے بیماری یا بھونے کے لئے یہ کتاب بڑی تک و دواد و حیرت شائق سے تیار کی گئی ہے۔ بڑی حد تک یہ کتاب خواتین کے لئے لکھی گئی ہے۔ معاون و دوادگار ثابت ہوگی اس کتاب میں میک اپ کے علاوہ جلد کی حفاظت، ہاتھ پر دلی کی حفاظت، ناؤ، نگار، اور جدید دور کی میک اپ کی اشیاء کے متعلق بھی اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ سخت مندر ہے کہ لڑکی اس کتاب میں خواتین ہیں۔

صابری دار لکنتب

قدانی اکہیت اردو بازار لاہور

ہیں۔" وہ اس کے چہرے پر ناگوارگی اور بے زاری لکھی گئی اس کا لہجہ اکڑا ہوا تھا۔ چون کہ اسے انصر سے اسے نہیں مار سکتا تھا اس لئے وہ نام رکھنے کا کاغذ اہم میں ٹھونکنے ہوئے باہر نکل گیا۔

"بیٹا!.....! ہمارا ہل میں بیٹھ جاؤ۔ وہاں بیٹھ چڑی ہلے ہے۔ اس کی ٹھوڑی درمیان آ جائے گا۔ اس کے بعد ہم یہاں سے گھٹکھڑکیں گے۔"

گوئی ہل میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہ خالی پڑی ہوئی تھی۔ اسے چالیس منٹ کا اذیت ناک انتظار کرنا پڑا۔

پھر وہاں نای پولس افراد واپس آ گیا۔ اس نے گوئی کی طرف دیکھا بھی کوہار نہیں کیا۔ وہ سیدھا کرے میں آ جانور کی طرح ٹھس گیا۔ وہ امید بھری نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ چند لمحوں کے بعد اُنکی دو طرفان کی طرح دروازہ کھلے گا اور بیلا اصریح کر کے اسے اندر بلائے گا۔ پورے پولیس اسٹیشن میں ہوجوال آ جائے گا۔ دروازہ کھلے گا۔

لیکن کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ نای پولس پوچھا۔ "خبردار ہے کیا ہمارے پاس نای پولس اسٹرکی آواز سنائی دے جاتی ہے اور پہلا اصریح ہنسنے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد کسے کا دروازہ کھلا اور اس نای پولس اصریح نے اسے کھاجانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے اسے اندر آ کا اشارہ دیا۔ وہ کسی بھی طرح چپ چاپ اندر جا بیٹھ گیا۔ کچھ لمحوں تک وہیں اصریح اسے خاموشی سے دیکھتے رہے۔

"ایک بات تو بتاؤ بیٹے۔" پہلے اصریح نے اسے بڑے پیار بھرے لہجے میں مخاطب کیا۔ اس کے پتا نہیں تھے زندگی میں کسی ایسے پیار بھرے لہجے میں مخاطب ہوئے کیا تھا۔ اس لیے اسے ہوا سزا کی طرح تپنے لپنے کرے میں اوپر کی آواز سن سکتے ہو۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کمرے کی چھت بہت جلدی ہوئی ہے اس لئے اوپر کی آواز سننی چاہیے۔"

"جی۔ جی ہاں۔" گوئی نے سر ہلاتے

جھوٹ نہیں ہے آپ یقین کریں۔"

"پولیس اصریح نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کر دیا۔

"کیا تمہیں معلوم ہوتا ہے کہ کم کم جھوٹ ہونے لگا اور کچ بک بولنے ہو.....؟" کیا تم کچ اور جھوٹ کے درمیان فرق محسوس کر سکتے ہو؟" گوئی نے محسوس کیا اس کے چہرے پر اسٹرکی نظروں کی گرفت میں ہے۔

"جی ہاں سر۔" گوئی نے احتجاج کر کے ہونے لگا۔ "مجھے اس وقت ابھی طرح معلوم ہے کہ اس وقت میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔"

دو دھڑکی آواز میں آپس میں مشورہ کر کے گوئی کو اندر میرے میں امید کی ایک کرن نظر آئی۔ اگر اس کا جواب مقبول نہ ہوتا تو وہ آپس میں تامل خیال نہ کرتے۔ اس سے کہنے کو تم اچھے سچے کی طرح گھر جاؤ اور آ کر کام آؤ۔ آئندہ بھی وقت غراب نہ کرو۔ وقت بڑا قیمتی ہوتا ہے۔

"ہم اس معاملے کی تحقیق ضرور کریں گے۔" پہلے اصریح نے اسے یقین دہانی کراتے ہوئے تسلی دی۔ پھر اس نے لیٹ کر اسے سامنے کی طرف دیکھا۔

"وہاں؟" گوئی نے ڈر دیکھ کر یہ کیا کرے۔ لیکن اس بات کا خیال نہ کر کے وہ اپنی سرکاری طور کوئی قدم اٹھانے لگے اور اسے اشارے میں۔ یہ تحقیق جو بھی ہوگی وہ میرے سرکاری ہوگی۔ تم سب کو سن کر جانتے ہو انہیں کوئی چیز فروخت کرنے کی کوشش کر رہی۔ میری رپورٹ دیکھ کر وہ گا۔ ان کے پاس اسٹریج ہو سکتا ہے تم اس بھانے اسٹریج اور دیکھو کہ میرے پاس لائسنس ایک بڑی ریزر ہے۔ میرے نمونے کے طور پر وہی لے جاؤ۔ یہ چاہے وہ لوگ.....؟" اس نے سولید نظروں سے گوئی کی طرف دیکھا۔

"پچھنی منزل بڑا" گوئی نے بتایا۔ "ہائلنگ ہمارے کاروبار۔"

وہ چھنی منزل کے کمرے میں بیٹھا۔ "اس بیٹے سے بچو۔ بھانڈا کس کے حوالے کرو یا جس پر کوئی کا نام پانچ لکھا ہوا تھا۔"

"اب میرے لئے یہی فضول اور تکلیف دہ کا سرہ

گوئی نے خاموشی سے مگر اس بلا کولنے کی کوشش کی۔

"جواب دو بیٹے۔" اس نے بڑے نرم لہجے میں اصرار کیا۔

"پولیس کے سامنے کسی جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ اس نے دل میں سوچا۔ اور پھر یہ معاملہ تو بہت ہی سنگین نوعیت کا ہے۔ اگر انہوں نے روٹی نہیں پختی ہوئی ہے تو کیا ہوا.....؟ آخر میں تو پولیس اصریح....."

"انہوں نے..... میری اس بات پر یقین نہیں کیا۔" گوئی نے قدرے متذہب سے کہا۔ "اس نے مجھے خود یہاں آنا پڑا۔"

"انہوں نے کس لئے تمہاری بات کا یقین نہیں کیا؟"

"ان کا خیال ہے کہ میں ہمیشہ جھوٹ بول رہا ہوں۔" گوئی نے کہا۔ "میں نے جب اس واردات کے بارے میں بتایا تو انہوں نے کہا کہ میں نے کسی ہمارے کسی کہانی سنائی ہے۔ حالانکہ یہ بات قطعی درست نہیں ہے۔"

پولیس اصریح نے ایک دوسرے کی طرف متقی خیز نظروں سے دیکھا تو گوئی نے ڈر سے لنگر دیا۔ ان نظروں کا مطلب غریب سمجھنا تھا۔ وہ بک بولنے کی جنگ ہار گیا تھا۔ پولیس والے بھی اس کے بتائی کہ تم خیال بن گئے۔ کوئی بھی یقین ہو گیا تھا کہ یہ لڑکا جھوٹ بول رہا ہے۔ کوئی گھڑی ہوئی کہانی سنا ہے۔ وہ ان کے شکوک کیسے دور کرے؟

"اچھا....." پولیس اصریح نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "کیا تم واقعی جھوٹ بول رہے ہو؟"

اس بات نے گوئی کے اندیشوں کی تصدیق کر دی۔ اس نے صحت نہ ہادی۔ اس نے بڑے مضبوط لہجے میں اپنا فائدہ کیا۔

"نہیں سر..... میں اب جھوٹ نہیں بولتا۔"

پہلے کسی جھوٹ بولنا تھا لیکن اب بالکل بھی نہیں بولتا ہوں۔ میں نے جو کہ بتایا ہے اس میں ذرہ برابر بھی

جنگ جاب دیاد۔ یہ سوال اس کے لئے غیر متوجہ اور اہمیک تھا اور اس کا مقصد سمجھنے سے قاصر تھا۔ ”تم نے گزشتہ شب جو کچھ سنا تھا وہ ریڈیو سے نشر ہونے والا ڈراما تھا۔“

”میں جناب“ گونی نے فوراً یہ تردید کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ فلفہ ہے ان کے پاس کی ریڈیو نہیں ہے۔ اگر ریڈیو ہوتا تو روزانہ بچتا۔ گانے، ڈرامے اور دوسرے پروگرام سنائی دیتے۔ آکاش والی کے پروگرام۔“

”ان کے پاس ریڈیو ہے۔“ واس مائی پولیس افسر نے اس کی بات کانٹے ہوئے طنز پر کھنکھنا مارا۔ پھر اس نے گونی کو کسی نظروں سے گھورا جیسے وہ اسے کچا چنا جائے۔ کا ارادہ رکھتا ہو۔ ”میں ابھی اس قلیٹ سے آ رہا ہوں۔ جس کی خودوائی آنکھوں سے ان کے ہاں ریڈیو کھانا ہوا دیکھا ہے۔ جس کی آواز تیری منزل تک آتی ہے، میں چودہ برس سے پولیس کے ٹھکانے میں ملازم ہوں۔ کل کا یہ لوٹا بیٹھے سنی پڑھانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ ڈراما میرا حق ہے کام لو۔“ پہلے افسر نے اپنے ساتھی کو غصا کر کے ہونے کہا۔

”میں نے بھی آواز میں نہیں تھی جس میں“ گونی نے تکرار کے انداز میں کہا۔ ”میں نے یہ سب کچھ کھڑکی سے جھانک کر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کھڑکی سے۔“ اس کی آواز گھٹنے میں مدھمکے

ٹھیک ہے بیٹے۔! میں انا تو کہہ کر تم فلفہ نہیں کہہ رہے ہو۔“ پہلے افسر نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ”کان جو بچے سننے ہیں اسے آنکھیں دیکھ سکتی۔ تم کھڑکی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ لیکن تمہارے کانوں میں ریڈیو سے نشر ہونے والے ڈرامے کی آواز میں آ رہی تھی۔ تم نے مجھے یہ منگنکوان کے درمیان بوری ہے۔“

”رات تم کسی وقت کھڑکی سے جھانک کر نہیں

دیکھ رہے تھے۔“ اس نے غراتے ہوئے گونی سے کہا۔ وہ اس تک بڑھ کر تھا اور اسے اس بات پر غصہ لگا کہ ابھی تک اپنے جھوٹے پڑا ہوا تھا۔ اس کی غمزدگی، اپاہج برائی کی۔ لیکن اس قدر ذرا صیغہ ہے۔

”مجھے۔“ چائیں کیا وقت ہوا تھا۔ میرے پاس کھڑکی نہیں تھی اس کی رات ہونگی تھی۔ کیوں کہ ہر طرف گہری تاریکی تھی۔

”میں بتاتا ہوں کیا وقت تھا۔“ اس بزرگ کر تلخ لہجے میں کہنے لگا۔ ”وہ پروگرام رات کیادہ ہے۔ بارہ بجے تک آکاش والی سے نشر ہوتا ہے۔ چوں کہ سری لکا میں مقامی لوگ بھی آکاش والی کا یہ پروگرام بہت شوق سے سنتے ہیں۔ ہندوستانیوں کی بڑی آبادی ہے جس کے باعث یہاں کے لوگ بھی، ہندی بکھنے میں نہیں بلکہ بولتے ہیں۔ اس زبان میں ہی میڈیا تھا ہے۔ اس کا وجود سری لنگن زبان میں آکاش والی بدھ ڈراما نشر کرتا ہے۔ یہ بدھ کو پروگرام نشر ہوتا ہے۔ اس نے وقت کر کے گونی کو غوراً نظروں سے گھورا۔ پھر وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس عورت کا نام کانا تھا۔ اس نے خود مجھے بتایا کہ گزشتہ شب نشر ہونے والا ڈرامہ بہت ہی خوف ناک تھا۔ دہشت ناک اور دھمکنے کھڑے کر دینے والا۔ جس کی وجہ سے اس کے شوہر نے اس سے ایک لمحے تک بات کی نہیں کی۔ وہ خود یہ پروگرام بڑے شوق سے سنتی ہے۔ بدھ کے دن کا یہ پروگرام جس کا وہ بڑی سے بچتی ہے انتظار کرتا ہے لیکن اس کے ہٹنی کو یہ پروگرام پسند نہیں، اسے زہر لگتا ہے۔ اس نے بات میں کہا کہ اس نے اپنے شوہر کو چرانے کی غرض سے اس کی آواز بلند رکھی تھی۔“

پہلے افسر نے انہی ہونے نظروں سے گونی کی طرف دیکھا جو سر جھانکے خاموش بیٹھا تھا اور اس نے واس کی بات بڑے غور اور توجہ سے سنی تھی۔ اس افسر کی نگاہیں جیسے کہ دے رہی تھیں۔ ہاں تو بیٹے۔! اب تم کیا کہتے ہو وہ جو بولنے کی جگہ پار چکا ہے۔ اب اس نے اپنی ذلت اور مجرمت تسلیم کر لی تھی۔

اب بڑے کسی بچے کو جھوٹا تصور کرنے میں تو پھر دنیا کی ہر حالت انہیں اپنا خیال تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ وہ بہت باعیا تھا۔ اب اس کے پاس کہنے کے لئے بہت کچھ تھا لیکن اس کے کچ کا وقت دماغ کر دیا گیا تھا۔ اب کتنا افسوس کی بات۔

”اس کے علاوہ اس عورت نے مجھے یہ بھی بتایا کہ۔ اس کا بچی شیر کرنے کے لئے اسرا نہیں۔ بلکہ کھنکھنی پر زور استعمال کرتا ہے۔ اس نے مجھے سٹیڑ پر دھکی کر کہا۔ اب یہ بتاؤ کہ کھنکھنی بڑے سے کس طرح ایک انسان کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کئے جاسکتے ہیں۔؟“

میں نے اس بات کے دو بڑے ٹکڑے بھی کر کے میں رکھے ہوئے دیکھے تھے جن کے اندر لمبے پکڑے بھرے ہوئے تھے۔ فرش پر خون کا دھبہ تو کیا جینینا بھی نظر نہیں آیا۔ میں نے بڑے غور سے اور غیر محسوس انداز سے دیکھا تھا۔

پہلا افسر چپنے لگا۔ اس نے اپنے ساتھی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر خوش دلی سے بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ واس۔! ٹھیک ہے۔ گرم ہونے کی ضرورت نہیں۔ یوں مجھ کو کچھ تنہائی اور دوش ہوگی۔“ یہ دو فقرہ ہوئی۔ بسا اوقات کچھ فوراً ہو جاتا ہے۔ ہمارا شب اب اور ہمارا کام یہ کچھ ایسا ہے۔ زیادہ ذہنیات مت بنو۔“

”دوش چلت اور ہمارا زمین پر ہوتی ہے۔ کبھی چمڑ چمڑاتی کی ٹری صبا چڑھ کر دھمکھو۔“ شب چتا چلے گا اور دوش کے کہتے ہیں۔“

واس غصے سے دھج بچا تھا اور گونی کو قہر آلود نظروں سے گھورتا کرے سے ہار لگ گیا۔ باہر لٹنے اس نے بڑے زور سے دروازہ بند کیا۔ اس کا پس چٹا کو گونی کی وجہات بنا کر رکھ دیا۔

دو دہائیوں کے میں تجاہد گئے۔ پولیس افسر نے داخلی مواصلاتی آلے کا بشن دیا۔ دوسری طرف سے آواز آئی تو اس نے کہا۔

”ڈراما سیر کر لیجیے۔“

اس مرتبہ اندر داخل ہونے والا پولیس سرکاری وردی میں بیٹوں تھا۔ گویا کاچھ خوف سے چلا پڑ گیا۔ وہ سمجھا کہ اسے جھوٹ بولنے کے الزام میں گرفتار کیا جا رہا ہے۔

”اس کے کس کے گھر چھوڑ آؤ۔“ پولیس افسر نے مددگار کھینچ لیا۔ ”مجھے کچھ کر پورٹ کرنا۔“ ”نہیں۔ نہیں۔ میں خود ہی چلا جاؤں گا۔“ گونی گھبرا گیا۔ ”میں اکیلا آیا تھا اور اکیلا جا بھی سکتا ہوں۔“

اسے معلوم تھا کہ اگر وہ اس کا فٹیل کے ساتھ گیا تو اس کے ہاتھی کو سارے داتے کا علم ہو جائے گا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ جس رات سے آئے گا وہ چپ چاپ ہی رات سے وہاں پر کرائے کرے گا اور اپنے گھر آ جائے گا۔ کسی کو بھی بات نہیں چلے گا کہ وہ کہاں گیا تھا۔ کس سے واپس آیا ہے۔ اس کا راز مکمل نہ سکے گا۔

”نہیں بیٹے۔ تم گھبراؤ نہیں۔ مددگار تمہیں چھوڑے گا۔ اس طرح تم حرامت قبول کر م نہ ہو سکو گے۔“ پولیس افسر نے اپنے ہاتھ پر مددگار کے فٹیل کو ہاتھ

جانے کا اشارہ کیا اور ہر چہ جو غفارت بھرے ہوئے تھے انہیں سمٹ کر کھینچے گا۔ مددگار کا فٹیل نے تڑی لیکن مضبوطی سے گونی کا کانہا چکا اور اسے باہر چلے گا اشارہ کیا۔ گونی اس بات کا علم کر گیا کہ پولیس سے حاجت کا نتیجہ بہر خراب ہوتا ہے۔ وہ بے چنگی کا راولی کر سکتے ہیں۔ دوسرے جھگڑے چپ چاپ باہر لگ آیا۔

وہ مددگار کے حقدور دروازے سے داخل ہو کر سڑکیاں چڑھنے لگا۔ اس نے مددگار کا فٹیل کے کپڑے کے داب چلا جانے اس کا گھر آ گیا ہے۔ لیکن وہ اس کے گھر کے دروازے کے کچھ پہنچانے پر مصر تھا۔ کیوں کہ اسے اپنے افسر ہائی کو پورٹ بھی دینا پڑی۔ اسے یہ بتانا تھا کہ گھر کے دروازے پر پہنچا کر گیا ہے۔ دوسری منزل کے قلیٹ کا دروازہ کھلا اور ایک گھبراہٹ سے باہر آ کر پلے تو غور سے کا فٹیل کو دیکھا اور پھر گونی کو دیکھا۔

[illegible]

”میں نے ابھی ایک پولیس والے کو کھڑے دیکھا تھا۔“ کاتنا نے کہا۔ ”اس نے کیا حرکت کی جو آپ کے بچے کے ساتھ کیا تھا۔“

”یہ لڑکا بہت شیطان ہو گا۔ ہے، لکسی شارسن کرتا رہتا ہے۔ جنہیں معاف نہیں کیا جا سکتا۔“ چلو کوئی! ”اس کی ماں نے اسے یہی طرح سمجھوڑتے ہوئے کہا۔ ”میں کیا کہہ رہی ہوں نے سنا نہیں۔“ چلو

”گنتا بیار، عرصہ اور سہ ماہی چھ نظر آتا ہے۔ کیا شرارت کر دی؟“ گنتا نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

”شرارت؟؟؟ اسے شرارت کہیں گے۔۔۔؟“

پہلے یہ جھوٹی گمانیں گھڑتا ہے۔ پھر انہیں دھڑوں سے منسوب کر کے ہمیں بناتا ہے۔ اس کا رد عمل دیکھئے اور اس کا جان لینے کے لئے۔ لیکن اب یہ حرکت کی ہے جو ناقابلِ برداشت ہوگی۔ اس پر اب یہ دھڑوں کے لئے بھی خطرہ بن گیا۔ گنتا نے اس پر ہاتھ پھیرا اور

آج سے اس نے ایک نئی حرکت کی ہے۔ وہ پولیس کو پریشان کرنے لگا ہے اس نے انہیں جا کر جھوٹی کہانیاں سنائی ہیں۔ پولیس افسر کوئی شریف آدمی تھا۔ اس نے صیحت کر کے اور سمجھا کر فیملی کے ہاتھ دیج دیا۔ یہ زیادہ

عورت کی نگاہیں گولی کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ بے خیال نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔ پھر اس کے ہانک کو بلکا جھٹکا۔ اس نے بہت زور سے گولی کو دیکھا۔ ان آنکھوں میں شک کی کیفیت ختم ہوئی تھی۔ وہاں یقین کی قوت جبکہ رعبی تھی..... وہ شاید اپنے پسلیں آفیدہ مکمل کے بارے میں سوچ رہی تھی جو کہ شیشہ باریک اس کی خواب گاہ کی کفر کی بار بار ہر سوسہ کا تھا۔

چسپی نہیں ہے۔ اسے وہ کوئی نیم پاگل سا لگا تھا۔ اس کی ہر بات اور آواز خطرناک سا محسوس ہوا تھا۔

کوئی کوجورت کی سر نظر میں اپنے بدن میں تھمتی محسوس ہو رہی تھیں۔ تیز اور نوکلی سونیل کی طرح..... وہ نظر سے اتار دے تو کمرے کی بنڈو کا گودا جھٹکے گا اور پھر

اے ایسا کہ تھا کہ اس عورت کی نظر جیسے اس کے آ رہا
دیکھ رہی ہوں۔ اور اس نے یہ بات بھی محسوس کی تھی کہ
وہ عورت جیسے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے
ہوئے ہو۔ اسے کسی بات کا ذور اور خوف نہیں ہے۔
جیسے سنگین جزم کا۔ کیا قاتل اس قدر پر سکون ہوتے
ہیں۔ ان کا خمیر نہیں ہوتا ہے۔ وہ قانون اور سگوانوں سے
بھی نہیں ڈرتے ہیں؟ کیا یہ وحشی ذمہ دار ہوتے
ہیں۔؟ انسان کو قتل کرنے کے بعد جرم بدل جاتا ہے
ہیں؟ اس کا خدا کو بدل جاتا ہے اور قاتل۔

پھر اس عورت کے سر کی سے تشوے ہوئے
ہوٹ مکرانے۔ لیکن آنکھیں وہڑوں کا ساتھ نہیں دے
رہی تھیں۔ وہ تو کوئی بچی ہوئی تھیں۔ وہ موت کی طرح
تاریک سرد اور گہری گھس اور اس کا چہرہ اس طرح پڑھ
رہی تھی جیسے وہ کتب ہو۔
”کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس عمر کے لڑکے
بہشت ایسی خریدیں کرتے ہیں۔ کیوں کہ بچی ضرور کچے
ذہن کے ہوتے ہیں۔“ اس نے کوئی کچے سر کی طرف
ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا
جاتی تھی اور ساتھ ساتھ اس کی پشت بھی تھپ تھپاتا جاتی
تھی۔ کوئی گویا لاکہ پر ہاتھ انسانی خون سے رنگہ ہوا اور
کسی زہریلے سانپ کی طرح ہے جو اسے ڈس لیتا جاتا
ہے۔ کوئی ایک منٹ کے پیچھے پھٹ گیا۔ اس کا چہرہ سپید
پڑا ہوا تھا۔ آنکھیں دہشت سے کھلی ہوئی تھیں۔

عورت کا ہاتھ جڑا ہوا تھا وہ کسی ٹوٹی ہوئی شاخ
کی طرح گر گیا۔ اسے اپنی سبکی کا احساس ہوا۔ وہ اپنی
جھینٹ مٹانے کے لیے پلٹ کر دایاں بھل دی۔ لیکن اب
اس کا رخ نیچے نہیں تھا۔ وہ دایاں اوپر اپنے قلیٹ میں
جاری تھی۔
”جھولنے کی عادت بہت بری ہے۔“ وہ بلند آواز
سے بڑبڑاتی جاری تھی۔ ”مجھے جو خلع پڑا کہ کتا قواد ہو
میں لانا ہی بھول گئی۔“
کوئی نے اس عورت کی یہ بڑبڑا ہٹ سنی۔۔۔۔۔
اس کی ماں نے بھی سنی۔۔۔۔۔ اس کی ماں سرکاری۔۔۔۔۔
پانچ۔۔۔۔۔ قانون اس کی گواہی کو تسلیم کرے گا۔۔۔۔۔

وہ دھڑکیوں پر اس معاملے کی اطلاع اپنے شوہر کو
دینا چاہتی تھی۔ جس نے تو زبردستی قانون کے درپے
دینا چاہا۔ اس کی کوئی فکر نہ تھی۔ وہ اپنے شوہر سے یہ بھی
کہنا چاہتی تھی کہ چشیں کھینے بھی نہیں گزرو۔ بلکہ
اس کے اندام انداس کا جزم مہیاں ہو گیا۔
وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر یہ خبر اپنے شوہر تک
پہنچانا چاہتی تھی کہ اس واردات کا ایک نئی حکم کواد ہے۔
مینی گاہ۔۔۔۔۔ اس کے سامنے بدن میں لہو خشک
ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ ایک بار میں کا ٹوکر لڑکا ہوا تو کیا ہوا۔
پانچ۔۔۔۔۔ قانون اس کی گواہی کو تسلیم کرے گا۔۔۔۔۔

کے یا نہ کرے۔؟ لیکن سانپ کا بچہ سنبھلا ہوا
ہے۔ اس سنبھلے کا سر کھل دینا چاہئے۔ اس لئے کہ وہ
پر ملا ہے۔ ڈس سکتا ہے۔ اس لئے وہ جتنا جلد ہو سکے
جو ہرے راہبہ کے اس صورت حال سے آگاہ نہ
جانتی کی وہ دھڑکیوں پر اسے قتل کرنے کا کوئی منصوبہ
کھین۔۔۔۔۔ کو کراس سنبھلے کے والدین اور پولیس نے
اس کی بات سن لی اور جو کہانی سنائی اس کا یقین نہیں کیا۔
اس موڈی کو ایک گھنڈی میں زندہ رہنے یا موت کو دھوک
دینے کے خلاف ہے۔

گوئی کی بات کا علم تھا کہ جب تک وہ زندہ
ہے وہ عورت اور اس کا شوہر خود کو کسی محفوظ نہیں سمجھیں
گے۔ وہ دس برس کی عمر سے قلیٹیں دیکھا آ رہا تھا۔ اسے
روانی نظروں کے مقابلے میں انگریزی کی جاسوسی قلیٹیں
بہت پسند تھیں۔ ہار قلیٹیں بھی شوق سے دیکھتا تھا۔ اسے
بند دھڑکی اور اسے ملک کی قلیٹیں پسند نہیں آتی تھیں۔
جب کہ اس کے گلوں بند دھڑکی قلیٹیں بڑے ذوق و شوق
سے دیکھتے تھے۔ اس کے ذہن کی وجہ یہ تھی کہ ان قلیٹوں
کی کہانی یکساں۔ بات اور ڈس ہوتی تھی۔ لہذا
لے بہت متاثر اور ڈس ہوتے تھے۔ جب کہ انگریزی کی
قلیٹوں کی کہانیوں میں جاپان ہوتا تھا۔ خصوصاً جاسوسی اور
ہار قلیٹیں اس لئے پسند آتی تھیں ان میں ایک جاپان اور
سپیس ہوتا تھا۔ جاسوسی قلیٹوں سے اس نے بہت سارا
قانون اور بہت ساری باتیں جان لی تھیں اس کی طبیعت
سے اس کی عمر سے پانچ سات برس بڑے دوست حاشر
تھے۔ اسے استاد کہتے تھے۔ اس نے بہت سی جاسوسی
قلیٹوں میں دیکھا تھا کہ جرم اپنے قتل کا جواز مٹانے کے
لئے سب سے پہلے جرم دیکھ کر کوئل کو قتل کر دیتے تھے کہ نہ
رہے۔ سب سے نیچے بارسری۔۔۔۔۔ وہ کسی پتھر میں کھائے
تھے۔ چاہے وہ دو ٹوکر لڑکا ہو۔ عورت اور مرد ہی کیوں نہ ہو۔
کیوں کہ جرم یہ گواہ کے زندہ رہنے سے ان کا جرم چھپا
نہیں رہ سکتا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے خلاف
بیان دینے والا زندہ رہے۔ کسی قلیٹوں میں کواد جرموں کی
گرفت سے بچ گئے تھے اور عدالت میں ان کی گواہی سے

جہازوں کو کھاتے کے سرائے موت کی تھی۔
مختول سے اس کا کوئی رشتہ اور سہلہ نہ تھا۔
صرف ایک انسانی رشتہ تھا۔ اسے یہ گناہ گنایا گیا تھا۔
اس لئے وہ جہازوں کو کیڑے کراد تک پہنچا کر گناہ لہا جاتا
تھا۔ لیکن کوئی اس کی بات مانتا اور اس پر یقین کرنے کو تیار
نہ تھا۔
بڑوں اس کی نظروں سے ابھل ہو گئی تو اس کی
ماں کا rauh یک ہی سر بدل گیا۔ اس نے کوئی کی
کلائی پکڑی اور اسے کسی کی نوکر کی طرح بے رحمی سے سختی
ہوئی اندر لے گئی۔ باہر کا دروازہ بند کر دیا۔
”ہاں۔۔۔۔۔! تم نے کیا کیا کیا۔ کیا کر دیا
ماں۔۔۔۔۔! کوئی نے کہا۔“ اب اسے سلوم ہو گیا کہ سب
سب کچھ بچ چل گیا ہے۔
اس کی ماں نے اسے کمرے میں رکھ لیا دیا اور
خواب گاہ سے جانی لینے چلی گئی جو اس کے شوہر کے کچے
کے پیچھے رہی ہوئی تھی۔ مجبورہ اور کربوئی۔۔۔۔۔ پہلے بارادہ
تھا کہ کمرے جانی لینے کے لیے نہیں آؤ زار کے جاؤں۔۔۔۔۔ اس
نے کمرے کا دروازہ قفل کرنے سے پہلے کہا۔ ”لیکن
اب تمہیں رات تک یہیں رہنا پڑے گا۔ تمہارے پانی
ہی دروازہ کھولیں گے۔“

کوئی نے اپنی ماں کا کوئی جملہ نہیں سنا۔ اس کا
ذہن گول دائرے میں بیوی تیزی سے گھوم رہا تھا۔ وہ
خوف نہ دے لہجے میں بولا۔
”اب تمہیں رات بھر مل گیا ہے۔۔۔۔۔ اب وہ مجھے کسی
قیمت بڑے دھڑکیں چھوڑیں گے۔
چھوڑوں گے۔ بعد اسے قلیٹ کا دروازہ کھلے اور بند
ہونے کی بات نہ کر دی۔ اس کی ماں کا کام یہ چلنی تھی۔
اب وہ قلیٹ میں اپنے پانی کے ساتھ تھارہ گیا تھا۔ ان
کے خزانے لینے کی آواز اسے اپنے کمرے میں بھی سنائی
دے دی تھی۔ وہ چپ چاپ بستر پر دروازہ پر صورت حال
کا جائزہ لے رہا۔ اس نے بھی کہ خضر کے کھٹی تکی تک
تھی۔
جب تک اس کے پانی قلیٹ میں موجود تھے وہ

مجرموں کی دست برد سے محفوظ تھا۔ اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لیکن جب شام گئی کہ چٹائی بچا بیٹھی پر چلے جائیں گے تو حقیقی خطرہ لاحق، جب اس کی ماں کھانا کھا کر سوجائے گی۔ اب اسے سوچنا تھا کہ رات اسے کیا کرنا ہوگا۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر اس نے دوبارہ ہنگامی بنے بیٹوں کے ذریعے کرے سے فرار ہونے کی کوشش کی۔

☆ ☆ ☆

مجرموں کا چٹا ہوا دن ڈھلنے لگا۔ سورج مغرب کی وادی کی طرف چھٹکے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ گوپی پر خوف و ہراس پڑا تھا۔ اس پر ایسا دشت مسللا ہوئی تھی کہ اس احساس سے لٹنے کی ایسا کوئی صورت اور کوئی تدبیر نظر نہیں آتی تھی جس سے خود پر قابو پاسکے رات ہونے والی تھی۔ رات اس کی دشمنی، ایک مغربہ تھی۔ اس کا قتل کی طرح جس نے ایک ایسا کارخانہ کیا تھا۔ اس کی بے بسی کی حالت یہ تھی کہ کسی سے کسی مدد طلب نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی ماں اسے جوڑا بھیجتی تھی۔ اس کے چٹائی بھی ماں سے بڑھ کر جوڑا جانتے تھے۔ یہاں تک کہ پولیس نے بھی اس کی کئی بات کا یقین نہیں کیا تھا۔ جب کراسے اجتماع تھا کہ پولیس اس کی بات پر یقین کرے کہ کارروائی کرے گی۔ لیکن پولیس اسٹیشن چٹائی کی جنگ ہار گیا تھا۔ جب اس کے والدین اسے سمجھا تبھرے تھے تو کسی غیر سے کیا توقع تھی جانتی تھی کہ وہ اس کی بات پر یقین کرے گا۔ پولیس کارروائی اس کے سامنے تھا۔ وہ کسی طرح اس طرح بے ہوش ہو گیا تھا۔ جس نے اس کی ماں کی جان خطرے میں ڈال دی تھی۔ موت کا فرشتہ بھیجے اس کے سامنے کھڑا اقبہ لگا رہا تھا۔

کیا پولیس کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ بے گناہوں کی حفاظت کرے اور مجرموں کو گرفتار کرے؟ مگر جب پولیس ہی وہ دکر ہے جو تیار ہو کر ہونے لگا کر سکتا ہے۔ اس طرح سفاک اور درندہ صفت قاتلوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ کیا اسے خود کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا چاہئے؟ مرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے؟

اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔ وہ کسی بھی طرح وہ بڑے آدمیوں کا چٹائی لکھیں کرنا جو ہر قیمت پر اسے قتل کرنے کی کوشش کریں گے۔ گوپی کے دل کے کسی کوئی میں بڑی شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ مجرم اسے قتل کر دیں۔ اسے جان سے مار دیں تاکہ ساری دنیا۔ اس کی ماں کو۔ اس کے چٹائی کو۔ پولیس کو۔ سب کو چٹا چل جائے کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ وہ سچا تھا۔ وہ سچ کی جگہ لڑ رہا تھا۔ اور میر سب غلطی کی طرح کھڑا بیٹا، مار مار کر دیکھیں گے۔ پھر اس کی آتما یہ سب کچھ دیکھے گی کہ۔ وہ لوگ کہیں کے کہیں نے گوپی کو قتل کیا ہے۔ اگر کوئی اس کی بات کا یقین کر لیتے قتل کے مجرم کی طرف تیار ہو جائے۔ گوپاں زندہ رہا تھا۔ گوپی عظیم انسان تھا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اصرار ہو گیا۔ اس نے بچ بولنے کی خاطر اپنی جتنی جان کی ہیئت چڑھا دی۔ لیکن اس نے جھوٹ نہیں بولا۔ سچائی کے دے سے بڑا ہوا تھا۔

اس کی ماں تو یہ سمجھ اور دکھ برداشت نہ کر سکے گی۔ وہ مر جانے کی خودکشی کر لے گی۔ کیوں کہ وہ اسے بے انتہا جانتی ہے۔ وہ اگلی نوازا جوتا۔ ماں کو لڑنے سے بید ہوتا ہے۔ وہ اس کے مستقبل کی خاطر قزاقانہ ذرا کر رہی گی۔ ایک شخص کو یہ مرنا ہی نہیں سمجھ کر تھی جتنی سے اپنی اگلی تعلیم پر خرچ کرے۔ وہ اسے ڈاکٹر بنانا جانتی ہے جس پر بہت خرچ آتا ہے۔ اگر اس کی ماں اس کی عدالتی کا ٹھہر نہ سکی اور مر گئی تو۔ ماں کی موت کے خیال سے اس کی آنکھوں میں آنسو آئے۔ وہ بہت دیر تک سکھیں گے کہ وہ تیار۔ وہ زندگی میں بھی کئی بات پر اتنا رو پائیں تھا۔

جب دن ڈوب گیا اور اندھیرا چھل گیا۔ اب اس کی ماں کام سے واپس آ گئی۔ کپڑے بدل کر باہر چلی خانے میں رات کا کھانا تیار کرنے لگی۔ پھر اس نے آواز دے کر اس کے چٹائی کو بلایا۔ وہ ڈیوٹی پر جانے کی تیار بن کر اسے کہا۔ جب کھانا تیار ہو گیا میر بچن دیا گیا اب اس نے نقل میں چٹائی گھونٹنے کی آواز دی۔ جب

روادہ کھلا تو وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چٹائی نے اسے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ "سب تو تم آئندہ کسی بھی جھوٹ نہیں بولو گے؟" انہوں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

گوپی نے بڑی غماز برداری سے سر ہلایا۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ "چلو۔۔۔ چل کر کھانا کھاؤ۔ اس کے چٹائی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

پھر وہ تینوں کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔ گوپی کو بڑے زور کی جھوک لگ رہی تھی۔ کیوں کہ وہ صبح سے جھوکا تھا۔ وہ غیر محسوس اعزاز سے کھانے پر ٹوٹ پڑا تھا۔ کھانا کھاتے وقت اسے بار بار کچ کے دانتے کا خیال آ رہا تھا۔ وہ دل میں ڈوب رہا تھا کہ اس کی ماں اس کا ذکر نہ کر دے۔ لیکن جب ان کے درمیان بری باتوں کا سلسلہ چل پڑا تو اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ کھانا کھا چکا اب اس کی ماں سے بے دردی میں ایک ایسا فقرہ نکل گیا جس نے مہا غرا پھوڑ دیا۔ کئی باتیں اس کی ماں نے کہا تھا کہ وہ سن کبھی میں ملازم ہے آج اس کے منہ پر نے دیر سے آنے پر توجہ دینی سے باز نہیں کی تھی۔ "کیوں؟" انہیں دیر سے لے ہوئی۔ "اس کے چٹائی نے اس کی ماں سے حیرت سے کہا۔ "تم تو وقت پر تیار ہو گئی تھیں؟"

میں تو تیار ہوئی تھی۔ جہاں جانے کے بعد نفی تو زیادہ سے زیادہ ہمیں سن میں کسی تاخیر ہو جاتی۔ اتنی تاخیر پر غیبر کچ نہیں کہا۔ لیکن بڑے کھنے کی جوتانہ ہوئی اس نے ٹیچر کو ہم کو دیا تھا۔ اس نے بتایا۔ "بڑے کھنے کی تاخیر۔؟ وہ کس نے؟" اس کے چٹائی بولے۔ "میرا خیال ہے کہ تم بھی اتنی دیر سے فخر نہیں بنیں۔؟"

"ہاں۔ کیا کرتی۔۔۔ اس کا ٹیشل سے گفتگو کرنے میں جتن ہیں۔۔۔ اس کا ٹیشل سے گفتگو رادوا چاک خاموش ہو گئی۔ کیوں کہ اسے اپنی نقلی کا احساس ہو گیا تھا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ

ہو چکی تھی۔ کمان سے نکلا تیرا ہی نہیں آسکتا تھا۔ گوپی جانتا تھا کہ اس کی ماں کسی جھوٹ نہیں بولتی ہے۔ اس لئے اب اس کے چٹائی کو بچہ نہ چٹا جانے گا۔ "گوپاں کا ٹیشل۔۔۔ اس کے چٹائی نے ایک دم سے چونک کر اس کی ماں کی شکل دیکھی۔ پھر وہ تیز لہجے میں بولے۔ "وہ کس لئے یہاں آیا تھا؟" پولیس کا یہاں کا تھا۔؟"

تیس کی ماں کو کھدوے پہلے دیکھیں سے ساری باتیں گئی پڑی۔ پھر اس کے چٹائی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ انہوں نے اس کا بیان پڑ کر ایک جھگے سے اس کو کھڑا کر دیا۔ "ٹیشل بلیز۔" رادوا نے اپنی ہاتھی نظروں سے دیکھے ہوئے کہا۔ "اسے کھانا تو کھانے دو۔ اس نے دوپہر سے کچ نہیں کھایا ہے۔"

"آج صبح ہی تو میں نے تمہاری دھناتی کی تھی۔ آج تم کتنی زامیر ہے ہاتھ سے بندے۔ ایسا لگتا ہے کہ تمہیں پٹنے کا بہت شوق ہو رہا ہے۔ اس کے چٹائی آجے سے باہر ہوئے تھے۔ "تم اس قدر ڈھیسٹ ہو۔ بے شرم ہو گئے ہو۔"

وہ اسے اس طرح کر کے کی طرف گھٹینے لگے پیسے وہ کوئی جانور ہو۔ پھر انہوں نے اسے چھوڑ کر آستینیں چڑھائیں۔ اس وقت صفی کی حالت میں انہیں خیال نہیں رہا کہ کسی نے دروازہ پر دھک دی ہے۔ جب انہوں نے اسے دوبا دیا پکڑا تو دوسری دھک ہوئی۔ انہوں نے گری کی چھوڑ دیا اور دروازے کی طرف بڑھے۔ ان کا خیال تھا کہ بڑی کو پی کی شکایت کرنے آئے یا ہوگا۔ وہ دل میں کل ہو گئے تھے۔ جب وہ چھوٹ کے بعد واپس آئے تو ان کا چہرہ سوا لہر نشان بنا ہوا تھا۔ "نیک بلی گرام آیا ہے؟" اس کے چٹائی نے اس کی ماں سے کہا۔

"نیک گرام۔؟" نیک بلی گرام؟ کیا آپ کے نام آیا ہے؟

”میرے نہیں تھہرے نام۔“ انہوں نے سنا
گرام اس کی طرف بڑھا دیا۔

”میرے نام۔“ ایک لمحہ کے لئے رادھا کا چہرہ
زرد پڑ گیا۔ ”اوکھو کھو۔“ خیر تھے ہوتے۔

پھر رادھا نے کانٹے کی بوٹی اٹھیں سے لغافہ چھاڑا
اور اندر سے ٹٹلی گرام نکال کر جلدی جلدی اس پر نظر ڈالی،
پھر اس کا چہرہ مضطرب بنا چلا گیا۔ جیسے کوئی بڑی خبر آئی ہو۔

”کیا ہے؟“ چلتی ہوئی۔ ”یہ کیس کا ٹٹلی
گرام ہے؟ خیر تھے تو؟“

”خیر تھے ہی نہیں ہے۔“ رادھا نے پریشان کن
لبے میں جواب دیا۔ ”تم آئی لو گا ٹٹلی گرام۔“ مجھے فوراً

بلایا ہے۔ انہوں نے اس کی کوئی وجہ نہیں کہی ہے۔ انہوں
نے لکھا ہے کہ ٹٹلی گرام ملے ہی فوراً روانہ ہو جاؤ۔“

اداس کی خال خال ہتھکا جاتا تھے میں رتی نہیں۔
”معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری بہن کے دونوں بچے

ایک ساتھ شدید بیمار ہو گئے ہیں۔“ اس کے چاتی نے فوراً
تبصرہ کیا۔ ”کل رات ایک دوا سر پور سے ملک میں بھیجا ہوا

ہے جو بچوں کا اپنی لپٹ میں لے رہا ہے۔“
”میرے خیال میں وہ خود بیمار ہو گئے۔“ گوبلی

کی ماں نے گھبرائے ہوئے لبے میں کہا۔ ”بچے بیمار
ہونے سے وہ ڈھکی چھپی نہیں۔“ کاش اس کے ہاں ٹٹلی فون

ہوتا۔ اس کے پردوس میں بھی تو کسی کے ہاں فون نہیں
ہے۔ ورنہ تو گھر کا گروں کر کے معلوم کر لیتی کہ اس نے

کیوں اور کس لئے فوراً بلایا ہے۔“
پھر اس کی ماں فوراً جانے کے لئے تیاریاں کرنے

لگی۔
”مت جاؤ گا۔“ پلینز مت جاؤ۔“ گوبلی نے

دھشت زدہ ہوا سا کھائی۔ ”یہاں لوگوں کی چال ہے۔“
”کیسی چال۔“ اس کی ماں نے اسے خیر

نظروں سے گھورا۔ ”یہ ٹٹلی گرام بکھر ہے ہو؟“
”وہ آپ کو یہاں سے ہٹانا چاہتے ہیں تاکہ میں

گھر میں اکیلہ رہ جاؤں۔“ گوبلی نے زبردستی جاسوسی نظروں
کی کانیاں یاد آئیں۔ قاتل ایسے ہی حربے استعمال

کرتے تھے۔ ”پھر وہ مجھے جان سے مار دیں۔“ ٹٹ
کر دیں۔“ رک جاؤ گا۔“ بھنگوان کے لئے نہ جاؤ۔

”آپ کی بچی کون ہوتی۔“
”خاموش۔“ اپنی بکواس بند کر دو۔“ اس کے چتا

جی کرخت لبے میں بولے۔ ”یہ تم کسی جاسوسی کی طرح
بات کر رہے ہو۔ تمہارا دماغ تو میں ابھی درست کرتا

ہوں۔“ پھر وہ رادھا کی طرف گھوم کر بولے۔ ”رادھا اس
کی بات پر کان نہ دھرو۔ تم تیار ہی کرو۔ تمہیں وہاں پہنچنے

میں آدھی رات ہو جائے گی۔ آخری بس جانے میں ابھی
وقت ہے۔ جلدی سے کس زینٹل پہنچو۔“

”گوبلی۔“ مجھے جانے سے روک رہا ہے۔ اس
کا کیا کریں۔؟ کیا اسے رات گھر پر اکیلا چھوڑ دیں؟“

رادھا نے فکر مند سی کہا۔
”تم اس کی جتنا نہ کرو۔“ اس کے چاتی نے اس

کی ماں کو بلا سا دیا۔ ”مجھے چند کپڑے اور تھوڑے سا سود
میں کمزری بند کروں گا پھر دیکھا ہوں یہ کیسے لکھا ہے

کھڑکی سے۔“ تم آ کر چلو گوبلی! انہوں نے ٹھکانا لے
لیا تھا۔

اس کے چاتی نے ٹٹلی بڑ کر کھڑکی بند کر دی۔
اب گوبلی کو کھڑکی نہیں کھول سکتا تھا۔ پھر وہ اس سے طنز

لبے میں بولے۔
”اب تم اپنی رام کھانی دیواروں کو کھڑے لے لے

کر سنا تے رہنا۔“ ان کے ساتھ جتنی بکواس کر سکتے ہو
کرتے رہتا۔ یہ سن لیں گے پھر کچھ نہیں کہیں گے۔

جب تھک جاؤ گے تو پھر سو جانا۔ بہت اچھی نیند آ جائے
گی۔“

اس کی ماں نے آنسو پیٹتے ہوئے بڑی محبت سے
اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر وہ رندہ ہوئی آ آواز میں

بولی۔
”گوبلی۔“ میرے لال۔“ بھنگوان کے لئے

اپنی یہ کرتیں چھوڑ دو۔ اب تم بڑے ہو رہے ہو۔“
پھر رادھا نے اس کے ہاتھ اور رخسار پر بوسہ بشت

کیا۔ پھر باہر تیزی سے اٹھا اور نکل گئی۔

اب اس کا ایک بھاندرہ کیا وہ اس کے چاتی تھے
لیکن اس وقت وہ اس کے ٹٹن سے ہوئے تھے۔

”چاتی۔“ پلینز۔“ مجھے اکیلا نہ چھوڑیں۔ وہ
قاتل ہیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے ایک انسان کی جان

لی ہے۔ انہوں نے ایک چھوٹا ٹٹلی گرام کھینچ کر کورا تے
ہے ہٹایا ہے۔ تاکہ گھر کا صرف وہ بچے ہر ملک کو لے

دیں کہ وہ چھوٹا ٹٹلی گرام فوراً ہی بچہ۔ بچہ دیں گے۔ یہ
آپ مجھے ساتھ لے جائیں۔ میں یہاں اکیلا نہیں رہوں

گا۔ میں دھدہ کرتا ہوں کہ آپ کو ہانکل نہیں کریں
گا۔ ماں کو بھی ذرا پریشان نہیں کریں گا۔ آپ میری بات

کا یقین کریں۔“
”یہ تمہارے دماغ سے بخوس نہیں نکلا۔ یہ

جاسوسی نظموں میں، کانپوں میں جوئے ٹٹلی گراموں کے
بارے میں بتایا جاتا ہے۔“ وہ بکھر کر برسی سے بولی۔

”ٹٹیک ہے۔“ ٹٹلی فون سے آ کر ٹھکانا کرنے کے لئے
جھپٹیں جو کچھ دین گا۔ پھر تمہیں کس ڈاکٹر کے پاس لے

جاؤ گا۔ یہ نا اہل تم یہاں آرام کرو۔ میں کام پر جا رہا
ہوں۔ میرا وقت ہو رہا ہے۔“

انہوں نے کمرے سے باہر نکل کر دروازہ بند
کر دیا۔

”چاتی۔“ چاتی۔“ دروازہ بند نہ کریں۔
پلینز۔“ میری بات سنیں۔ وہ مجھے دارا نہیں گے۔

دروازہ بند ہو جائے گا تو میں اس سے کیسے اپنی جان بچاؤں
گا۔ پلینز نہ چاتی۔ آپ میری بات سننے کیوں نہیں

ہیں کہیں نہیں ہیں؟“
اس نے دروازہ سے کالو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس

کی چاتی کی قوت کے آگے ایک نہ چلی۔ انہوں نے
دروازہ بند کر دیا۔ پھر دوسرے لئے گوبلی کو نکل میں چلائی

گھونٹنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے بڑی حسرت بھری
نظروں سے دروازہ سے دیکھا۔

”گوبلی۔“ تمہیں آواز نہیں چھوڑا جا سکتا۔
کیوں کہ تم اپنی حرکتوں سے انڈین آؤ گے کہ تم پھر دوسرا

نہیں کیا جا سکتا۔ میں جانتا۔“ ہوں تم پھر پولیس آئیں

چلے جاؤ گے۔ پھر میں خرمندگی اٹھائی پڑے گی۔ تمہیں
خوش ہونا چاہئے کہ یہاں بند کر کے جا رہا ہوں۔ اس

طرح پر قاتلوں کے ہاتھوں سے محفوظ رہو گے۔ تم پر کوئی
آگ نہیں آئے گی۔“

گوبلی نے اہانتا دروازے سے لگ دیا۔ پھر اس
نے دروازے سے لبے میں اپنے چاتی کو مخاطب کرتے

ہوئے بولا۔
”چاتی۔“ اگر آپ مجھے بند کرنا چاہتے

ہیں تو کیا کریں کہ آپ چاہی بھی اپنے ساتھ لے
جائیں۔ اسے دروازے میں شہت لگا رہے ہیں۔ ورنہ وہ

دروازہ کھول کر اندر گھس آئیں گے۔ پھر مجھے بڑی آسانی
سے مار ڈالیں۔ مجھ پر کیا کریں چاتی۔“

”تمہیں۔“ اسے دروازے سے ہی سنی گئی رہے گی۔
میں اسے ساتھ اس لئے نہیں لے جا سکتا کیوں کہ وہ کہیں

گھسکے ہو سکتی ہے۔ پھر حرکت پریشانی ہوگی۔ اس
کے چاتی بولے۔ ”زیادہ سوچ کر دماغ خراب مت

کرو۔“
گوبلی دھشت زدہ ہو کر بری طرح دروازہ پیٹنے

لگا۔ ”چاتی۔“ چاتی۔“ واہل آ جا میں۔ میں
اعتراف کرتا ہوں کہ میں جھوٹ بول رہا تھا۔ مجھے اکیلا

مت چھوڑیں چاتی۔“ اور دوسرے اور گڑبڑ لگا۔
”ٹٹیک ہے۔“ اب جھوٹ کے موضوع پر

کل بات ہوئی۔ مجھے دیر ہو رہی ہے میں جا رہا ہوں۔“
اس کے چاتی نے جواب دیا۔ گوبلی دیوانہ وار دروازہ

پیٹتا ہوا پچھتا رہا۔ اسے اپنے قلیق کے باہر کا دروازہ
کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ دوسرے لئے

سکوت طاری ہو گیا۔ وہ تمہارہ کیا تھا۔ اس عفریت کا
مقابلہ کرنے کے لئے جو دو انسانوں کی شکل میں تھی۔ یہ

عفریت جھوٹ کا فرشتہ تھی۔
اب اس سچ دیکھا کہ کوئی فائدہ نہیں تھا۔ حاصل

نہیں تھا۔ اس کے چاتی اپنے سینے میں پھردل نے چل
دیتے تھے۔ اب وہ جگہ سے پہلے نہیں آئے تھے۔ وہ

خاموش ہو گیا۔ اس نے بھی اس کا چیتنا چلانا اسے نقصان

بالکل محفوظ رہا۔ اسے لباس کے پھٹ جانے کی فکر نہ رہی۔
اسے اپنی جان کی پروا بھی جو بچ گئی تھی۔

[illegible]

گوپی کرتا ہوا..... سنبھلتا ہوا اور پھسلتا ہوا آہنی

میں نے اس پر تڑپا چلا گیا۔ دو سالانہ میں تین چوتھے بھی آئے لیکن وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں دکھا۔ اس نے پلنگ کے اوپر چینی دیکھا تھا اس نے کہہ کر کوئی خطرہ مول لینے اور قاتل کو گھر کی مہلت بھی دینے نہیں چاہتا تھا۔ جب وہ چلا گیا کہ کر مرنے پر کھڑا اور اس کا سانس اس کے منہ سے پھول رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کے پیچھے سے چڑھ گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس کا سامنے کسی سڑک پر تھکے ہوئے ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس نے کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ اس کے گوبی دیوار کا کھانا کے گراپہ رہا تھا۔ اس کا سر بھی گھبراہٹا۔ وہ جتنی موت سے بال بال بچ گیا تھا اسے دھوکا دیا۔

ایک لمحے کے بعد جب اس کے حواس قوہ سے تلوگوں نے آئے اور سانس درست ہوا تو کانوں کو بچنے والی سلیب سناٹ ختم ہوئی۔ سانسوں کی آمد و رفت میں اتوار پیدا ہوا تو اس نے اپنے گرد نظر ڈالی۔ سلیب تاریک اور سنسان تھی۔ گویا اس کئی کے بچے بچے سے واقف تھا۔ اس نے تاریکی میں اس کے لئے پریشانی کا باعث نہیں سمجھی۔ لیکن اس سناٹا نہیں آیا۔ وہ انسانوں کے جھجھ میں اٹھ جاتا تھا مگر خود کو دھروں کے درمیان واقعی محفوظ محسوس کرے۔ جہاں کبھی بھی اس کا کچھ کاغذ نہ تھے۔

چاہتا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ جان کی بازی جیت لے گا۔
 وہ دوسری سے ایک موٹر پر سوار اس نے سامنے پہنچ گئی تھی۔
 سرک پر نظر ڈالی۔ سرک کا دفتر تک سننا تھا۔ اسے
 دوسروں کے قریب بڑا کرک ڈالنے کے چھپا چھپا ڈرامہ ایک
 تجربہ تھا۔ ہونے کو تھا۔ اس نے دوسرے کے سب
 پہلے کچھ اڑھو سے والے کرک انہیں خالی کر دیں گے۔ اس
 سے پہلے انہیں نہیں نہیں کیا جاتا تھا۔ قدموں کی چاپ

قرب سے قرب ہوئی جارہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ کبھی بھی وقت قاتل اس کی مرض کا کارکندہ کر سکتے ہیں اور اسے دلوچے والا ہے۔ اور مرو کے ساتھ محبت کے قدوس کی چاپ بچھے ہوئی جارہی تھی جس سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ یہی طرح تھک چکی ہے اور کبھی بھی لمبے وہ دوڑنا بند کر کے رک جائے گی۔ لیکن مرد دوڑنے سے لگ رہا تھا کہ تازہ دم ہے۔۔۔۔۔ اور اسے ہر قیمت پر پکڑنے پر

مظلوم تھا۔ کیوں کر وہ قاتل کی موت تھا۔ وہ زندہ رہا تو
قاتل غصہ دار پر چڑھ جائے گا۔

گوپی نے نیک باہری دوڑتے دوڑتے کسی
خیال کے زیر اثر مزے دیکھا۔ اس کے اور قاتل کے
درمیان یہ مشکل چھٹ کا فاصلہ گیا تھانے اور احاصہ
تھور کیا جا سکتا تھا۔ کیوں کر قاتل نے اسے پکڑنے کے
لئے ایک تھمے ہوئے حاکم اور احاصہ حاکم کو پال دیا۔

احسان ہو گیا چاروں نے ہندوستان میں اس کی تعریف کی۔
کار کا پڑ لیں گی۔ موت کا پتی پیچہ رے کے لئے اسے دے دیں
پس اسے فاطمہ کی اس افتادہ کرنا تھا۔ اس کے کار کوئی نے
زور کیا کہ گرفتار اور جانے۔ یہ بہت مشکل گہر
تھا کہ اس کی توانائی کھٹ رہی تھی۔ وہ اسے
زیادہ نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے لئے موجودہ رفتار
برقرار رکھنا بھی مشکل ثابت ہو رہا تھا۔
کوڑے کے آہنی ڈوم تعداد میں کل چار عدد
تھے۔ ان کا قطر نصف اندر اونچائی بھی نصف تھی۔ و۔

ایک ہفتار میں رکھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان ایک ایکٹ کا ناقصہ تھا لیکن درمیانی جگہ بھی کوڑے کرکٹ

حضرت ابوبکر صدیق
حضرت عمر فاروق
حضرت عثمان غنی
حضرت علی
حضرت ابوسعیدہ بن جراح
حضرت عبدالرحمن بن عوف
حضرت سعد بن ابی وقاص
حضرت طلحہ بن عبید اللہ
حضرت زبیر بن عوام
حضرت سعید بن زید
خالد بن ولید
عمر بن عبدالعزیز
حجاج بن یوسف
محمد بن قاسم
طارق بن زیاد
ہارون الرشید
ماہون الرشید
رکن الدین عہد
سلطان ملک شاہ سلجوق
سلطان الپ ارسلان
قیمت فی کتاب - 25/- روپے
Ph: 32773302
نوبلسنگھ کراچی ایڈیٹور

کا اشارہ کیجئے سے قاصر رہا۔
”کیا بات ہے؟ کیا چاہتے ہو.....؟“ اس نے زور سے جھٹکتے ہوئے کوہنی سے ہونچا۔ ”اس کی آواز لڑکھارہی تھی۔ اور بہت دور سے آئی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کا لہجہ ڈوبا ہوا تھا۔
”سر!۔۔۔ سر!۔۔۔ اوہ!۔۔۔ وہ مجھے..... مانا چاہتے ہیں۔۔۔ وہ مجھے.....“ کوہنی نے اس کے ہاتھ کو زور سے جھکا دیتے ہوئے کہا۔ وہ ڈی کوہنی کا جتنا لینے پر لڑکھایا اور اس کے اوپر گرنے لگا۔ کوہنی نے اسے فوراً مہار دیا۔ وہ آفتوں کی طرح اسے گھورتے لگا۔ اس کے چہرے پر خوف کا سایہ آ کر گزر گیا۔
”کیا بات ہے یار..... مجھے کیوں تک کرتے ہو.....؟“

جب کوہنی کو احساس ہوا کہ یہ شخص نئے میں دھت ہے۔۔۔ ایسا آدمی جو خود کو کھیلانے کے لئے اس کی مدد کر سکتا ہے۔ اس کی اس کوشش نے اس کے بعد جتنی لمحے ضائع کر دیئے تھے۔ کاش اس نے اسے بات پہلے ہی سمجھ کر مانی ہوئی۔ شرب کے پیچھے کی وہ دھنوں کر کے اس نے خاموش رہا تھا کہ شاید یہ شخص ہوش میں ہو اور اس کی مدد کر سکے۔

موت اس کے سر پر پہنچ گئی تھی۔۔۔ درمیانی فاصلہ گھٹ کر چند رگہ لپکا تھا اور تیزی سے کم ہوتا جا رہا تھا۔ کوہنی نے ہل بہل میں فیصلہ کرتے ہوئے فوراً ہی شرابی کو بڑے زور سے ایک طرف دھکا دیا۔ وہ بری طرح لڑکھایا۔ اپنا توازن قائم نہ کر سکا اور سرک پڑا۔ وہ بولا۔
جس سے سرگ میں وہ رگ کاٹ بن گیا۔
قاتل نے خود کو روکنے کی کئی امکان کو کوشش کی۔ چوں کہ وہ تیز تیز رفتاری سے اس کا قاتل کر رہا تھا خود کو روکنے میں بری طرح ناکام رہا۔ اس کے قدم شرابی کے بدن سے لگے اور پھر بری طرح اونچے سے سرگ سر کر گیا۔ عورت..... سر..... سر..... سر..... وہ یہ سن کر دیکھ کر کھڑکی اور اس نے اپنی رفتار دہی کر دی۔
کوہنی پھر ایک بار دنگ سے سہلت حاصل

اندر سے..... پھر دوڑ کر گیا۔ اپنے لگ۔ جیسے انسانوں کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا ہو اور قاتل کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھ ڈرم کے اندر گھسائے تھے۔ چند لمحوں کے بعد قاتل قریب آ گیا۔ اور اس نے کوہنی کے گرد بیان کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ کوہنی کے دونوں ہاتھوں نے بڑی تیزی سے حرکت کی جو ڈرم کے اندر راکھ کے نیچے کھینوں تک دھنسنے لگے۔
دوسرے لمحے راکھ کے طوفان نے قاتل کے چہرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ قاتل کو اس طوفان کا گمان نہ تھا۔
کوہنی چلا تک مار کر دوسری طرف پہنچ گیا۔

اور پیچھے دیکھ کر پوری قوت سے دوڑنے لگا۔ قاتل نے فوراً ہی اس کا پیچھا نہیں کیا۔ وہ اس قاتل میں تھا کہ ایک قدم بھی چل سکے۔ وہ پیٹ پڑے بری طرح کھائیں رہا تھا۔ لڑکھارہا تھا۔ اکتھیں لہ رہا تھا۔ جن میں راکھ کس کس قی قی وہ اسے سخت تکلیف دے رہی تھی اور وہی ہاتھوں کی طرح دونوں ہاتھوں سے راکھ کے مرغے بٹانے لگا تھا۔۔۔۔۔۔ کوہنی نے اسے دھنسنے سے پرہیز نہ کیا تھا۔۔۔۔۔۔

اس کے اور دوست کے درمیان پھر فاصلہ لپکا پوری قی قی کے برابر بڑھ گیا تھا۔ قی قی سرگ کے داخل ہو کر اس نے سرگ کی لہائی پر نظریں دوڑائیں۔ اسے کچھ فاصلے پر ایک آدمی دکھائی دیا۔ اس رات سرگوں پر اسے یہ پہلا آدمی نظر آیا تھا۔ وہ بڑی طرح اس آدمی کی طرف لپکا اور اس کے ہاتھ پکڑ کر چل گیا۔

ابھی نے اس کے ہاتھ کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تو کوہنی نے اس کے ہاتھ کو اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کا منہ کھلوا ہوا تھا تھا اس میں بری طرح پھولی ہوئی تھی کہ وہ ایک منٹ تک سانسوں پر قابو پانے کی قائل نہیں تھا۔ وہ ایک منٹ تک سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس دوران اس نے بار بار اٹھی سے پیچھے کی طرف اشارہ کیا جہاں دو سائے دوڑتے ہوئے تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ ڈی کوہنی

سے بھری ہوئی تھی۔ لوگ ڈرم کے بجائے درمیانی جگہ بھی پکڑا ڈال گئے تھے۔ اب پھر ڈرم سے پکڑا اٹل کر اگہا تھا۔ کوہنی ایک ڈرم بھی ایسا اٹھیں تھا جو پکڑے سے لہا لب بھر اواتے ہو۔

کوہنی نے پہلے ڈرم کا کنارہ پکڑا اور اس کے سہارے دوسری طرف صدم گیا اور فوراً ہی وہ اس قاتل کے آخری سرے پہنچ گیا۔ قاتل خود کو نہ سنبھال سکا وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ لیکن وہ فوراً ہی پلٹا اور کوہنی کی طرف کسی حلقہ کی طرح چھپا۔ کوہنی دوسرے سرے پر کھوم کر واپس آ گیا اور درمیانی میں سے کھڑے ہو کر قاتل کا انتظار کرنے لگا جیسے ہی وہ اس کے نزدیک پہنچا۔ کوہنی نے دو ڈرم کے کنارے پکڑے اور چلا تک مار کر درمیانی خلاء کو بھور کر دیا اور اب وہ دوسری جگہ پہنچ چکا تھا۔ یہ حرکت کوہنی کے لئے آسان تھی۔ اسے کوہنی مشکل اور دشواری پیش نہ آ سکی۔ کیوں کہ وہ لپکا چلا تھا اور اس میں بلا کی پھرتی بھی تھی۔ لیکن قاتل ہماری بھرم تھا۔ وہ اس طرح درمیانی خلاء کو بھور نہیں کر سکا تھا اس لئے اسے کھوم کر دوسری طرف سے آ پنا ڈھ کوہنی نے پھر وہی چال دہرائی۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک یہ حرکت نہ رہائیں سکا تھا۔ کیوں کہ اس نے دیکھ لیا تھا کہ قاتل کی سامتی عورت نزدیکی آتی جا رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد وہ اسے دونوں طرف سے گھیر لیتے۔ چوہے جیسا کھیل چھلے بھی جاری نہیں رہ سکا تھا۔

کوہنی نے ایک ڈرم کے پاس رک کر دونوں ہاتھوں سے ڈرم کے کنارے اس طرح پکڑے تھے جیسے وہ بہت ٹھک گیا ہو اور تھک کر اب بھی کرنے کی دلا ہو۔ وہ بری طرح اپنا ہاتھ لگا تھا۔ قاتل کھوم کر بڑی تیزی سے اس کی طرف آ رہا تھا۔۔۔۔۔۔ کوہنی لپکا ہوا ڈرموں کے درمیان پڑے ہوئے پکڑے کے ڈھیر پر چڑھ گیا۔ اس نے اب بھی دونوں ہاتھوں سے ڈرم کے کنارے پکڑے ہوئے تھے۔ جس کی اوپر چڑھ کر وہ غمیری ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ کھسکا کر درمیانی جگہ سے ٹھک کر دوسری طرف۔ جا رہا تھا۔ بہت سنبھل سنبھل کر اور یہی

کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس نے موت کو بھیے
پچھتہ دیکھ لیا تھا۔
دو پوری قوت سے دوڑ رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا
تھا اور بدن پیسے میں شرابور تھا۔ اس کے لمبے بال
چٹائی سے چبک کئے تھے۔ پیچھے میں اس آگ لگی
کئی سی زبانوں کو کھا گیا تھا۔ اس وقت کوئی
کے تمام احساسات، ساری قوت ہنگوں میں سمٹ آئی
تھی۔ کبھی کبھی اس آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا
جاتا تھا۔ لیکن اسے کبھی بات کی کوئی پروا نہ تھی۔ اس کی
ساری قوت ارادی ناخون کو چلانے پر مرکوز تھی۔ وہ
جاننا تھا کہ قاتل اس کا تعاقب ترک نہیں کریں گے۔
جب تک اسے ٹھکانے نہ لگا دیں جہاں سے نہیں بیٹھیں
گے۔ وہ موت اب بھی اس کا پیچھا کر رہی ہوگی۔ اور
درمیان قاتل کھٹے رہے ہوں گے۔ وہ ابھی بھی پوری
قوت سے دوڑ رہا تھا۔ چارپے پہنچ کر اس نے پاؤں
کی طرح چاروں طرف دیکھا۔ دائیں جانب اسے اصرام
کی پڑی نظر آئی اور اس کے ساتھ ایک لڑام خرب سے
جنوب کی طرف مڑی ہوئی دوکانی دکان کی فرام کی رفتار
تھی۔ قاتل بھی کچھ زیادہ دور تھا۔ وہ اسے دوڑ کر
پکڑ سکتا تھا۔ اور کوئی کام بھی نہ ہو سکتا۔
رہا ایک کمرٹ مڑا کر رہا تھا۔ اس کا مخطط تھا۔ اس
طرح وہ بس کارہا بن جائیگا تھا جو جمع کرنا جاتا تھا کہ
قلین دیکھ سکے۔ کبھی آؤں کس کیم کھانے کے کام میں
آ جاتا تھا۔ ایسا کچھ اور اسے بھی کرتے تھے۔ اسے
معلوم تھا کہ لڑام آہستہ آہستہ رفتار بڑھاتی ہے۔ وہ یہ
بھی جانتا تھا کہ اس طرح چلتی لڑام کے پائیدان پر کس
زاویے سے لٹکا جاتا ہے۔
گوئی نے رخ تبدیل کر دیا۔ وہ لڑام کی طرف
لیکا چلا جاتا جو ایک سمت میں جھکی کی اور وہ اب آہستہ
آہستہ رفتار بڑھتی رہی۔ پھر وہ جلنے میں لڑام کے کمرے پہنچ
گیا اور اس کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔ کچھ دیر بعد
پڑے ہی وہ اچھل کر لڑام کے پائیدان پر چڑھ گیا اور اس
پر چٹ کر گھرے گھرے سانس لینے لگا۔ پھر اس نے

موتوں کے درمیان الوداعی ہوسوں کا تبادلہ بڑی گرم جوشی سے ہونے لگا۔

”آٹنی“ جھنگوٹان نے چاہا تو آپ آرام سے گھر پہنچ جائیں گی۔“

”تمہاری مہمان نوازی کا بہت بہت شکریہ“ بڑی نے فی منون کچھ میں کہا۔ ”میں اسے کبھی نہیں بھولوں گی۔“

”آٹنی“ آپ بھی کسی باتیں کرتی ہیں۔۔۔۔۔

نرتا کو میری طرف سے بہت بہت پیار۔

”ایک منٹ آٹنی۔ یہ آپ کی چھتری۔۔۔۔۔

آپ چھتری ڈھونڈ رہے ہیں۔ یہ لیجئے۔۔۔۔۔

”خدا رحمت ہے۔ تم نے میرا اور میری چھتریوں کا ہر وقت خیال رکھا۔“ بڑی نے اس کا ہوسہ لیا۔

فرام کے ڈرائیور نے ان کو کھینچ لیا۔ وہ اندر ہی اندر بچہ کتاب کھار تھا۔

”شکریہ بھئی۔“ بڑی نے پی بھر کر ہی انداز سے کہا۔

”لو کہ بانی پائی۔“ انہوں نے دوبارہ بڑی کی کوٹھار پر چڑھنے میں مدد کی۔

کنز کیشز نے فوراً می اس ڈور سے دروازہ بند کر دیا کہ بڑی کی نگاہیں کسی کام سے ہمارے نہ جائیں۔ پھر اس نے ڈرائیور کو ٹھامر چلانے کا اشارہ دیا۔

گوپنی کو ایک جھٹکا سا گھوم اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ اس کے پیچھے پھر آگے کے دوڑنے کی رفتار میں پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔ اس کے دوڑنے کی رفتار میں گوپنی کی نگاہیں آگے تھیں۔ وہ پوری قوت سے بدستور دوڑ رہا تھا۔ گوپنی نے پچھنی سے پوچھا کہ اور بڑی کو کیا میں بری طرح کوٹنے لگا جس کی وجہ سے میری غصہ خیز تاخیر ہو گئی تھی۔ اس کو آج ہی اور رات ہی کو کھڑک تھا۔ وہ دن میں بھی تو جا سکتی تھی۔ اس کا پسینہ چلا وہ فرام اسٹاپ پر کھینچ لیا۔

فرام آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ گوپنی کا دلر ہاوی کے اندر جیسے میں ڈوبنے لگا۔ فرام آہستہ آہستہ

بدرہ بھی اور موت نزدیک ہوئی جاری تھی۔ اس کا خیال تھا کہ قاتل کے قریب آئے تک خرام رفتار کھیلے گی۔ اس آئندہ چند گھنٹوں میں اس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ لے اس کی زندگی یا موت کے ہوتے تھے۔ وہ بری طرح خرام سے چٹ گیا۔ خرام آہستہ آہستہ بدرہ رہی تھی۔ اسے اندر آ رہا تھا کہ وہ قاریکیں نہیں چھوڑی ہے۔ اس کے مقابلے میں موت اس سے لمحہ بہ لمحہ نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔ گولی نے لہکی کو بیڑ تلاش کرنے کی کوشش کی جس کے گرد وہ اپنا بازو حائل کر کے۔ لیکن وہ کام نامرادر رہا۔ اس کی انگلیوں نے خرام کا چمکا پکڑا ہوا تھا۔ جس پر مضبوط گرفت قائم نہیں ہو سکی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خود کو قسمت کی آغوش میں دے دیا۔

چند گھنٹوں کے بعد قاتل کی فلولائی انگلیوں نے اس کی پٹکی اس گردن ربوچ لی۔ ایک جھٹکا لگتی تھی اس کی خرام پر گرفت چھوٹ گئی اور وہ سرگ و قلا بیاں کھانے لگا۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو قاتل اس پر جھکا ہوا تھا۔ خرام کی روشنیان دور جا چکی تھیں۔ اب وہ دوز گرد خرام پر چڑھیں جس کا قہقہہ وہ بڑے سر اور جھوڑا تھا۔ کیوں کر وہ رفتار چمکا پکڑی تھی۔ پوری سڑک سسٹان تھی۔ بڑی کو کر رخصت کرنے والی خوش غائب ہو چکی تھیں۔

عقاب ختم ہو گیا تھا۔ زندگی اور موت کا فاصلہ آخر مٹ چکا تھا۔ وہ زندگی رہا چکا تھا۔ ”شیطان کے بچنے۔“ آخر میں تجھے پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ چہرے کی طرح بھاگ رہا تھا۔ اب تو کہاں جائے گا۔“ قاتل نے پھلے ہوئے سانس کے درمیان سے پکارا۔ ہونے کہا۔ پھر اس نے غصے سے کہا کہ انگلیوں میں ٹھوکر مار دی۔ گولی اس کو بھڑک چکا تھا کہ اس ٹھوکر پر اس کے منہ سے جیج بھی نہیں لگی۔ قاتل کا بدن بھی اس قدر پھولا ہوا تھا کہ اس نے گولی کو پکڑنے کی کوشش نہیں کی۔ گولی بڑی سرگ پر پڑا ہوا تھا۔ قاتل اس کے سر پر کھڑا

تھا۔ مخالف سمت سے آنے والے کسی راہ گرد کو یہ احساس نہیں ہو سکا تھا کہ ایک بچہ کو وہ جڑ بڑی سے جا رہے ہیں۔ وہ دونوں ایک گاند کی طرح اور اس پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ انہیں بل دے کر ان کی قید سے نکل بھاگے۔ وہ اس پر پھلے کے لئے بھر مار کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اسے اپنا شطر اور اس قدر جالاک تھا کہ اس پر کسی صحرائی کوڑی کا گمان ہو رہا تھا۔ کسی قدر مشکل، کوشش اور جدوجہد سے ہاتھ آیا تھا۔ اس نے دونوں ہی کو کھنی کا ناچ چنکا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے دہرہ بہتتا طور پر آنا بھی تھا۔ کیا اس شہر کا ایک نفر دوسرا ہے۔ کیا آج کی رات کی جاگ نہیں رہا ہے۔ کیا یہ وہ کسی شیشان گھاٹ سے گزر رہا ہے۔ کیا تیرا شہر کیلو۔ اس ملک کا دارالخلافہ۔ انترجیش شہر۔ اور پھر کیا رات کو کھٹ کرنے والی پریس بھی سوچتی ہے۔ پریس کی سوشل دین کا بھی دوزخ درد کوئی نام و نشان نہیں ہے۔ گولی نے بے بسی کے عالم میں سوچا۔ وہ اس قدر جذباتی ہو گیا اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ کیا وہ بے موت مارا جائے گا۔ کیا قاتل اسے بھی اس آدنی کی طرح برصیت کو خیر باد کہے گا۔ قاتل نے چہرے پر ہرے دار کے مرمیت کی نیند سلا دے گا۔ اس کی جبب میں بقیہ جاتو اور اسرا ہوگا۔ کیا اسٹری سے اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں گے۔ یا پھر کوئی اور طریقہ استعمال کریں گے اسے موت کی نیند سلا دے کے لئے۔ کیوں کہ موت کے ہاتھ میں تھیلے نہیں ہیں۔ وہ اس کی لاش کا کیا کریں گے؟

وہ یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ سامنے والے موڑ سے دود آئی مڑے۔ ان کار کو گولی اور قاتل کی طرف تھا۔ گولی نے محسوس کیا تھا کہ وہ شرب کے نشے میں دھت نہیں ہیں۔ وہ بالکل سیدھے سادے ہے۔ وہ آدنی چہرے سے سمجھ اور بڑا ہنسل آ رہے تھے۔ وہ آدنی اچانک ہی سامنے آئے تھے۔ اس نے اس کے قاتل راستہ تبدیل نہیں کر سکتے تھے۔ اور یہی سڑک راہیں جا سکتے تھے اور یہاں میں کئی بھی نہیں تھی۔ جس سے قاتلوں

کے لئے پریشانی کی بات تھی۔ گولی کے دل کو بڑی دھماکا بندھی۔ اس کا دل امید کی کرن میں نہا گیا۔ اچانک وہ کی ایک سڑ سے ہاتھ سے اٹھ کر اس کے جھوڑ میں ٹھیک لگی۔ قاتل نے بڑی دھم سے اس کے ہاتھ کو بڑے موڑ پر تھا۔ اگر وہ آدنی قوت لگا تو گولی کے ہاتھ کی پٹی ٹوٹ جاتی۔ قاتل کا ہاتھ فلولائی تھا۔ جب اس کا ہاتھ ٹاک اور پتلا ساقا۔ گولی نے ذرا سی آواز لگائی تو ہاتھ توڑ دوں گا۔؟“ اس نے اپنا منہ اس کے کان کے پاس لاکر سرگوشی میں کہا۔ اس کے کچے میں دھکی گئی۔ ”ان آدمیوں کو دیکھ کر شیر ہونے کی ضرورت نہیں۔“

گولی کانپ کر رہ گیا۔ وہ راہ کیوں کے قریب آنے کا شہت سے انتظار کرنے کا۔ وہ خود کو سر پر تزل ہوئے والی تکلف کے لئے تیار کر رہا تھا۔ راہ گیر بالکل قریب آ گئے تو گولی نے جلدی سے ایک قدم آگے بڑھایا۔ وہ ایک زبردست لہر اس کے بدن میں بجلی کی رو کی طرح اتر گئی۔ اس نے تکلف کو بزدلتا کرتے تھپ کر کر گڑا تھا کہ اپنی ہڈیوں کی طرف سے لگائی تو اس نے گولی تیزی سے دوز کر ایک راہ گیر کے قدموں سے لپٹ گیا۔ پھر اس نے گڑاڑتے ہوئے کہا۔ ”بچاؤ۔ بچاؤ۔“ بھگوان کے لئے مجھے اس خونی سے بچاؤ۔“ گولی نے خونی ہے۔“ گولی نے راہ گیر کی ناخن اس مضبوطی سے پکڑی تھیں کہ وہ ایک قدم آگے بڑھنا نہیں سکتا تھا۔ اس کا سامنے بھی رک گیا۔ وہ تھراں دے پریشان سے ہوس کر انہیں دیکھنے لگے۔

”کیا بات ہے۔“ ”ہوئی ہے۔“ انہوں نے ایک لک آدنی ٹوٹل کیا ہے اور اب یہ مجھے جان سے ماننا چاہتے ہیں۔ مجھے ان سے بچاؤ۔ بھگوان کے لئے میری مدد کرو۔“ گولی نے روئے ہوئے ان سے فریاد کی۔

نارائن ناگ پر پڑنے والی ضرب برداشت کر گیا

تھا۔ عورت اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ وہ خوف زدہ ہو رہی تھی۔ لیکن راہ گریس کی طرف متوجہ نہیں تھے وہ تار ماراں کو کچرہ تھے۔ جو کوئی کی تمام وقت اس کے برعکس پر سکون اعجاز میں ان کے قریب لگا ہوا تھا۔ اس نے مجرموں کی طرح فرار ہوئے کی غلطی کو کوشش نہیں کی۔۔۔۔۔ اور پھر اس نے لب کو کوئی نو پکڑنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ اس وقت وہ خوفزدہ ہو رہی تھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چند چٹوئیں میں اس نے اپنے آپ کو کھینچ لیا تھا۔ ”جب یہ چٹوئیں کے سامنے اپنے والدین کے بارے میں لکھی ہوئی تھی تو ہم شرم سے زمین میں گر پڑے ہیں۔۔۔۔۔“ نارائن نے دھجے لے کر کہا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

عورت نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور رخ موڑ کر سیالیاں لے لی۔

”بھگوان! جانے آج ہمارے متعلق کیا سوچ رہے ہوں گے؟“ عورت سسکیں کے درمیان بولی۔ ”یہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیں لوگوں کے سامنے بڑی ذلت اٹھانا پڑی ہے۔“

”یہ میرے ہاں باپ نہیں ہیں۔۔۔۔۔ آپ ان کی باتوں پر مت جانیں۔ یہ قاتل ہیں۔ گھر نہیں۔“ گوپال نے چیخ کر بڑبائی لے کر کہا۔ ”یہ اداکاری کر رہے ہیں۔ آپ کو بےوقوف بنانا چاہا ہے۔“

”کیا آپ لوگوں نے اسے کسی ماہر نفسیات کو نہیں دکھایا؟“ ”کیا یہ دیکھ کر یہ سوال کیا۔“

”دیکھا تو تھا۔۔۔۔۔“ نارائن نے سراٹھا کر جواب دیا۔

”کیا اس نے کوئی افکار نہیں ہوا۔؟“ دوسرے راہ گیر کے لہجے میں سانس تھا۔

غلطی ہماری ہے کہ ہم نے ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل نہیں کیا جس کا انہوں اب ہوا ہے۔“ نارائن نے افسردگی سے کہا۔ اس نے زمیں مشورہ دیا تھا کہ اسے کچھ عرصے کے لیے کسی اخص ماہی امراض کے اسپتال میں داخل کر دیا جائے تو یہ جلد متعیب یا ب ہو جائے گا۔ کیوں

کہ ابھی کچھ ہے۔ بارہ تیرہ برس کے بچے جلد متعیب یا ب ہو جاتے ہیں۔“

”کیا اسے جھوٹ بولنے کا مرض ہے؟“ پہلے راہ گیر نے دریافت کیا۔ ”یہ مرض اسے کب سے لاحق ہے؟“

”یہ جھوٹ نہیں بولتا۔۔۔۔۔ اس نے راہ گریوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ جب کوئی لہو چٹکتا ہے تو خود کو اس کا کردار لکھنے لگتا ہے۔ پھر وہ ایسی ہی حرکتیں شروع کر دیتا ہے۔ دوسرے لوگوں کو کبھی وحشی، قاتل، خوفی اور نہ جانے کیا کچھ کہتا رہتا ہے۔“

”یہ جھوٹ ہے میرے والدین نہیں ہیں۔۔۔۔۔ آپ میری بات کا یقین کریں۔ یہ قاتل ہیں۔ مجھے مار دینا چاہتے ہیں۔“ گوپال نے روتے ہوئے کہا۔ ”مجھے جھوٹ بولنے کا یا کوئی بھی مرض نہیں ہے۔ یہ جھوٹ ہمارا اور قاتل ہیں۔“

”آپ اس سے پوچھیں کہ یہ کہاں رہتا ہے؟“ نارائن نے راہ گریوں سے کہا۔

”کہاں رہتے ہوئے۔۔۔۔۔“ نارائن کے کہنے پر ایک راہ گیر نے دریافت کیا۔

”شعلی اسٹریٹ۔۔۔۔۔“ گوپال نے اسے بتایا۔

قاتل نے فوراً ہی جیب سے بٹولا نکال کر شعلی کارڈ اس میں سے نکال کر راہ گریوں کے سامنے پیش کر دیے۔

”یہ دیکھ لیجئے۔ اس میں بھی یہی لکھا ہوا ہے۔ اس پر پھر دودھ پڑا ہے۔ اس کے نیچے ایک ہاتھیں کر رہا ہے۔“

راہ گریوں نے شعلی کارڈ پر لکھا ہوا چہرہ سے پڑھا۔ پھر ان دونوں نے اٹھتے میں سر ہلادیا۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

”لو!۔۔۔۔۔“ واصل نفسیاتی مریش بن گیا ہے۔

عجب مال باپ ہیں۔ میں لڑکے کے علاج پر جو توجہ دے رہے ہیں۔ اگر اس مرض نے شدت اختیار کر لی تو پھر آپ لوگ بعد میں اس کو بھی پوچھتا کیے۔ پشیمان

ہوں گے۔“

”آج اس نے میرے پر اس سے بچے چرائے ہیں۔“ عورت نے ان کی طرف اناج پر پھیرتے ہوئے کہا۔ ”میرے وہاں سے اسے آٹا تو خشک کرنے لگی۔“ وہ رقم میں نے گیس بل بھرنے کے لیے رکھی تھی۔ وہ دوپہر سے غائب ہے۔ چائیں اس نے کوئی رقم نہیں دی اور پانی رقم کا کیا کیا؟ ہم نے بڑی تلاش کے بعد اسے کچھ دیر پہلے ہی اسے صوفیہ نکال دیا۔ اگر ہم دوڑ چھوڑ کر گئے تو اس وقت کوئی اور قلم دیکھ رہا ہوتا۔“ عورت کوئی کہ قریب آ کر جگہ جگہ۔ پھر چلا دیا۔ ہاں باپ کو اتنا سہلانا لگی۔ ”گھر چلو بیٹے! دیکھو۔۔۔۔۔ ہاں باپ کو اتنا پریشان نہیں کرتے۔ رات بھی زیادہ ہو رہی ہے۔“

باپ کی افسردگی اور مال کے آؤد کو کچھ دودھ راہ گیر بھی گوپی کے مخالف ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

”بھگوان کی بڑی کرپا ہے کہ میں نے آج تک شادی نہیں کی۔۔۔۔۔ بچے پانا بھی ایک جمن جھوٹ ہے۔“

”آج شادی بھی نہیں کر کے خوش ہوں۔۔۔۔۔ آج کل شادیاں مغل نہیں ہیں تاکہ نام ہو جاتی ہیں۔“

راہ اس دیکھ کر جس کے بیروں سے گوپی لپٹا ہوا تھا اس نے جب کھینچی کے ساتھ گوپی کے چہرے جھٹک دیئے اور اپنے بیروں سے لپیٹ لیا۔ ”مجھے اپنے والدین کا کہنا ہے ہیں بیٹے۔ ماؤ بائی اور اچا جی کے ساتھ گھر جاؤ۔“ اس نے اپنے چٹوں کے پانچے جھماڑے ہوئے اسے لپیٹ کر۔ ”اب میں جانے دو۔۔۔۔۔ ہمیں دی ہو رہی ہے۔“

پھر وہ دونوں تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ گوپی زمین پر چڑھ گیا۔ بائی بدھشی کوکے لگا۔

عورت گوپی کے پاس بھی چکی ہوئی کھڑی تھی۔۔۔۔۔ نارائن بھی گوپی کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ راہ گریوں نے قدرے دور جا کر ایک بائی لپٹ کر کہا۔

”میرے بچے! تمہیں اس عورت کی عجیب بات نہیں آتی۔ یہ ظاہر ہاں اپنے بچے کو بھاری کر رہا ہے۔“

اسے ساتھ ان کی نگاہیں، اناج، سپ راہ گیر ماسی دوں کے لیے اور انہوں نے مڑ کے کہیں دیکھا تو نارائن نے جبکہ کر گوپی کی اناج پکڑ کر اپنے دوسرے سے مڑ کر اسے پشت پر لے گیا۔

”شیطان۔۔۔۔۔ غیبت۔۔۔۔۔ اگر تو نے ایسی حرکت کی تو تیری گردن توڑ دوں گا۔“ نارائن نے کسی دروغ کی طرح خراتے ہوئے کہا اور گوپی کے ہاتھ پر دبانہ ضابطہ۔

دوئی شدت سے گوپی کی آنکھوں میں آنسو گئے۔

”اس طرح سڑک پر چلنا ٹھیک نہیں ہے نارائن۔؟“ کتے کا پلا ہمارے لئے مشکلات کھڑی کر رہا ہے۔“ عورت نے مشورہ دیا۔ ”تم کوئی گسی پکڑو۔۔۔۔۔ تم اسے کہاں کہاں لے پھرنے گے۔ یہ قدم قدم پر تمہیں جکڑے گا۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو۔“ مروے تانیدی لہجے میں کہا۔ ”اس میں واقعی کئی فطرت موجود ہے اچھا میری بات سنو۔“

پھر ان کے درمیان سرگوشیوں میں تبادلہ خیال ہونے لگا۔ گوپی اس گفتگو کا ایک ہی جلسہ بنا پٹا جاو مر دی زبان سے بڑے پر اسرار اور خوفناک لہجے میں ادا ہوا تھا۔

”دیاں اور کھڑنر نما عمارت ہے۔۔۔۔۔ سنا ہے راتوں کو بدورجن اور چیلن کا بھی مسکن ہوا کرتا تھا۔ اس میدان کے گرد جو زمین ہے وہ غالباً کھیلنے کا ہے۔ یہاں بچے کھیلنے ہیں اس نے ابھی اور بتا رہا ہے کہ کوئی نہیں ہو سکتی۔ اس کا انتخاب میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ لیکن جبکہ پورے شہر میں کوئی اور نہیں ہے۔“

عورت نے اتفاق رائے کرتے ہوئے اٹھتے میں سر ہلادیا۔ نارائن کسی کی تلاش میں اصرار نہ کرتا تھا۔

دوڑنے لگا۔

ان کی باتوں نے گوپی کا خون شریانوں میں ٹنڈ کر دیا۔ ان باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اسے انکی کسی عمارت میں لے جانا چاہتے تھے جہاں کوئی نہیں رہتا۔ وہ سنسان بڑی دھنسی تھی۔ وہ خود بھی ایسی بہت ساری

دیکھا۔ ”مظہود“ میں نے تجھیں دیکھا ہے۔ یادیں
آ رہے ہیں کہاں دیکھا ہے؟“ وہ ذہن پر زور ڈالتے
ہوئے سوئے لگے۔

چنگوں کے بعد۔ چنگوں کے لئے کائنات
کی گردش رک گئی۔ دقت کی رفتار مٹ گئی۔ کوئی نوا نہ جوتا
بول گیا۔ اس کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ اس پر سرشاری
کی طاری ہوئے گی۔ آخر کار۔
”ہاں۔ یاد آیا۔“ کا فیشل نے کہا۔ ”آج
صبح تو پشیمیشن آئے تھے۔ وہاں بھی تم نے بھی
کہانی سنا کر ہم سب کو پریشان کیا تھا۔“ انارنا دقت
ضائع کیا تھا۔ انجیل صاحب نے ایک سرائی میں
اکٹھنکڑوں سالے کی فیشیشن کے لئے بیچا تھا۔ تو تم
وہی تھیں۔ میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ بعد میں تمہیں گھر
چھوڑنے کے لئے مجھے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ آپ اس
لڑکے کے والدین ہیں؟“

”ہم اگر اس کے والدین نہ ہوتے تو اس دقت
بڑے سکون سے اپنے کمرش سو رہے ہوتے۔“ نارائن
نے تلخ لہجے میں کہا۔

”مجھے آپ لوگوں سے دور رہی ہے جناب اسے
گھر لے جائیں اور اس کی اتنی پائی کریں کہ آئندہ کسی
کو بھی لوگ پریشان نہ کرے۔ کس قدر بے خوف اور
ذہین ہیں۔ یہ اور اس نے تو پشیمیشن آ کر ہمارے
بڑے سفر کو بھی نہیں بخشا۔ اگر یہ بچہ نہ تھا تو صاحب سے
حالات میں بند کر دیتے۔ اس کا دماغ درست کرنا
بہت ضروری ہے۔“ کا فیشل نے کہا۔

پشیمیشن والا اتنا کہہ کر پیچھے ہٹ گیا۔ کسی ڈرائیور
نے گیزر دھلا۔ تیزی سے گاڑی چلا تا ہوا مکمل چھوڑ کر گیا۔
کوئی کا دل ٹوٹ گیا۔ اس نے بڑے دکھ اور
کرب سے سوسا۔ کیا اس دنیا میں اس کی بات کا یقین
کرے والا ایک شخص بھی نہیں۔ آخر پھر کوئی اس کی بات
کا یقین یوں کر رہا ہے۔ کوئی بھی تو کر سکا ہے۔ کیا اس
دنیا میں بڑے ہاتھوں پر یقین کیا جاتا ہے۔ کیا بڑے
جھوٹ نہیں بولتے ہیں۔ یہ بات ساری دنیا جانتی ہے۔

پچھتے پچھتے نہیں بولتے ہیں۔ تو پھر اسے ہر کوئی جھوٹا
آ رہا ہے سمجھ رہا ہے؟“

پھر اس نے دوبارہ کسی کو مدد کے لئے نہیں
پکارا۔ کیوں کہ اس سے کوئی قاعدہ اور کچھ حاصل نہ تھا۔
کوئی اس کی کمر سے کاٹ دے گا اور وہ اس بات پر یقین۔ اپنی
بے بسی کا احساس کرے اس کا دل بھر آیا۔ وہ اس قدر
دکھی اور جذباتی ہو گیا کہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی
جھڑی لگ گئی۔ وہ خاموشی سے روتا رہا۔ اس کے قفل
سے کوئی آزاد نہیں لگی۔ اس نے سوچا۔ وہ قفل کے
ہاتھوں سے بچ نہیں سکتا۔ اس قفل کے ہاتھوں اس کی
اذیت ناک موت لگتی ہے۔

”بچے۔۔۔ آپ کا علاقہ آ گیا ہے۔“ عیسی
ڈرائیور نے اطلاع دی۔ ”تائیں۔ کس کی کس عمارت پر
روکوں۔“

”میں کچھ پر نہیں اتار دو۔۔۔“ نارائن نے جواب
دیا۔ ”ہم اپنے قفل پیل ہی جا رہے ہیں۔ سارے ہی تو
ہے۔“

”عیسیٰ کی رفتار دھبی ہو گئی۔ اس نے ٹکڑے ٹکڑے جا
کر ٹیسی کر دوڑ دیا۔ نارائن نے عیسیٰ میں بیٹھے بیٹھے ہی
کرایہ ادا کیا تاکہ جب وہ ہار ٹیکس تو کوئی کو بڑھانے کے
لئے اس کے دلوں ہاتھ آڑا دیں۔ پھر وہ تینوں ایک
ایک کر کے ٹیسی سے اتر گئے۔ عیسیٰ اس طرف روانہ ہو گئی
جدا رہے۔ آئی گئی۔

”نارائن! تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا
عیسیٰ ڈرائیور کو ہمارے چہرے یاد ہیں گے؟“ عورت
نے خوش لہجے بھرے لہجے میں پوچھا۔

”تم پریشان اور اس قدر ہراساں کیوں ہو رہی
ہو۔۔۔“ نارائن نے اس کا سفید پڑتا ہوا چہرہ دیکھ کر دلاس
دیا۔ ”ہمارے چہروں کی کوئی تصویر نہیں ہے۔“ اس نے
توقف کر کے کوئی کو کفرت، غصے اور حقارت بھری نظروں
سے گھورا۔ ”ابنہ اس سورا کچھ وہ اسم ہے اس حرای کا آئندہ
کوئی بھی دیکھ نہیں سکے گا۔“ اس کا لہجہ بڑا سفاک ہو گیا۔
”جیسے عیسیٰ ان کی نظروں سے اوجھل ہوئی انہوں

نے اپنا رخ تبدیل کر دیا اور مخالف سمت میں واقع ایک گلی
میں خزل گئے۔

☆ ☆ ☆

وہ ایک پانچ منزلہ پینسید اور وہاں عمارت تھی
جس میں کبھی انسانوں کی یادداشت ہوا کرتی تھی۔ لیکن
اب اس کی حالت دیکھتے ہوئے کوئی بھی اس میں رہنے کے
لئے تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر مرید احمد اس عمارت کو ڈھکڑوں کی
جگہ کی عمارت بنانے کا منصوبہ زیرِ غور تھا۔ پوری عمارت
تار کی تھی۔ پھر وہ عمارت کے داخلی دروازے کے قریب
آ کھڑے ہوئے۔

”دروازہ کس کوئی نظر نہیں آ رہا۔“ مرد نے عورت
کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میدان بائیں صاف
ہے۔“ یا چنگی طاقت ہے۔“

پھر وہ کوئی کا ہاتھ پکڑ کر بے دلی سے اسے
موڑنے لگا۔ کوئی دروازہ کی شونت سے دھرا ہو گیا۔ اس نے
اپنا دروازہ پوری قوت سے کوئی کے زور پر تھاپا۔ کوئی
اس کے ہاتھ کو کاٹ نہیں سکتا تھا۔ قفل کے سخت
کھردرے ہاتھ نے اس کی سختی سے اس کا منہ نیکار ہوا تاکہ
وہ اپنا منہ کھول بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے کوئی کے کڑے
ہوئے ہاتھ پر دباؤ کر دیا۔ کوئی کی کمر بستی ہو گئی۔
”اندھا چلو۔“ اس نے پکارتے ہوئے نفرت
بھرے لہجے میں حکم دیا۔ پھر وہ اسے پھینکارتے ہوئے
آگے کی طرف دھکیلنے لگا۔

عورت نے آگے سے بڑھ کر عمارت کا داخلی دروازہ
کھول دیا۔ وہ اندر داخل ہو گئے۔ پھر دروازہ بند کر دیا۔ لیکن
اندر اس قدر تاریکی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو دکھ بھی نہیں
سکتے تھے اور نہ ہی ہاتھ تھما کر دے رہے تھے۔ عمارت کی
نفاذ میں سلیں کے ساتھ جو بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ قفل نے
اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹایا تھا اور پھر جبیب میں سے
تاریق نکال کر دھون کی۔
”تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ عمارت وہاں
ہے؟“ عورت نے اپنے سرخ سامی سے حیرت سے

سوال کیا۔
”کیسے پتا چلا۔؟“ تلاش کرنا پڑتا ہے۔
تلاش کرنے سے ہی پتا چلا ہے۔ کل رات میں نے یہ
عمارت تلاش کی تھی۔“

”تو۔۔۔ تو یہاں تم نے۔۔۔“ عورت اپنا جملہ تازہ
کھل چھوڑ کر خاموش ہو گئی جیسے اسے اپنی غلطی کا
احساس۔
کوئی بڑے زور سے کانپا۔ اب اسے احساس ہوا
کہ عمارت کی نفاذ میں سلیں کے ساتھ بدبو پھیلی ہوئی
ہے۔ وہ انسانی آنکھ کے سڑنے کی بدبو ہے۔ جانے وہ
لاش کہاں تھی۔ لیکن بدبو یہاں بھی آ رہی تھی۔

مرد نے تازگی کی روشنی اوپر جانے والی میزیدوں
پر پھینکی اور لہجے تک میزیدوں کا جائزہ لینے کے بعد تازگی
مجبوری عمارت کی طرح سیر میاں بھی شکتے تھے۔ لیکن وہ
آپنی کورس کی نظر پر آئی تھیں کہ دروازہ انسانوں کا بونہ نہ
سنیال سکیں۔

”تم نہیں مظہود۔ میں اوپر جا رہا ہوں۔“ قفل
نے عورت سے کہا۔ ”ہاں تم گریٹ مت چنا۔ میںیں میری
وامی کا انتظار کرو۔“

”تم۔۔۔ تم اوپر کیوں جا رہے ہو نارائن۔؟“
عورت نے پوچھا تو اس کے لہجے میں سراسیمگی تھی۔
”اس لئے کہ میں نے منصوبے میں ذرا سی تبدیلی
کر دی ہے۔“ نارائن نے جواب دیا۔ ”یہ تبدیلی ہمارے
لئے زیادہ بہتر ہے۔“

”لیکن تم مجھے اس منصوبے کے بارے میں اور نہ ہی
کوئی مشورہ کیا۔“ عورت نے شکایتی لہجے میں کہا۔
”عیسیٰ میں بیٹھے بیٹھے مجھے اس تبدیلی کا خیال
آیا۔“ قفل بولا۔

عورت خاموش ہو گئی۔ وہ کوئی کو بے دلی اور
پوری طاقت سے وہیلو ہوا اوپر لے جانے لگا۔ کوئی
آنے والی موت کے خیال سے اس قدر ذہن رشت تھا
کہ اس نے ذرا سی بھی حیرت نہیں کی۔ اگر وہ اس
عمارت میں چلتا پھرتا بھی کوئی اس کی آواز سننے والا نہیں

تھا۔ اس کی فریاد درود پوار سے ٹکرا کر وہاں آ جاتی۔ جب لوگوں نے باہر روشن منگول پر اس کی مدھنیں کی تو اب یہاں کون اس کی مدھ کے لئے شاید یہاں بھوت بہت ہوتے تو اس پر دم کھا جاتے۔ لیکن یہ بھوتوں کا سکین تو نہیں لگ رہا تھا۔

قائل بھی کھار تاج روشن کر کے بچھا دیتا تھا۔ جب ایک منگول قسم ہو جاتی تو دوسری چڑھنے سے پہلے وہ تاج کی روشنی میں اس کا جائزہ ضرور لیتا تھا۔ لیکن اس نے تاج مستقل روشن رکھنے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ وہ بے حد محتاط تھا۔

آخر کار تمام منگولیاں غم ہو گئیں۔ وہ چند کھجور کے لئے کئے اور سب کی درست کرنے لگے۔ قائل نے تاج روشن کر کے دائیں جانب روشنی بھیگی۔ اس کرے کا دروازہ غائب تھا اور کھجوروں کے چالے تھے ہوئے تھے۔ کرے کے دوسری طرف ایک بالگولی تھی۔ جس کا دروازہ بھی غائب تھا اور آسان پر کچھ ستارے ٹٹھارے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اس مرتبہ اس نے تاج بند نہیں کی۔ اسے فرش پر رکھ دیا۔ وہ جو کام کرنا چاہتا تھا اس کے لئے روشنی کی ضرورت تھی۔ تاج فرش پر رکھنے اس وجہ سے اس کا ایک ہاتھ خالی ہو گیا تھا۔ پھر اس نے جیب سے روپال نکالا۔

”منگول کو“۔۔۔ قائل نے ہمایا ایک لمبے کھار کھار مڑے ہوئے ہاتھ پر دباؤ بڑھایا۔ گولی نے خود مردہ اعزاز میں منگول دیاس نے روپال گولی کے منہ میں ٹھوس دیا اور تاج فرش پر سے اٹھال۔ پھر وہ گولی کو دھکیلا ہوا کرے کے اندر لے گیا اور اس کا رخ بالگولی کی طرف تھا۔

بالگولی خاصی شاد ہوئی۔ وہاں کرے کی نسبت کم تاج کی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو آرام سے دیکھ سکتے تھے۔ آسان پر ستارے کیسے کہیں دھکی روشنی میں ٹٹھارے تھے۔ بالگولی کے سامنے ساری غلا تھا۔ وہ دھولوں نے کھلا میدان تھا۔ رہائی مارتھس کا فی قائل پر جس لیکن وہ سب تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ہر طرف موت کا سکوت طاری تھا۔۔۔ قائل نے گولی کی پشت

دیوار کے ساتھ لگا دی اور ایک گھونسا مضبوطی سے اس کی پٹھ پر بٹھایا۔ ایک منٹ۔۔۔ یا آدھے منٹ بعد سب کچھ غم ہو جاتا ہے۔ لیکن منگول کا ساتھ تیزی سے بھڑک جاتی ہے۔ جیسے کوئی قیدی جیل کی چار دیواری چھلانگ کر فرار ہو جاتا ہے۔

”آخری بار آسان کی طرف دیکھ لو گولی اور ایک فرماں بردار یہی طرح اپنے باپ کو گولہ بانی کر دو۔“ قائل نے بے رحمی سے توجہ کر کے استہزاء کیے تھے کہ۔۔۔ ”جب گولی مرتا ہے تو وہ آخری بار درمے سے پہلے ضرور راجت کرتا ہے۔۔۔ زندگی کی خواہش ہر جان دار میں ہوتی ہے اور یہ خواہش اسے آخری لمحے تک موت سے خیرہ نہ زانوئے پر کھاتی ہے۔“

وہ اہل اور کسی بھڑکی طرح قائل کے پیٹ پر ٹانگ نہیں مار سکتا تھا۔ کیوں کر وہ اس سے زیادہ نزدیک تھا۔ لیکن وہ اپنے گھٹنے نہایت آداری کے ساتھ استعمال تو کر سکتا تھا۔ اس نے ایک کھرا ساسی لیا۔ پیچیدگیوں میں تازہ ہوا ٹھہری۔ دیوار سے پشت جھکا کر پوری قوت سے ایک گھٹنا اٹھا کر قائل کے پیٹ میں پوری قوت سے مارا۔ اس کا گھٹنا نرم پیٹ کی تمامیں اندر کھس گیا۔

موت کا آہنی کھجور اس کے حلق پر سے ہٹ گیا۔ قائل کے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکلے۔ وہ دھولوں ہاتھوں سے دھاک دھرا ہوا تھا۔ یہ موت کا پہلی ہی خطرناک اور خوفناک کھیل تھا جس میں زور سی غفلت شکست کا باعث بن جاتی ہے۔ جریف پل بھر کی مہلت

بھی سنبھلے نہیں دیتا ہے۔ قائل کے پیچھے ہٹ جانے کی وجہ سے گولی کو لات چلانے کی جگہ مل گئی۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تیر چھانو پوری قوت سے قائل کے پیٹ میں لات ماری۔ گولی کا کچھ قائل کی انگلیوں کو چپکنا ہوا پیٹ پر پڑا۔ قائل اٹھ کھڑا ہوا پیچھے ہٹا ہوا پیچھے۔ پھر اس کا بدن بالگولی کی رینگ سے گر گیا اور جو گولی کی بنی ہوئی تھی۔ گولی کی پوری ٹوٹ گئی۔ اس کے لئے کہ قائل نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ یہ پیٹ پر سے ہاتھ بنا دے اور سنبھل دیتے ہوئے غصہ کی طرح ادھر ادھر سہارے کے لئے ہاتھ مارنے لگا۔ اس کوشش نے اس کا توازن کا ڈھیر اور دھکیلتے ہی دیکھتے وہ تاریک غلامی کر کو گولی کی نظروں سے اوپر ہو گیا۔ اس کی آخری چیخ بہت طویل اور دل دلا دینے والی تھی۔ جو بڑی سرعت سے دور ہوئی پھری تھی۔ پھر ایک دھماکا ہوا اور اس کے بعد ایک سکوت تھا۔ لیکن چند کھجور کے بعد اس کی چیخ نے خاموشی کا فلسفہ ہم پر ہم کر دیا۔

”باران“۔۔۔ عورت کی گولی کو پانچ دیں منزل پر پہنچی۔ اس نے ٹوٹی ہوئی بالگولی سے نیچے جھانک کر کوشش نہیں کی۔ دھشت سے اس کا بدن ٹھٹھا رہ گیا تھا۔ قائل کی آخری چیخ نے اس کے دھتکے کھڑے کر دیئے تھے۔ اس جگہ پر وہ سات کھڑا ہوا تھا۔ اسے سانس لینے ہوئے چیخ آ رہا تھا کہ کہیں پھری بالگولی مل کر ٹوٹ نہ جائے۔

پتا نہیں دو کہ تک ایک طرح بالگولی میں کھڑا رہا۔ ایک منٹ۔۔۔ دو منٹ۔۔۔ یا شاید پانچ منٹ۔۔۔ اچانک نیچے بہت ساری آوازوں کا شور بلند ہوا۔ اندر سے تارچیں سے نکلنے والی روشنی کی دھار میں ادھر ادھر پڑ رہی تھیں۔ پھر روشنی کا رخ اوپر کی طرف ہوا۔ کھجوروں کے۔۔۔ اسے گولیوں کی پٹھوں پر بھاری بھر کم قدموں کی آواز سنائی دی۔ کچھ لوگ آ رہے تھے۔ گولی کو جیسے ایک دم روش آ گیا۔ اس نے منہ میں پھنسا ہوا روپال نکالا اور کمرے کے کمرے سانس لینے لگا۔

قدموں کی آواز میں قریب ہونے کے ساتھ ساتھ بند کی ہوئی چار دیواری میں سے پوئیں کے جھولنے کی آواز میں۔ گولی انہیں پہچان گیا تھا۔ ایسے بھاری بھر کم جوئے پوئیں ہی پھنسی تھی۔ پھر وہ آواز میں کرے میں داخل ہوئیں۔ گولی کا کچھ تاج کی روشنی میں نہا گیا۔ کسی نے اطمینان کا کھرا ساس لیا۔

”وہ بھولان۔۔۔ تیرا شکر ہے کہ لڑکا محفوظ ہے۔۔۔ اگر یہ جاتا تو تیرا خود کی سی خاف نہیں کرتا۔“ گولی وہ آواز پہنچ گیا۔ یہ سادہ لباس والے سراغ رسائی کی آواز تھی جس کا منہ اس تھا جو اپنے افسر کے حکم پر تاج اس محلے کی کھنکھ کرنے کے اوپر کھر گیا ایک کھنکھ میں کا بہرہ پھر کھرا تھا۔

گولی نے اسے پھر ایک شفقت بھرا اٹھ محسوس کیا۔ ”آؤ گولی! نیچے چلیں۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ کیا اپنے دوست کو صاف نہیں کر دے؟“ گولی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پتا نہیں کیوں۔ گولی نے جلدی سے آنسو صاف کئے۔ ”میں روئیں رہا ہوں سر۔۔۔ اصری آنکھوں میں شاید کچھ گر گیا تھا۔“

”بھری آنکھوں میں بھی کچھ گر گیا ہے گولی۔۔۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ گولی اس سادہ لباس سراغ رسائی کا ہاتھ پکڑ کر بیڑھیاں اڑاتے لگا۔ اس کی رہنمائی کے لئے ایک طاقت ور تاج روشن تھی۔ اس کے لوگ کھم کھم چلنے کی روشنی میں چھاکار کمرے ہوئے نظر آئے۔

”آپ کا بہت بہت شکر ہے۔ سر! آپ نے میری جان بچائی!“ گولی نے نقشہ کے لیے کھس کہا۔ ”ہم نے تمہاری جان نہیں بچائی گولی۔ تم نے خود اپنی جان بچائی ہے۔ ہم لوگ جھوٹا ایک کر وہ ہیں جسے پوئیں فوسل کا جاتا ہے۔ میں یہاں پہنچنے میں کچھ دیر ہوئی۔ یہ زیور نہ آئی اور ہم اسے زور گرفتار کر لیتے۔ اگر وہ جھپٹیں اوپر سے دھکا دے کہ ہلاک کر لیں گے کا کامیاب ہو جاتا تب بھی ہم انہیں جکڑ لیتے۔“

دار Digest [257] June 2012

لیکن ہم تمہیں بچا نہیں سکتے تھے اور میں زندگی بھر خود کو معاف نہیں کرتا۔

”لیکن سر.....! آپ لوگ یہاں کیسے پہنچے؟“
آپ کو اس بات کا علم کیسے اور کس طرح سے ہوا کہ ہم یہاں ہوں گے؟“

”ایک مرتبہ حرکت میں آنے کے بعد اس جگہ کا سراغ لگانا ہمارے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا..... جیسے ہی تمہاری ماں کا فون ملا ہم حرکت میں آ گئے..... وائرلیس پر پورے شہر کے تھانوں اور سٹیشنوں کو تمہارے اور مجرموں کے محلے سے آگاہ کیا گیا۔ فوراً ہی ایک کانسٹیبل نے اطلاع دی کہ اس نے تمہیں مجرموں کے ساتھ ایک ٹیکسی میں دیکھا تھا۔ اس ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا کہ اس نے کس جگہ سواریوں کو اتارا تھا..... بس تشویش ناک بات یہ تھی کہ ہم بہت تاخیر سے حرکت میں آئے تھے۔“
وہ میز میوں سے نیچے اتر آئے۔ سادہ لباس میں لمبوس میں ایک سپاہی نے انہیں دیکھا تو ان کی طرف بڑھا۔

”داس! ہمیں میز میوں کے نیچے پلاسٹک کے دو تھیلے ملے ہیں۔“

”انہیں کھول کر مت دیکھنا.....“ داس نے اسے خبردار کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن میں..... اور..... میں دیکھ چکا ہوں۔“
وہ پیٹھ دھا کر باہر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

”آؤ چلو۔ یہاں بڑی گھٹن ہے۔ باہر کھلی ہوا میں چلتے ہیں۔“

وہ عمارت سے باہر نکل آئے۔ قاتل کی لاش کے گرد کئی پولیس والے اور چند سادہ لباس کے پولیس والے کھڑے تھے۔ لاش کا سر پاش پاش ہو گیا تھا۔ اس کے قریب ہی اس کی بیوی بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ جسے اسٹریچر پر لاوے کی تیاری ہو رہی تھی۔

”آؤ ہم چلتے ہیں۔“ داس نے کہا۔ ”تمہاری اہلی بہت پریشان ہوں گی۔ میں پہلے تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں۔“

گوپنی..... داس کے ساتھ پولیس کی کار میں بیٹھ گیا۔ جس کی چھت پر گھومنے والی سرخ بتی لگی ہوئی تھی۔ گوپنی کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ دس منٹ کے بعد وہ منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ عمارت کا صرف ایک قلیٹ روشن تھا۔ وہ پانچویں منزل کا قلیٹ تھا۔ جب وہ اوپر پہنچے تو اس کی ماں رلا دیا اپنے بیٹے کی خستہ تھی۔ اس نے کھڑکی سے پولی کار رکتے ہوئے دیکھ لی تھی۔ اس کا چہرہ سفید پڑا تھا۔ گوپنی پر نگاہ پڑتے ہی چہرہ دک اٹھا اور سرخی دوڑ گئی۔ وہ دوڑ کر بیٹے سے لپٹ گئی۔ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ہاتھ نہیں کیوں بڑوں کو رونا دیکھ کر بچے بھی رونے لگتے ہیں۔ گوپنی کا دل بھر آیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کچھ دیر بعد اس نے نظر اٹھا کر کسی تو اس کی نظر اڑے ہاتھی پر پڑی جو بجر باندا اعزاز سے سر جھکائے ایک طرف کھڑے ہوئے تھے۔ گوپنی دوڑ کر ان کے چلوں سے لپٹ گیا۔

”ہنا جی.....! آپ کیسے ہیں.....؟ آپ تو فیکٹری چلے گئے تھے؟“ گوپنی نے جھرتی سے پوچھا۔
”تمہاری ماں نے فون کیا تھا بیٹے!“ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور محبت سے اس کے بالوں کو سہلانے لگے۔

”گوپنی! ہم سے ہاتھ نہیں ملاؤ گے ہم جا رہے ہیں۔“ داس نے کہا۔

گوپنی نے دوڑ کر بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ داس نے جاتے ہوئے اسے سیلوٹ کیا..... پھر وہ مسکراتا ہوا سیڑھیاں اترنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے کناروں میں آنسو تھے کہ ایک بچے نے اسے سدا کے لئے ضمیر کی اذیت اور ایک خلیش سے بچا لیا تھا.....



زیر زمین دنیا کا بے تاج بادشاہ جس کے کارناموں سے بھرپور ایسی کہانی جو بار بار نہیں لکھی جاتی۔
ایم ایلاس کی تحریر کردہ ”بلیک ٹائیگر“
آئندہ ماہ ضرور پڑھے۔